زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

# چہار سو

راولپنڈی

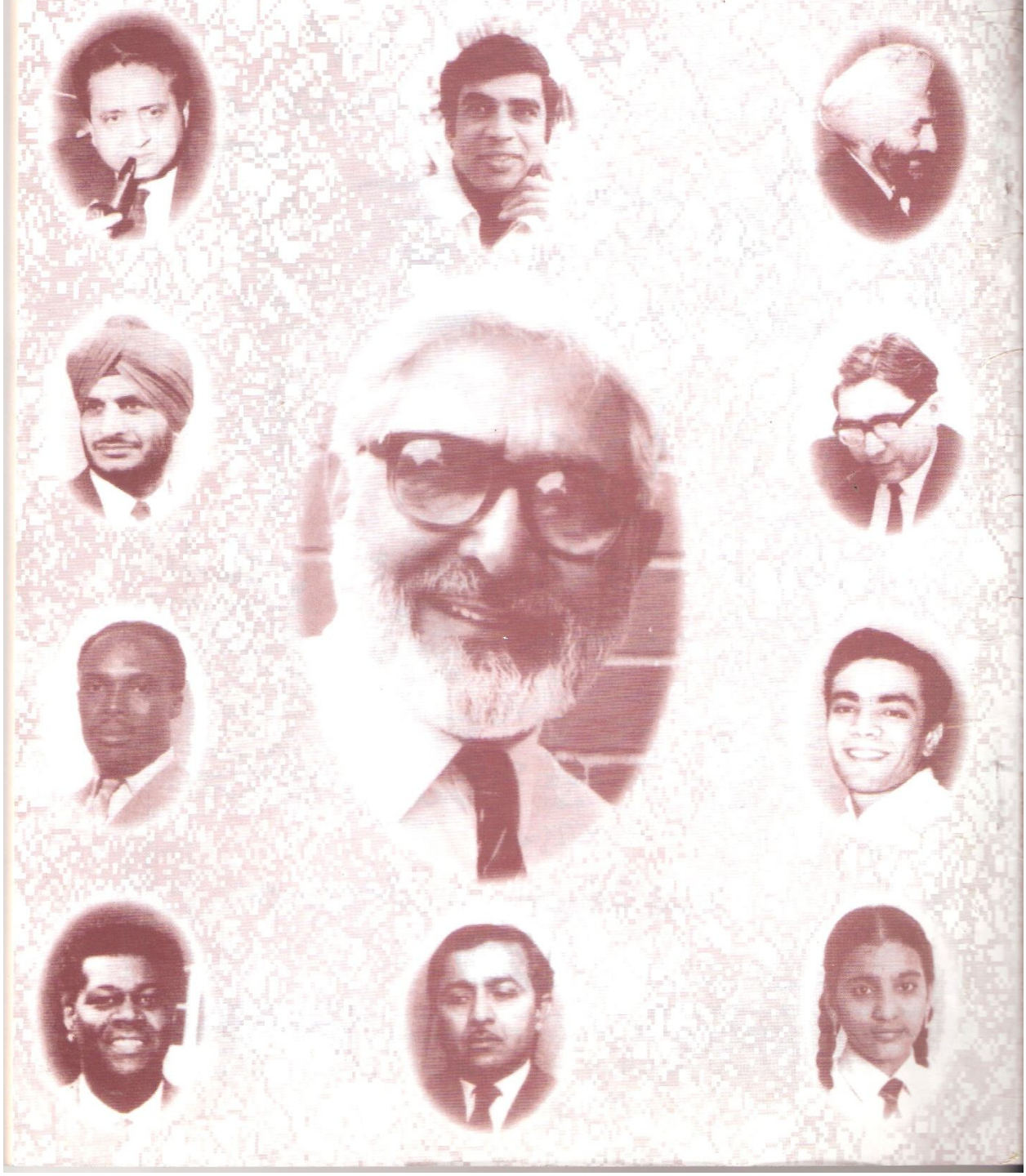

## اردو کا شاعر

حُب الوطنی ہے کیش مرا
اور جان سے پیارا دیش مرا
ہندو مسلم سکھ عیسائی
ہے سب کے لئے سندیش مرا
ہم وطنوں میں پیغمبر ہوں
میں اک اردو کا شاعر ہوں

ملاؤں کا فتویٰ ، ملحد ہوں
پنڈت بولے میں فاسد ہوں
کہتے ہیں لوگ مجھے جو ہر
رندوں کی نظر میں زاہد ہوں
مذہب والوں میں کافر ہوں
میں اک اردو کا شاعر ہوں

یہ مت سمجھو یہ اکیلی ہیں
دونوں بچپن کی سہیلی ہیں
اردو ہندی دو بہنیں ہیں
یہ ساتھ ساتھ ہی کھیلتی ہیں
میں ان دونوں کا ماہر ہوں
میں اک اردو کا شاعر ہوں

صدیوں میں ہندوستان رہا
پھر جا کر پاکستان رہا
دونوں نے سمجھا غیر مجھے
دونوں یہاں مہمان رہا
دونوں ملکوں میں مہاجر ہوں
میں اک اردو کا شاعر ہوں

## قطعات

ہم تو قائل بھی محبت کے نہ تھے
پھر شب و روز بھی فرصت کے نہ تھے
ناگہاں کوند گئی اک بجلی
کوئی آثار قیامت کے نہ تھے

تمام جسم سو گیا دماغ جاگتا رہا
پرند محوِ خواب تھے تو باغ جاگتا رہا
نہ تھاپ ڈھولکوں پہ ہے نہ تال گھنگھروں میں ہے
شباب و حسن کو ڈھکے چراغ جاگتا رہا



بی۔ایس۔جین جوہر

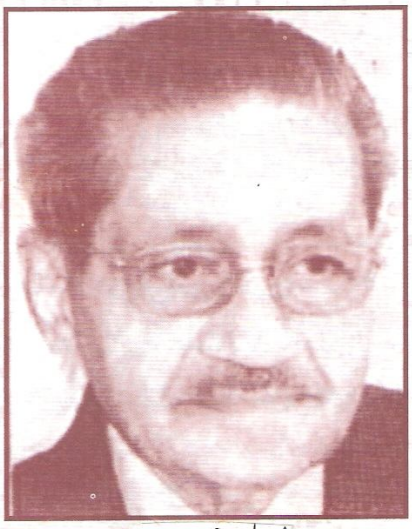

پانی تو مفت ہے پینے کے لئے
کچھ بھی مل جائے جینے کے لئے
اک کتابوں کا ہو انبار لگا
اور کیا چاہیے جینے کے لئے

ایک الھڑ سی حسینہ سرِ شام
زلف لہرائے کھڑی ہے لبِ بام
مرد کی آنکھ میں تنبیہہ حجاب
طفل کے ہاتھوں میں آنچل کی لگام

یوں ہی آتے ہیں چلے جاتے ہیں
کچھ نہ لاتے ہیں، نہ لے جاتے ہیں
اک مداری کے جھمورے ہوکر
کیوں گنہ گار کہے جاتے ہیں

کھوٹے سکوں کو بھی بازار میں چلتے دیکھا
آدمیت کا جنازہ بھی نکلتے دیکھا
جن کا مقصود تھا انسان کی فلاح و بہبود
ان کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھا

## نسلِ انسان

شمع جلتی رہی ، رات ڈھلتی رہی
اک تمنا سی دل میں مچلتی رہی
خون بہتا رہا نسلِ انسان کا
دل دھڑکتا رہا ، نبض چلتی رہی
بحث کرتے رہے فلسفی ، متقی
شاخ ہر شاخ میں سے نکلتی رہی
جانے کتنے مسافر تھکے ، سو گئے
کارواں رک گئے ، راہ چلتی رہی
شمع جلتی رہی
چاند دولھا بنا جا رہا ہے کہاں
لے کے تاروں کی بارات کا کارواں
کوئی آواز ہے نہ کوئی ساز ہے
ایک گہری سی سازش میں چپ ہے جہاں
سر جھکائے کھڑے ہیں گنہگار ہے
پیڑ ، جن پر پھیلی سی ہیں پُر فشاں
کان میں کچھ نسیم سحر کہہ گئی
سر ہلانے لگے شادماں شادماں
دھوپ چھاؤں کے اس کھیل کو کھیلتی
زندگی اپنے محور پہ چلتی رہی
شمع جلتی رہی

زندگی کے ساتھ ساتھ

# چہار سُو

جلد:۱۶؛ شمارہ جولائی، اگست ۲۰۰۷ء

مجلسِ مشاورت

قارئین چہارسُو

زرِ سالانہ

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

چہارسُو کا زیرِ نظر شمارہ !

''ارضِ پاک'' کے اُن کروڑوں بدنصیبوں سے

منسوب ہے

جو پانی میں ڈوب کر پیاسے، پیٹ بھروں کے درمیاں بھوکے،

گھر داروں کے درمیاں بے گھر اور زرداروں کے ہم نشین

ہوتے ہوئے بھی

افلاس کی لکیر سے نیچے زندگی گذارنے پر مجبور ہیں !!!

بانی مدیرِ اعلیٰ

## سید ضمیر جعفری

مدیرِ مسؤل

## گلزار جاوید

مدیرِ معاون

## بینا جاوید

رابطہ: 537، ویسٹریج-III، راولپنڈی۔ فون: 92-51-5462495 فیکس: 5467235 ای۔میل: waqars_oma@yahoo.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

# متاعِ
# چہارسُو


قرطاسِ اعزاز ......... ادارہ

سرورق: پسِ ورق ......... شعیب زیدی

ذوقِ تماشا ......... ممتاز احمد 4

کشمیر کے نام ......... محمود ہاشمی 7

براہِ راست ......... گلزار جاوید 8

مشرق کی کہانی ......... محمود ہاشمی 11

مشرقی تہذیب کا المیہ ......... انور سدید 19

فکر و نظر کے تازہ ابواب ......... جعفر بلوچ 26

اردو کا قاعدہ ......... رفیع الدین ہاشمی 27

مستقبل کا تنقیدی اساس ......... احمد صغیر صدیقی 30

ہم یہاں کیسے پہنچے ......... محمود ہاشمی 32

آئینہ بار بہاری ......... اقبال بھٹی 39

قلبِ سلیم 44

عبدالعزیز خالد، ضمیر نوری، رخسانہ پروین

سخنِ عرفی 46

مشکور حسین یاد، محسن احسان، مظفر حنفی، شبنم شکیل، انور سدید، جلیل عالی، حامدی کاشمیری، جاوید شاہین، صابر آفاقی، خالد حمید، یوگیندر بہل تشنہ، غالب عرفان، عشرت ظفر، خیال آفاقی، مناظر عاشق ہرگانوی، صدیق شاہد، معراج جامی۔

افسانے

درد ......... جتیندر بلو 54

مجرب نسخہ ......... کیدارناتھ شرما 60

کھڑکی سے آنے والا جھونکا ......... نوار حسین 63

معصوم علی ......... دیپک بدکی 68

تصویر اختیاری والا ......... گلزار جاوید 71

سخنِ معتبر 76

نصیر کنجاہی، ماجد سرحدی، خورشید انور رضوی، سہیل غازی پوری، انور جاوید ہاشمی، عزم بہزاد، لیاقت علی عاصم، ماہر عظیم آبادی، علی آذر، کرامت بخاری، رب نواز مائل، نثار ترابی، شگفتہ نازلی، شاہین فصیح ربانی، فیصل عظیم، اختر رضا سلیمی، پرویز ساحر، احمد ظہور علی شاہ۔

نشانِ راہ

نسائی ادبی تنقید ......... حمیدہ معین رضوی 84

آئینۂ فن

اقبال اور رِلکے ......... پروفیسر محسن احسان 93

سخنِ آفتاب 95

عبدالعزیز خالد، نامی انصاری، انور سدید، صابر آفاقی، جینت پرمار، یوگیندر بہل تشنہ، خیال آفاقی، ماجد سرحدی، مناظر عاشق ہرگانوی، خورشید انور رضوی، بھگوان داس اعجاز، پرویز مظفر، علی آذر، فیصل عظیم، حفیظ انجم، سجاد مرزا، نصیر کنجاہی، شگفتہ نازلی، گلشن کھنہ۔

تخلیقِ عصر

تازہ تصانیف کا تعارف ......... عطیہ سکندر علی 106

سخنِ ماہتاب

کتابوں سے تازہ بہ تازہ ......... ستیہ پال آنند 111

رس رابطے

جستجو تیرے ہندو پن ......... وقار جاوید 113


○ ○ ○

التماسِ مدیر:

ایک تخلیق ایک سے زائد جرائد میں اشاعت سے غرض کرنا اخلاقی جرم کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے لہٰذا تخلیقات ارسال کرتے وقت غیر مطبوعہ کا اطمینان کر لیجئے اور مدیر کی تسلی کے لئے اپنے قلم سے غیر مطبوعہ لکھنا نہ بھولئے۔ (ادارہ)

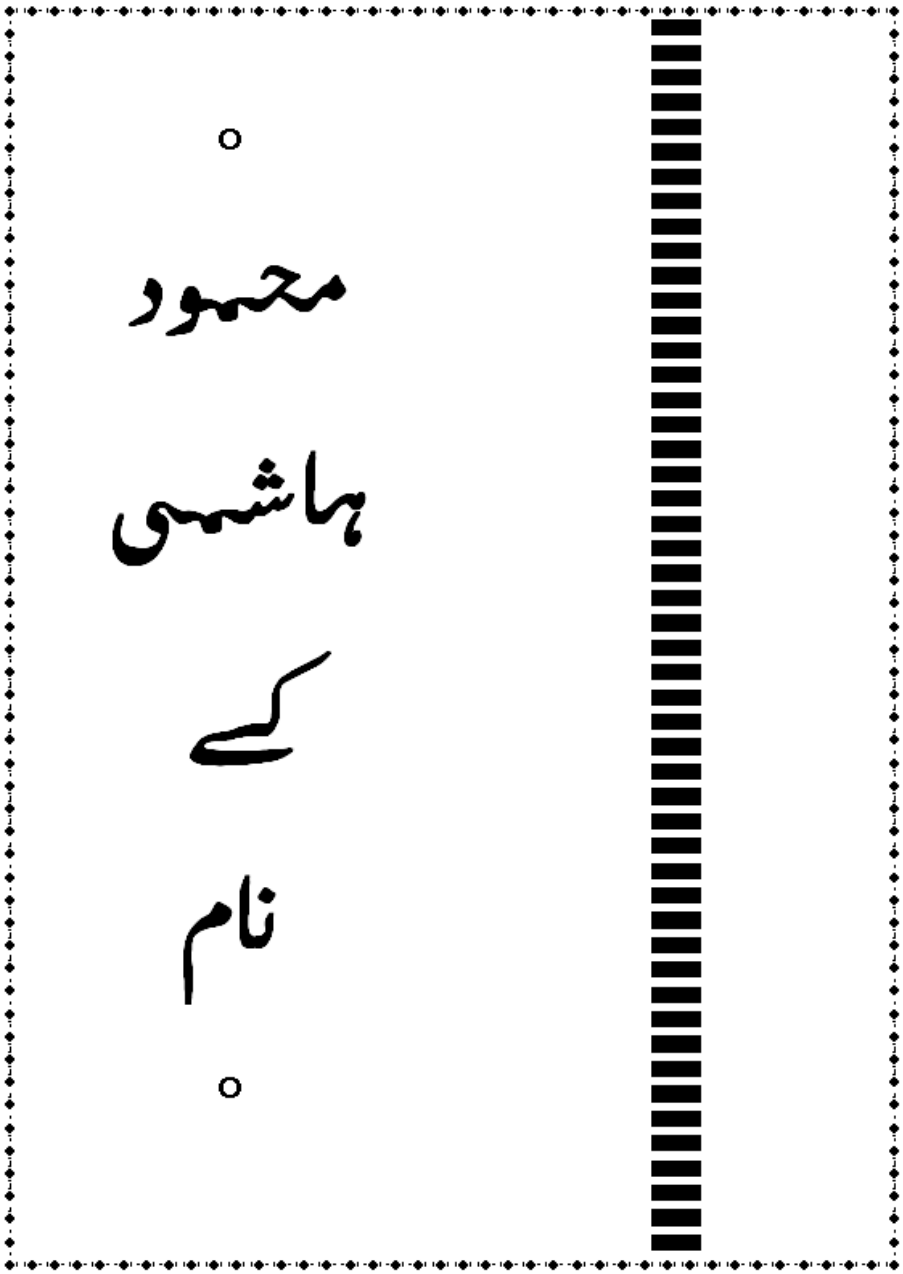

○

محمود

ہاشمی

کے

نام

○

# ذوقِ تماشا

**ممتاز احمد**

**نام:** محمود ہاشمی محمود والد مرحوم کا عطا کردہ ہے جن کا نام محمد ہاشم تھا۔ ہاشمی کی بات میں نمایاں ہے۔ پیشرو مامیں ہاشم تھا جو میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ہاشمی بن گیا۔ اب جب لوگ ناموں پر دین مصطفیٰ بیچنے والوں میں مجھے بھی دھر لیتے ہیں تو بڑی کوفت ہوتی ہے۔

**پیدائش:** مستونگ ریاست قلات بلوچستان۔ ۲۰ اگست ۱۹۳۹ء۔

**آبائی وطن:** پونچھ نگشن نمبر پونچھ آزاد کشمیر۔

**تعلیم:** پنجاب یونیورسٹی (پرنس آف ویلز کالج جموں) سے بی اے علی گڑھ سے ایم اے ایل ایل بی انگلینڈ آکر لیڈز یونیورسٹی سے گریجویٹ سرٹیفکیٹ ان ایجوکیشن برمنگھم یونیورسٹی میں ایم اے ایجوکیشن میں داخلہ لیا۔ پہلے سال کے خاتمے پر امتحان پاس کیا۔ دوسرے سال تھیسس مکمل کر کے ڈگری لینے کی منزل پر تھا کہ بلاوا آ گیا اور شرق نے جیسے ساری دنیا بھلا دی۔

**شوق:** مطالعہ بالخصوص انگلستان کے بارے میں اردو کے ادیبوں کی کہانیاں اور ہندوستان کے بارے میں انگریزوں کی تاثرات۔

**اردو کے محبوب ادیب:** عزیز احمد قرۃ العین حیدر

**اردو کے محبوب شاعر:** فخر الایمان' مصطفیٰ زیدی' ابن انشاء' حبیب جالب' افتخار عارف اور ساقی فاروقی۔

**اردو کے محبوب نقاد:** میرا جی' ساقی فاروقی (شاعر تو وہ اچھا ہے پر نقاد بہت ہے)

**انگریزی کا محبوب نقاد:** جلال الدین احمد

**محبوب کالم نگار:** انتظار حسین' عبدالقادر حسن

**تحریریں:** افسانہ نگاری سے آغاز کیا' کالج کے زمانے میں لاہور کے ادب لطیف (ایڈیٹر راجندر سنگھ بیدی) امرتسر کے پریت لڑی (ایڈیٹر وپندر ناتھ اشک) میں لکھتا رہا علی گڑھ کے دور میں نقادِ بخے کی سائی چنانچہ تنقیدی مضامین ساقی' ادبی دنیا اور شاہکار میں چھپتے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں قمر نقوی کی ادارت میں چھپنے والے ایک چھوٹے سے رسالے "کتاب" میں نئی کتابوں پر تبصرے لکھتا رہا۔ سری نگر کالج میں لیکچررشپ کے دوران ڈرامہ "کارگل" اسٹیج کیا۔ دوسرے سال ڈرامہ لکھا "کارگل کی واپسی" جو بعد میں ساقی کے سالنامے میں چھپا۔

**مطبوعات:**

۱۔ کشمیر اداس ہے (تقسیم کشمیر اور اس کے فوراً بعد کے حالات پر تاریخی اہمیت کا حامل ایک مفصل رپورتاژ)

۲۔ موت کا جشن (ناولٹ)۔ مطبوعہ بشیر ہندی ٹمپل روڈ لاہور۔

۳۔ برطانیہ میں اردو کی تعلیم (مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد)

۴۔ اُردو کا قاعدہ + اردو کیسے پڑھائی جائے؟

یہ نو کتابوں پر مشتمل بچوں کو اُردو پڑھانے کا مکمل سیٹ ہے جس میں اُردو کا قاعدہ ورک بک اور ٹیچرز بک (پہلا قدم' دوسرا قدم اور تیسرا قدم) شامل ہیں۔ اسے برطانیہ کے متعدد سکولوں اور اسلام آباد کے بعض انگلش میڈیم سکولوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ ڈنمارک کے سکولوں میں بھی یہ رائج ہے۔ یورپ کے مختلف ممالک اور امریکہ میں مقیم والدین اسے اکثر اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کے لئے منگواتے رہے ہیں۔ اس پر یہاں کے مشہور اخبار "ٹائمز" کے ایجوکیشنل سپلیمنٹ میں ۲۵ نومبر ۱۹۸۸ء کے شمارہ میں حوصلہ افزا تبصرہ چھپا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج کے اُستاد پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے بھی اس پر ایک تفصیلی تبصرہ کیا ہے جو اورینٹل کالج میگزین ۱۹۹۹ء کی جلد (۱) اور (۲) میں چھپا ہے۔

۵۔ اِک گھر بنایا چاہیے! (ہم یہاں کیسے پہنچے؟... برطانیہ میں آ کر آباد ہونے والے ایشیائیوں کی مختصر تاریخ اور اُن کی یہاں رہائش کے مسائل)

۶۔ چار حروف پانچ کہانیاں

۷۔ کوہ قاف کے راستے میں (ڈرامہ)

۸۔ نا لسٹائی کی کہانیاں (ترجمہ)

۹۔ تین قلفی

۱۰۔ تین انقلابی... (نمبر ۶ تا ۹ اور ۱۰ بچوں کے لئے یہ کتابیں قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور نے ۱۹۷۳ء سے قبل چھاپی تھیں۔ اب نایاب ہیں)

**زیرِ ترتیب**

۱۔ چار افسانے' ایک ڈرامہ

اس میں ۱۹۷۳ء سے قبل لکھے ہوئے میرے افسانے اور تنقیدی جائزے ہیں۔ ایک ڈرامہ "کارگل کی واپسی" بھی ہے۔ یہ افسانے اور تنقیدی جائزے مشہور ادبی ماہناموں "ساقی" میں چھپے تھے۔ بہت سے افسانے اور مضامین جو "شاہکار" لاہور' "ادب لطیف" لاہور اور "پریت نگر" (ایڈیٹر وپندر ناتھ اشک) میں چھپے تھے۔

۲۔ برطانیہ میں اُردو شعری منظرنامہ

اس کے کچھ حصے بریڈفورڈ کے ہفت روزہ "راوی" ایک مضمون کراچی کے ماہنامہ "افکار" اور ایک مضمون بمبئی کے ماہنامہ "شاعر" میں چھپ چکا ہے۔

۳۔ برطانیہ میں ہمارا نیا گھر

۴۔ دیباچے اور مطالعے' یہ مختلف کتابوں پر لکھے ہوئے میرے دیباچے اور مختلف ادبی تقریبات میں پڑھے گئے تبصرے ہیں۔

۵۔ ستاروں کی سیر

۶۔ ٹیکم بابا کی کہانی.... (نمبر ۵ اور ۶ بچوں کی کہانیاں ہیں۔ ٹیکم بابا کی کہانی" ہفت روزہ "راوی" بریڈفورڈ میں قسط وار چھپی تھی۔

نشریات

برطانیہ آنے سے پہلے ریڈیو راولپنڈی سے نئی کتابوں پر تبصرہ اور بعض ادبی موضوعات پر بات چیت کیا کرتا تھا۔ ریڈیو پشاور سے میری دو ایک تقریریں نشر ہوئی تھیں۔ آزاد کشمیر ریڈیو سے ہر پندرھواڑے ایک پروگرام "آزاد شہری کا روزنامچہ" نشر کیا کرتا تھا جو خاصا مقبول تھا۔ کچھ عرصہ ہوا میں نے ان کی نقول حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

برطانیہ آنے کے بعد یہاں بی بی سی کے پروگراموں میں وقتاً فوقتاً حصہ لیتا رہا ہوں۔ ان کا میرے پاس کوئی ریکارڈ نہیں تاہم بعض انٹرویو کے ٹیپ ہیں۔ شاید کبھی انھیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کر سکوں!

ایک زمانے میں بی بی سی والوں نے مجھ سے چار چار پانچ پانچ منٹ کی کچھ تقریریں ہلکے پھلکے انداز میں لکھوا کر ریکارڈ کی تھیں جن کا تعلق برطانیہ میں ہماری روزمرہ زندگی اور اس کے مسائل سے تھا۔ کیا انھیں کتابی صورت دی جا سکتی ہے؟.... ممکن ہے ان پر نظرِ ثانی کر کے اپنی کتاب "برطانیہ میں ہمارا نیا گھر" میں شامل کر سکوں۔

صحافت

برطانیہ میں اردو کے پہلے ہفت روزہ اخبار "مشرق" کا اپنے پرانے دوست اور ہم جماعت جناب عنایت اللہ مینجنگ ڈائریکٹر کوہستان کی مدد سے اجرا کیا۔ میں "مشرق" کا چیف ایڈیٹر اور اس کے اشاعتی ادارہ "لاکسلی پبلشرز لمیٹڈ" کا مینجنگ ڈائریکٹر تھا۔ اس کے ڈائریکٹروں اور حصہ داروں کی اکثریت میرپور آزاد کشمیر سے تعلق رکھتی تھی جو ان دنوں برمنگھم کی فیکٹریوں میں کام کرتے تھے۔

ا۔ "مشرق" کے اجرا کا تفصیلی بیان "برطانیہ میں اردو صحافت" مصنفہ سلطان محمود میں ہے جسے مرکزی اردو بورڈ (اب سائنس بورڈ اپر مال روڈ لاہور) نے چھاپا تھا۔

ب۔ مندرجہ ذیل دو انگریزی کتابوں میں ہفت روزہ مشرق کا ذکر ہے۔

1. "Blake British, White British" By Dilip Hiro - Grafton Books London

2. "Living in Brittain" By Lord Constantine M.B.E - Virtue & Co. Ltd. London

ج۔ میں نے بھی ایک مضمون "مشرق کی کہانی" لکھا تھا جو نقوش (اردو بازار لاہور) میں چھپا تھا۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ University of Winconsin Madison کے Centre for Asian Studies کے مجلہ The Annual of Urdu Studies کے ۱۹۹۸ء کے شمارہ میں چھپ چکا ہے۔

دوسروں کی نظر میں۔ چند حوالے

ا۔ "کشمیر میں اردو"..... از پروفیسر عبدالقادر سروری مطبوعہ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر (۱۹۸۲ء)

۲۔ "انتخاب اردو ادب" (۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۱ء) از نور شاہ مطبوعہ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر (۱۹۷۲ء) دیباچہ میں میری خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔

۳۔ "کشمیر میں اردو"..... از حبیب کیفوی مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور (۱۹۷۹ء)

۴۔ "شہاب نامہ".... از قدرت اللہ شہاب (مطبوعہ ۱۹۸۷ء)

۵۔ سہ ماہی "ابلاغ" نوشہرہ شمارہ جولائی ۱۹۹۹ء.... مضمون "کشمیر اداس ہے ایک تجزیہ".... از ڈاکٹر ظہور احمد خان

۶۔ "داستان تاریخ اردو نثر نگاری".... از ڈاکٹر ظہور احمد خان۔ مطبوعہ ادارہ علم و فن پشاور.... (صفحہ ۲۷۲، ۲۷۲).... اس کے علاوہ اس ۱۱۳۶ صفحات کی ضخیم کتاب میں متعدد جگہ "کشمیر اُداس ہے" کا ذکر ہے۔

۷۔ "نصرت۔ کشمیر نمبر" ۱۹۶۰ء.... "کشمیر اور ہمارے ادیب"..... از مظفر علی سید

۸۔ "بچھڑوں کا دھواں"... از انتظار حسین صفحہ ۲۸ سنگ میل لاہور۔

۹۔ "قابلِ ذکر لوگ"..... از اطہر راز (قطعات)... مطبوعہ "صدا لندن"

۱۰۔ "حاصلِ علی گڑھ".... از پروفیسر عبدالقادر' میسور یونیورسٹی مطبوعہ "انجمن ترقی اردو ہند"....۱۹۸۶ء

۱۱۔ "جموں کشمیر ہمارا اکیسویں صدی میں داخلہ".... از پروفیسر احسان اکبر.... (۱۹۹۴ء)..... کتاب کے دیباچے میں تحریر ہے "...... سردیوں کی ان بارشوں کے دنوں میں مجھے محمود ہاشمی کا رپورتاژ "کشمیر اداس ہے" تجدید کشمیر کے

اندرونی آتش فشاں سے متعارف کرایا گیا۔ حرف کی تاثیر کتنی محکم ہوتی ہے جس میں
اس دن سے مسئلہ کشمیر سے وابستہ ہو گیا۔"

۱۲۔ انگریزی مضمون۔ از انتظار حسین "Kashmir Udas Hai",
Frontier Post, Lahore September 24, 1991

۱۳۔ انگریزی میں تبصرہ..... از پروفیسر اکرام الحق.... "Kashmir Udas Hai", Frontier Post, Lahore April 24 1994

۱۴۔ "A Short History of Urdu" By Athar Raz

متفرقات

زیرِ ترتیب کتابوں میں بہت سی تحریریں اس لئے شامل نہ ہو سکیں کہ وہ کتاب کے مجموعی تاثر سے ہم آہنگ نہ تھیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔

۱۔ بلتستان کے لوک گیت۔ مطبوعہ نقوش لاہور
۲۔ آزاد کشمیر کے لوک گیتوں کا نیا سوز۔ مطبوعہ "بلاغ" (نوشہرہ) ۱۹۹۲ء
مطبوعہ "کارزارِ کشمیر" ۱۹۹۲ء راولپنڈی / برمنگھم
۳۔ کشمیر کے میلے
۴۔ کشمیری عوامی رقص..... مطبوعہ "آئینہ کشمیر" ادبی دنیا لاہور
۵۔ چوبیس اکتوبر۔ یومِ آزاد کشمیر
۶۔ پشاور میں آزاد کشمیر
۷۔ مظفر آباد... پرانے شہر سے ایک نیا شہر ابھر رہا ہے
۸۔ تراڑکھل
۹۔ میں نے قاعدہ کیوں لکھا..... مطبوعہ "مشرق" لندن
۱۰۔ شہاب صاحب کی یاد میں
۱۱۔ وہ بادشاہ کیسے بنا؟ (بچوں کے لئے)
۱۲۔ "برمنگھم میں کشمیر".... مطبوعہ "کارزارِ کشمیر" ۱۹۹۲ء راولپنڈی / برمنگھم
۱۳۔ "جانے کیا بات ہے لکھتا ہوں قمر نام کے ساتھ"... ڈاکٹر محمد یوسف قمر کے شعری مجموعہ "اجنبی دوست ہوئے" کا دیباچہ

دیباچے

۱۔ صفیہ صدیقی اور پہلی نسل کا گناہ
۲۔ سلطان محمود کی نئی کہانیاں
۳۔ جمشید مرزا... ہم آپ کو نہیں بھولے!
۴۔ میرین ماتھیوز کی زبانِ واحد
۵۔ یعقوب نظامی اور ایشیائی تارکینِ وطن
۶۔ ڈاکٹر صفات علوی کے ترتیب دیے ہوئے سخن پارے
۷۔ کنول نین پرواز، بلراج ساہنی اور سری نگر
۸۔ سید منور حسین مشہدی اور برمنگھم میں کشمیر
۹۔ صابر حسین لداد کے ساتھ ایک شعری سفر
۱۰۔ ناز سیٹھی کی شاعری
۱۱۔ الف.... منصور الٰہی شیخ کے افسانے
ب... ہمارے شیخ صاحب اور دنیا کا مختصر ترین افسانہ
ج..... منصور الٰہی شیخ کی ایک کہانی... ایک تجزیہ
۱۲۔ ستارہ لطیف خانم کے افسانے
۱۳۔ فیروز مکری کا طلسمِ خیال

مطالعے

۱۔ رضا علی عابدی کے ساتھ جرنیلی سڑک پر
۲۔ عبداللہ ملک، مولانا احمد علی اور شورش کاشمیری کے محبت نامے
۳۔ سیدہ حنا اور الف لیلیٰ کا جدید ایڈیشن
۴۔ منٹو سے بھی ایک قدم آگے..... افتخار نسیم

مختصرات

۱۔ اردو کی ایک درخشاں علامت.... سلطانہ مہر
۲۔ رضیہ اسماعیل کی نثر
۳۔ ماضی کے افسانہ نگار..... محمد یعقوب مرزا

شاعروں کے بارے میں

۱۔ برمنگھم کے شاعر
۲۔ یاسمین حبیب کی شاعری
۳۔ ماہیؔ کاشمیری کی ہجرتوں کے کرب
۴۔ جانے کیا بات ہے لکھتا ہوں قمر نام کے ساتھ... ڈاکٹر یوسف قمر کی شاعری
۵۔ جاوید اختر بیدی، بریڈفورڈ
۶۔ جاوید اقبال ستار، بریڈفورڈ
۷۔ طلعت سلیم.... غزل گوؤں کے جھرمٹ میں ایک تنہا آواز

☆

# کشمیر کے نام .... محمود ہاشمی

برخوردار جگن ناتھ آزاد! تمہاری وہ نظم مجھ تک پہنچی، جس کا عنوان "ایک نظم.... کشمیر کے نام" ہے اور جس میں تم نے اپنے:

بادہ و جام کے آخری دور میں
عمر کی شام کے آخری دور میں

مجھے سلام محبت کہا ہے اور مجھ سے اس طرح خطاب کیا ہے:

اے جہانِ حسیں، اے دلِ آرا زمیں
کوہساروں کی اور لالہ زاروں کی دنیا
بہاروں کی اور جوئباروں کی دنیا
لچکتے ہوئے سبزہ زاروں کی دنیا
جو دیوانہ عقل اور دل کو بنا دے
کچھ اس طرح کے دلکش و روح پرور نظاروں کی دنیا

مجھ سے خطاب کرتے ہوئے تم نے میری ایک جیتی جاگتی خاتون اور میرے ایک عظیم فرزند شاہ ہمدان کو بھی یاد کیا ہے۔ مجھے مقدس کا لقب بھی دیا ہے اور نظم کے آخری حصے میں مجھے "اے مقدس زمیں، راستی کی امیں، سادگی کی امیں اور ظلمات میں روشنی کی امیں" جیسی خوش کن تھپکیاں دیتے ہوئے لکھا ہے:

وہ زمیں جس نے اپنا کہا مجھ کو
اور دور جانے سے روکا
وقت کو آزمانے سے روکا
اک نہیں، سو بہانے سے روکا

میرے عزیز۔ یہ تم نے مجھ سے کیا کہہ دیا! میری زمین بھلا تم کو کیوں روکتی اور پھر بقول تمہارے سو بہانے سے کیوں روکتی؟ میری زمین کی کوکھ سے سینکڑوں ہزاروں پیدا ہوئے اور مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ میں نے کسی کو نہیں روکا تو تمہیں کیوں روکتی؟ تم یہاں آئے ضرور تھے لیکن جس طرح تم آئے تھے، اس طرح تو سینکڑوں ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں لوگ طویل طویل فاصلے طے کر کے میرے حسن و جمال کی باتیں کرتے ہوئے میرے پاس آتے ہیں اور پھر "ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا، خوش کام ہوئے اور چل نکلے" کی صورت واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ تم ان کی طرح جلدی واپس نہیں گئے لیکن سچی بات ہے کہ تم یہاں ٹھہرے بھی نہیں۔ تم میری گود میں شاید بھارتی حکومت کے ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز رہے، کچھ عرصہ تم نے میری یونیورسٹی "کشمیر یونیورسٹی" میں ملازمت بھی کی لیکن آخر کار تم نے یہاں سے رخت سفر باندھنے ہی میں عافیت سمجھی۔ جن دنوں تم آئے تھے، میرے چاہنے والے میری خاطر ڈوئل (Duel) لڑ رہے تھے اور میرے یہاں خاصا خون خرابہ ہو رہا تھا۔ (یہ خون خرابہ اب بھی ہو رہا ہے) میرے پاس امن اور آشتی کی وہ فضا نہیں تھی، جس میں چین اور آرام کی زندگی بسر کی جا سکے۔ تم ایک ٹھکانے کی تلاش میں آئے تھے، جس کے لئے حالات سازگار نہ تھے۔ تمہیں وہ ٹھکانا جموں میں مل گیا۔ جہاں تم اب رہتے ہو۔ جموں میرا حصہ ضرور ہے لیکن وہ کشمیر تو نہیں۔ تمہیں یقیناً معلوم ہوگا کہ اس ریاست کو "جموں و کشمیر" اسی لئے کہا جاتا ہے کہ دونوں کا فرق واضح رہے۔ تمہیں چاہئے تھا کہ اپنی نظم کو "ایک نظم.... کشمیر کے نام" کی بجائے "ایک نظم.... جموں کے نام" کا عنوان دیتے لیکن تم غالباً اپنی زندگی کے اس آخری دور کو وہ اونچی پیچ دینا چاہتے تھے جو میرے بھائی جموں میں وہ دوران نہیں جو مجھ میں ہے۔ کیا تمہیں واقعی یہ احساس نہیں ہوا کہ اس طرح تم نے جموں کی حق تلفی کی ہے اور مجھ سے ایک ایسا تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، جس کا کوئی وجود نہیں۔ تم .... معاف کرنا .... محض اپنے نام و نمود کے لئے میرے نام کا اور میرا استحصال کیا ہے۔ تم ہی نہیں، سبھی میرا استحصال کرتے ہیں۔ ہر حسن پرست بوالہوس نے ہمیشہ میرا استحصال کیا ہے۔ میرے نام پر اپنی شاعری کی دکان چمکائی ہے۔ اپنے افسانوں میں رنگینی پیدا کی ہے اور اس جانب بھی دیکھا تک نہیں کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ تم سب مجھ سے فلرٹ Flirt کرتے ہو۔ مجھے اپنی داشتہ سمجھتے ہو۔ گھر میں تمہارے جنم مرن کی ساتھی کوئی اور ہوتی ہے۔

ممکن ہے تم اپنی صفائی میں کہو کہ تم نے اپنی نظم میں چمر کی نوکیلی چٹانوں اور "منزلوں کا وطن" کے اشارے بھی دیے ہیں جن کا رخ جموں کی طرف ہے لیکن نہیں پیشیں، یہ چالاکی کی بات ہے۔ یہ "عقل بیا ہے سو کس علتی ہے" کی سی بات ہے۔ یہ اشارے اتنے دبے دبے اور مبہم ہیں کہ بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔

اور ایک بات بھی ہے۔ تم نے اپنی نظم میں روم، پیرس، لندن، ماسکو اور واشنگٹن کے نام لئے ہیں اور یہ کہتے ہوئے کہ "سامنے میں ہم سر تیرا ہے جو ملک" "سوئٹزرلینڈ" کا ذکر بھی کیا ہے اور مجھے بتایا ہے کہ تم نے میری خاطر مجھ کشمیر کی خاطر ان سب کو ٹھکرا دیا۔

میرے نام اپنی اس نظم میں تم نے اور بہت سے شہروں کے نام گنوائے ہیں اور مجھ سے کہا ہے کہ:

میرا ... بھی تو، ہے چنڈی گڑھ بھی تو
میرا ملتان بھی تو، ہے بنگلور بھی تو اور سکھر بھی تو
اور وہ مولد مرا
عیسیٰ خیل کا بسایا ہوا گاؤں بھی تو ہے
اے مرغزاروں کی دنیا

تم نے دنیا جہاں کے شہروں کے نام لئے ہیں لیکن ان میں بھارت کے کسی شہر کا کوئی ذکر نہیں۔ انتہا یہ ہے کہ نظم میں دہلی بھی غائب ہے۔ اسے میرے دیوانے میرے بیکار خوش فہم ہوشیار دیوانے، کہیں یہ سادگی و پرکاری اس لئے تو نہیں کہ جنم مرن کے ساتھی کی بات ان سے نہیں کی جاتی جن سے محض فلرٹ کرنا مقصود ہو۔

آخر میں ایک معذرت!.... مجھے تمہاری نظم کا جواب نظم میں دینا چاہئے تھا لیکن میں جو کہ شاعر نہیں، تو شعر کیسے کہوں؟

# براہِ راست

نام کی معنویت کے اعتبار سے جس قدر بھی ممکن ہو سکا ہے ہم نے "چہارسُو" کو اردو ادب کی ہمہ جہتی کا امین بنانے میں اپنی تمام کاوشات کو بہتر سے بہتر انداز میں استعمال کرنے اور ایساندارانہ طریق پر اپنی پیشکش کو آپ کے روبرو لانے کی خواہش میں اکثر کڑا کوس بھی کاٹے ہیں۔ زیرِ نظر شمارہ ہمارے دعویٰ کی تصدیق میں کسی طرح بھی سند سے کم تصور نہ کیا جانا چاہیئے کیونکہ جناب محمود ہاشمی جیسے کم گو اور گوشہ نشین اہلِ قلم سے فیضیاب ہونا معجزہ نمائی کی دلیل ہے!!

زیرِ نظر شمارہ میں کشمیر جنت نظیر کے فرزند جناب محمود ہاشمی کی خدمات کا اعترافِ شان نگاہی سے کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے موجودہ زمانے کے ساتھ آنے والے وقت کی بابت ہر طرح کی خوش گمانی قائم کرنا قرین انصاف تصور کیا جانا چاہیئے!!!

**گلزار جاوید**

☆ گفتگو کی ابتدا آپ کی صحت اور روز و شب سے کی جائے تو مناسب رہے گا؟

☆☆ ایک ادبی اور صحافتی شخص کے لئے لکھنے پڑھنے سے بہتر مصروفیت کیا ہو سکتی ہے سو میں بھی آخری وقت میں زیادہ سے زیادہ سیکھنے کا مشتاق رہتا ہوں۔ صحت میری اُتنی ہی عمدہ ہے جتنی نوّے برس کے شخص کی ہونی چاہیئے۔

☆ کم و بیش ستر سال کے فنی سفر کی ابتدا اور انتہا کی بابت آپ کے احساسات اور خواہشات کی نسبت دریافت کرنا خاموش سمندر میں کنکر پھینکنے کے مترادف ہے مگر گفتگو کا تقاضا اور وقت کی ضرورت ہمیں مجبور کر رہی ہے؟

☆☆ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے..... بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے۔

☆ کسی طرح کی خلش، ندامت، محرومی یا فراموش کئے جانے کا احساس تنہائی میں آ کر کبھی دستک دیتا ہے؟

☆☆ کبھی نہیں، پروردگارِ عالم کی مہربانی سے میں ہر طرح سے مطمئن و مسرور ہوں۔

☆ آپ کے اندر چھپے تخلیق کار کو انگریزی کے استاد ممتاز مفتی کی شخصیت کے کھوج نے دریافت کیا تھا یا اس کا کریڈٹ کسی اور کو جاتا ہے؟

☆☆ اس کا کریڈٹ میرے آغا جان کو بھی جاتا ہے وہ ہائی اسکول گوجرہ ضلع لائل پور (حال فیصل آباد) میں ٹیچر تھے۔ اس کے علاوہ اسکول کی لائبریری کے بھی انچارج تھے۔ چنانچہ ساری لائبریری میری دسترس میں تھی۔ میں انھیں "آغا جان" تا "بابا" بلوچستان میں مرحوم والد کے تعلق کی وجہ سے کہتا تھا۔

☆ کالج کے رسالے "تَوی" سے آپ کی وابستگی اور اُس دوران ملنے والی تحریک اور رہنمائی کے بطن سے وجود میں آنے والی تخلیقات کی بابت آج آپ کے احساسات کیا ہیں؟

☆☆ کوئی خاص نہیں۔ "تَوی" بہر حال کالج میگزین تھا اور اس کی حیثیت بھی کالج میگزین ہی کی تھی۔ اسے میں ہمیشہ ایک تجرباتی دور سمجھتا ہوں۔ ویسے کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ اگر ممکن ہو تو اُسے دیکھوں تو کیسی چیزیں تھیں جو لکھتا تھا۔ ویسے ہمارے کالج سے ایک نیوز ویکلی بھی نکلتا تھا جس کا میں ایڈیٹر تھا۔ یہ ہمارے اس زمانے کے ڈائریکٹر ایجوکیشن خواجہ غلام السیدین کی اختراع تھی۔ میں نے اس "نیوز ویکلی" کا تذکرہ "کشمیر اُداس ہے" کے ایک ایپی سوڈ میں کیا ہے۔

☆ کیا آپ نے کبھی محسوس کیا کہ آپ کی زندگی میں خانہ بدوشی کا عنصر نمایاں کیوں ہے؟

☆☆ ہمیشہ..... خانہ بدوشی میری زندگی کا نمایاں عنصر رہی ہے۔ میں نے اپنی اکثر تحریروں میں اپنی زندگی کے اس انداز کا ذکر بھی کیا ہے۔

☆ آپ کی بیشتر تحریروں میں تو تنہائی کی کیفیت اس قدر نمایاں ہونے کے باوجود وطن سے دور بس جانا قرینِ قیاس نہیں لگتا جبکہ اُس دور میں برصغیر بالخصوص پاکستان میں ترقی کے مواقع آج کی نسبت کہیں زیادہ تھے؟

☆☆ میں نے اپنی تحریروں میں اس کا بھی کہیں ذکر کیا ہے (یا شاید نہیں کیا) بہر حال یہ ایک حقیقت ہے اور اس کا میرے پاس کوئی جواز نہیں۔

☆ یہی کیفیت آپ کے قلمی سفر میں بھی نمایاں ہے۔ افسانہ، رپورتاژ، خاکے، تنقید، ڈرامہ وغیرہ میں انتہا کا حاصل کام کرنے کے باوجود مجموعہ نہیں ہے؟

☆☆ یہ تو ہے۔ اس کا بھی میرے پاس کوئی جواز نہیں ہے جو پیش کر سکوں۔

☆ "کشمیر اُداس ہے" کن احساسات اور مقاصد کے تحت لکھا اور اس کے بعد آپ کا تخلیقی سفر جمود کا شکار کیوں ہوا؟

☆☆ "کشمیر اُداس ہے" لکھنے کی وجہ کچھ میں نے اور کچھ میری دیباچہ نگار ممتاز شیریں نے لکھ دی ہے..... اس کے بعد جمود والی بات غلط ہے۔ میرا قلم ہمیشہ متحرک رہا ہے اور اس جانب آپ نے بھی اپنے سوال نمبر 8 میں اشارہ کیا ہے۔

☆ "کشمیر اُداس ہے" کے بارے ایک تاثر بہت عام ہے کہ اس کی بنیاد سچ پر ہے کیا کوئی تخلیق صدقِ صدیق کی بنیاد پر بنا کسی ویژن اور تخیل کے لکھی جا سکتی ہے؟

☆☆ سوال دلچسپ ہے اور خیال انگیز بھی.... اس کا جواب غالباً یہ ہے کہ سچ مشاہدہ کرنے والی آنکھ میں ہوتا ہے۔

☆ اس طرح کی تکنیک اور تجربہ کرشن چندر کو مطعون ٹھہرائے جانے کے سبب دانستہ تو نہیں کیا گیا؟

☆☆ اس کا جواب ممتاز شیریں دے سکتی تھیں کاش وہ زندہ ہوتیں!

☆ "کشمیر اُداس ہے" کے جعلی ایڈیشن چھپنے کی روداد کیا ہے؟

☆☆ سوال میری سمجھ میں نہیں آیا۔ غالباً آپ کا اشارہ "کشمیر اُداس ہے" کے اُن ایڈیشنوں کے بارے میں ہے جو کسی زمانے میں بھارت میں چھپے تھے۔

☆ اتنے اہم اور وسیع موضوع کو رپورتاژ تک محدود رکھنا کیوں ضروری سمجھا گیا جبکہ اس کا مواد اور انداز تحریر اسے ناول یا سفرنامہ بھی بنا سکتے تھے؟

☆☆ اگر میں اسے ناول یا سفرنامے کی صورت دیتا تو وہ سچ جو اس کی خصوصیت ہے غارت ہو جاتا۔

☆ "مشرق" سے جذباتی وابستگی اور ادارتی علیحدگی کی بابت کچھ روشنی ڈالئے؟

☆☆ اس سوال کے جواب میں آپ کو مضمون 'مشرق کی کہانی' بھیج رہا ہوں۔ اس میں آپ کے سوال کا آپ کو مکمل جواب مل جائے گا۔

☆ آپ نے جس قدر خطوط تحریر کئے ہیں شاید کسی اور اہل قلم نے اتنی تعداد میں خطوط نہ تحریر کئے ہوں۔ اس کے اسباب بھی یقیناً کچھ رہے ہوں گے؟

☆☆ میں نے اگر خطوط تحریر کئے ہیں تو وصول بھی کئے ہیں۔ آپ کو اس طرح کے خطوط کی فوٹو کاپی بھیج رہا ہوں جن سے آپ کو اپنے سوال کا جواب بہتر طریقہ پر مل جائے گا۔

☆ ایک تاثر یہ ہے کہ آپ نے "مشرق" کی ادارت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ذاتی مراسم کو بڑھاوا دیا؟

☆☆ نجانے آپ نے یا کسی اور نے یہ تاثر کیسے لیا۔ اس کا تو بحیثیت ایڈیٹر آپ کو بھی تجربہ ہوگا کہ آپ چاہیں یا نہ چاہیں ذاتی مراسم کو بہرحال بڑھاوا ملتا ہے۔

☆ آپ کو بابائے صحافت کا خطاب کب اور کن خدمات پر دیا گیا اور کس جانب سے دیا گیا؟

☆☆ اس طرح کے خطابات بھی کوئی ادارہ یا فرد نہیں دیتا۔

☆ اردو زبان و ادب کو وطن سے دور پھیلانے کے جذبات میں کیا محرکات پنہاں تھے اور آپ کو اپنے مقاصد میں کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی؟

☆☆ محرکات کا تو مجھے علم نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں (تکلف بر طرف) خاصی کامیابی ہوئی۔

☆ آپ کی توجہ اور حوصلہ افزائی کے باعث مغرب میں بسنے والے جن لوگوں نے اردو زبان و ادب کی جانب رجوع کیا اُن میں اہم نام کون سے ہیں یا آپ جن کی صلاحیتوں سے متاثر ہوں؟

☆☆ 'مشرق کی کہانی' کے صفحہ ۸ پر اس سوال کا جواب بھی موجود ہے۔

☆ ایک تاثر آپ کی بابت یہ ہے کہ آپ جب کوئی کام کرنے کی ٹھان لیتے ہیں تو اُسے سر پر سوار کر لیتے ہیں جس کی مثال "اردو قاعدہ" کی تحریر و ترتیب سے دی جا سکتی ہے؟

☆☆ اس کی مثال صرف قاعدہ ہی نہیں۔ یہ میری عادت بن چکی ہے میں ہر کام انتہائی محنت سے کرتا ہوں۔

☆ بقول آپ کے اردو کے ادیبوں نے آپ کے اس قاعدہ کو گھاس کیوں نہ ڈالی؟

☆☆ میں اس سوال کا مطلب نہیں سمجھ سکا معلوم ہوتا ہے آپ نے اسے اصل متن سے الگ کر کے لکھا ہے جس کی وجہ سے (بے تکلفی معاف) یہ سوال میرے پلّے نہیں پڑا۔

☆ اتنا طویل عرصہ مغرب میں گذارنے کے باوجود ہجرت کے حوالے سے آپ کی نسبت کوئی بڑی تخلیق نظر سے کبھی نہ گذری؟

☆☆ مشہور مستشرق رالف رسل نے ایک امریکی یونیورسٹی کے لئے 'مشرق کی کہانی' کا ترجمہ کیا تھا یہ میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔

☆ ایک زمانے میں آپ کے پسندیدہ شاعر 'فخر الایمان' مصطفیٰ زیدی' ابنِ انشا' افتخار عارف' ساقی فاروقی اور مرزا فق جبکہ محبوب ادیب عزیز احمد اور قراۃ العین حیدر ہوا کرتے تھے آج کل کیا صورت حال ہے؟

☆☆ وقت وقت کی بات ہے پسند و ناپسند وقت کے موڈ پر منحصر ہوتی ہے۔

☆ اسی زمانے میں آپ نے پنجاب کے شاعروں کو فراڈ اور یوپی کے شاعروں کو کارل مارکس کے عشق میں گرفتار ہونے کا الزام لگایا تھا آج کے شعرا ایک دنیا کی جانب آپ کا حسن ظن کیا ہے؟

☆☆ اس بات کو بھی آپ نے متن سے الگ کر دیا ہے۔ غلط فہمی اسی طرح پیدا ہوتی ہے۔

☆ کچھ اسی طور آپ نے منٹو، بیدی، عصمت، قاسمی اور انتظار حسین وغیرہ پر جمود کا الزام بھی لگایا تھا۔ بدلتے حالات کے مطابق اور تازہ دم تخلیق کاروں کی آمد کے نتیجے میں کبھی آپ کو اپنی رائے سے رجوع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی؟

☆ یہ بھی وقت اور موڈ کا معاملہ ہے ورنہ میری جرأت کہاں کہ انھیں الزام دوں۔

☆ غالب سے آپ کی خصوصی دلچسپی کی وجوہات اور اس کے نتائج سے غالب شناسوں کو پہنچنے والے فوائد کی نسبت کچھ بیان کیجیے؟

☆☆ غالب سے میں نے اپنی خصوصی دلچسپی کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ نجانے آپ کو اس بارے میں یہ غلط فہمی کیسے ہوئی۔

☆ آپ سے بہتر شاید اردو زبان و ادب کو میسر آ نہیں سکتا۔ ازراہ کرام اردو زبان اور ادب کا موازنہ دیگر ترقی یافتہ زبانوں اور ادب سے کرنے کے بعد صحیح اور درست رائے سے ہمارے قارئین کو آگاہ کیجیے؟

☆☆ آپ نے اس نا جاں ناتواں پر کچھ زیادہ ہی بوجھ ڈال دیا ہے۔ میں کون ہوتا ہوں اس طرح کی باتیں کرنے والا۔ ویسے میرے خیالات میری تحریروں میں موجود ہیں بشرطیکہ انھیں ان کے اصل متن سے الگ نہ کیا جائے۔

☆ زحمت سے بچنے کے لئے ایک ہی وقت میں ہماری خواہش موجودہ دور میں تخلیقی اور تنقیدی ادب کی رفتار اور معیار کی بابت آپ کی رائے جاننے کی ہے جس میں یقینا انڈو پاک کے علاوہ امریکہ، برطانیہ، کناڈا اور مشرق وسطیٰ بھی زیر بحث ہوں گے؟

☆☆ اس کا جواب بھی وہی ہے جو میں نے سوال نمبر 27 کے سلسلے میں دیا ہے۔

☆ پطرس بخاری کی طرح محدود قلمی سرمایہ کے بل پر اردو ادب میں آپ کا مقام کب تک اور کس شکل میں برقرار رہنے کی اُمید ہے۔ جواب دینے سے قبل خطے کی موجودہ سیاسی اور مستقبل کی جغرافیائی شکل کو دھیان ضرور دیجیے؟

☆☆ میں آپ کے سوال کا جواب آپ کے اندیشوں کے عین مطابق وقت کے نباض اور شناوروں کے سپرد کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔

☆ ترقی یافتہ دنیا سے قربت اور موجودہ عالمی منظر نامے کے آئینے میں اُردو زبان و ادب کا مستقبل آپ کے خیال میں کس طرح کا ہے؟

☆☆ اردو زبان بڑی سخت جان ہے۔ یہ کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ مجھے اس کا مستقبل اس کے حال کی طرح خاصا روشن نظر آتا ہے۔

☆

O

O وہ (صفوتؔ) اپنا کنواں خود کھود کر پانی پینے کا قائل ہے۔ سید ضمیر جعفری

O صفوتؔ تجربات، مشاہدات، جذبات اور احساسات کی تفریق اور تمیز کی کامیاب نشاندہی اور نظم آرائی کی راہ پر گامزن ہے۔ مامون ایمنؔ

O 'سوادِ حور' نے مجھے شاعری کے ایک بالکل نئے اور انوکھے ذائقے سے آشنا کیا ہے۔ غلام مرتضیٰ راہی

اُردو ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھنے والی تخالیق

'مثنوی وقت' اور 'مثنوی رسولؐ' کے شاعر

صفوتؔ علی صفوتؔ کی ایک اور تخریہ پیش کش

# سوادِ حُور

(حمد، نعت، غزل، نظم، رباعی)

صفحات: 216

قیمت: انڈو پاک میں -/250 روپئے، دیگر ممالک میں 20 ڈالر

رابطہ:

O موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔۲

O راہی منزل، بی، فتح پور (یو۔پی) ۲۱۲۶۰۱

بیرون ملک رابطہ: 14-Woods Row, Monroe, CT 06468, USA

O

# مشرق کی کہانی

محمود ہاشمی

۱۹۵۵ـ۵۶ء کا زمانہ تھا۔ جب برطانیہ جنگ سے اپنے تباہ شدہ شہروں اور فیکٹریوں کی جلد از جلد تعمیر کرنے میں مصروف تھا۔ اسے افرادی قوت کی شدید ضرورت تھی۔ اس کے دروازے کھلے تھے اور میرپور، کیمبل پور، پنجاب کے جفاکش محنتی، دیہاتی دھڑا دھڑ پہنچ رہے تھے۔ یہ برطانیہ میں ان پڑھ مزدوروں کے عروج کا زمانہ تھا۔ پڑھے لکھے بھی اکا دکا آ رہے تھے۔ لیکن ان پڑھ مزدوروں کے مقابلے میں ان کی کارکردگی کا گراف کافی گرا ہوا تھا۔ ان میں سے اکثر فیکٹریوں میں کام کرنا اپنی اور اپنی تعلیمی ڈگریوں کی توہین سمجھتے تھے اور انگریز ان کی ڈگریوں کو وہ اہمیت دینے کو تیار نہ تھا، جس پر انھیں ناز تھا۔ بعض نے البتہ حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور اپنا بی اے، ایم اے بھول کر اپنے ہم وطنوں کے پہلو بہ پہلو کام کرنے لگے۔ کچھ بسوں میں کنڈکٹر، ریل کے محکمے میں پورٹر اور ڈاکخانوں میں پوسٹ مین بن گئے۔ تھوڑے سے کچھ خوش نصیب مقامی اسکولوں میں استاد بن گئے۔

انگریز کو وہ پاکستانی بہت اچھے لگتے تھے، جو صرف "یس۔ نو۔ او کے۔ ٹھیک ہے" کہہ سکتے تھے اور جن سے اگر کوئی گورا منیجر یا فورمین انگریزی میں بات کرتا تو دونوں ہاتھ اٹھا کر بڑی معصوم مسکراہٹ کے ساتھ کہتے "نی نو ہندوستان" (نی نو انڈرسٹینڈ) یعنی میں انگریزی نہیں سمجھتا۔ فیکٹری کے منیجر اور فورمین کو یہ سیدھی سادی، بے ضرر اور اپنے کام سے کام رکھنے والی مخلوق بہت پیاری لگتی تھی۔ ان کے مقابلے میں انھیں دقت، جب کوئی کنگز انگلش سے لیس، گرامر کی غلطیوں سے پاک اور بڑی کلاسیکل قسم کی انگریزی بولنے والے سانولے چہرے سے واسطہ پڑتا، تو وہ حیرت سے دیکھتے "یہ کون ہے؟" بعض صورتوں میں وہ اسے اپنی اتھارٹی (Authority) کے لئے چیلنج سمجھتے۔ "یہ کون ہے، جو ہم سے ہمارے دیس میں آ کر اس طرح کی باتیں کر رہا ہے جیسے ہم جیسا ہو"۔ ایک اجنبی لہجے میں نوک پلک سے درست انگریزی انھیں کوئی نئی زبان لگتی اور وہ اسے سمجھنے سے انکار کر دیتے۔ اس کے علاوہ بہت سے انگریزی کے الفاظ کے بھی جیسے معنی ہی بدل گئے تھے اور وہ انگریزی جسے وطنِ عزیز میں بڑی محنت سے سیکھا تھا اکثر دم توڑتی نظر آتی۔ یہاں "ڈنر" شام کا کھانا نہیں، بلکہ دوپہر کا کھانا تھا۔ رات کے وقت کسی پہلی ملاقات میں "گڈ نائٹ" کہنا مختصر خیر تھا۔ شام ہوتے رات بارہ بجے تک جاری رہتی تھی اور اس وقت تک ختم نہیں ہوتی تھی جب تک کہ "گڈ نائٹ" کہہ کر ایک دوسرے سے رخصت نہ ہوں۔ ان انگریزی محاوروں اور کہاوتوں سے جنھیں انگریز کے ہندوستان میں بڑی محنت سے پڑھا اور پڑھایا جاتا تھا، یہاں کے پڑھے لکھے بھی عام طور پر بیگانے تھے۔ گفتگو کا وہ انداز جس میں محاوروں اور کہاوتوں کا سہارا لیا جائے، وکٹورین عہد کی یادگار سمجھا جاتا تھا، یہاں "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کا دور ختم ہو چکا تھا۔ بڑے بوڑھوں کے تجربوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ چند پرانے حوالے نہ دو اپنے تجربے کی بات کرو۔

حاکم انگریز کی دی ہوئی تعلیم اس کے وطن میں آ کر اس نئے امتحان میں فیل ہو گئی تھی اور ان کا جو وطنِ عزیز سے کورے آئے تھے، بول بالا تھا۔ ان کا احساسِ کمتری ختم ہو رہا تھا۔ خود اعتمادی پیدا ہو رہی تھی۔ خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہو رہی تھیں۔ برطانیہ میں ایک نئی دنیا آباد ہو رہی تھی۔ مغرب میں مشرق کا ایک نیا گوشہ نمودار ہو رہا تھا اور اس نئے گوشے میں ۷ اپریل ۱۹۶۱ء کو برطانیہ بلکہ مغرب میں اردو کا پہلا باقاعدہ اخبار ہفت روزہ "مشرق" نمودار ہوا۔

مشرق کا اجرا ہوا تو مجھے ان تجربوں سے گزرنا پڑا جو ایک ایسے اخبار کے ایڈیٹر کو لازمی طور پر پیش آتے ہیں جس کے پڑھنے والے ہزاروں میل دور بیٹھے وطنِ عزیز کی تازہ ترین خبریں معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہوں اور ان میں بیشتر ایسے ہوں جنھوں نے مشرق سے پہلے کسی اخبار کا نام تک نہ سنا ہو۔ یہ لوگ وطنِ عزیز کے ان دور دراز دیہاتوں سے آئے تھے جہاں کبھی کبھار کسی پردیس گئے ہوئے نوجوان کا خط آتا تھا تو سارے گاؤں کا مشترکہ خط بن جاتا تھا۔ اس طرح کے خطوں کے آخر میں لکھا ہوا یہ جملہ کہ "تمام پڑھنے سننے والوں کو سلام ہو" اس اشتراک کی تصدیق بھی کر دیتا تھا۔ گاؤں کے بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں اسے کسی پڑھے لکھے سے پڑھوا کر سنتے بھی اس انداز میں تھے جیسے یہ گاؤں کے ہر فرد کے لئے لکھا گیا ہو اور اس میں لکھی ہوئی ہر بات ہر ایک کو یہ احساس دلاتی تھی جیسے یہ بس اس کے لئے ہی لکھی گئی ہو۔

اس زمانے میں یہی کیفیت برطانیہ میں آنے والوں کی اکثریت کی تھی۔ وہ دن رات یہاں کے کارخانوں میں کام کرتے اور پھر تو اکثر کسی ایک گھر میں جمع ہو جاتے جہاں کسی کا گاؤں سے خط آیا ہوتا تھا۔ سب اس خط کو سنتے، بار بار سنتے اور پھر اس میں لکھی ہوئی باتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے چھٹی کا دن گزار دیتے۔ "مشرق" شروع ہوا تو اسے بھی وطنِ عزیز سے آیا ہوا ایک طویل خط سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اکثر یہی ہوا کہ مشرق کا مقابلہ ان خطوط سے ہونے لگا جو انھیں گھر سے آتے تھے اور یہ مقابلہ خاصا سخت تھا۔ مثال کے طور پر اگر ہمارے قارئین میں سے کسی کے خط میں مقامی تحصیلدار یا چوہدری کے تبادلے یا گاؤں میں کسی افسر کے دورے کی خبر آ جاتی اور مشرق میں اس کا ذکر نہ ہوتا تو ٹیلیفون پر ہمیں سرزنش کی جاتی اور یا خبر ہو کر اخبار اٹھانے پر ایک لیکچر پلا دیا جاتا۔ ایک مرتبہ ہم نے ایک گروسر صاحب سے اشتہار کے لئے کہا (ان دنوں یہ مہم

جیسے بڑے شہر میں بھی ایشیائی گروسری کی صرف گنتی کی چند دکانیں تھیں) انہوں نے بڑے شوق سے رضامندی کا اظہار کیا۔ پھر جب ان سے کہا گیا کہ اگر یہ اشتہار مشرق میں ہر ہفتہ دیا کریں تو شاید بہتر ہو۔ خوش ہو کر بولے ”آپ بہتر سمجھتے ہیں جو مناسب ہو وہی کریں“ لیکن چار پانچ اشاعتوں کے بعد جب ان سے اشتہار کی قیمت کا مطالبہ کیا گیا تو خفا ہو گئے اور کہا ”یہ بھی خوب رہی صاحب ہمارا تو خیال تھا کہ اخبار کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ہر طرح کی معلومات بہم پہنچائے۔ یہ معلوم نہ تھا کہ اس ملک میں آ کر آپ بھی پیسہ کمانے کے چکر میں پڑ جائیں گے“ بعض قارئین پر بھی اس کا خوش گوار اثر نہ ہوا۔ ایک پھرے ہوئے قاری کا فون آیا کہ جناب اخبار نکالنا ہے تو اسے اخبار کی طرح نکالیے۔ یہ کیا ہوا کہ پچھلے کئی ہفتوں سے ایک گروسری کی خبر بار بار دی جا رہی ہے۔

مشرق کے اس اولین دور میں ہمیں بعض اوقات بڑے دلچسپ خطوط موصول ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے لکھا مشرق میں افسانہ ”کہاں ہے منزل تیری“ پڑھا اس میں جس لڑکی نسیمہ کا حال لکھا گیا ہے اس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا ہے۔ میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں مہربانی کر کے واپسی ڈاک اس کا ایڈریس لکھ دیں۔ جوابی لفافہ ارسال خدمت ہے.....!!

مشرق شروع ہوا تو شاعروں کی بن آئی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے پاکستان اور ہندوستان کے تمام ”مقامی“ شعراء برطانیہ میں تشریف لا چکے ہیں۔ اکثر نے اپنی غزلیں اور نظمیں بھیجنا شروع کر دیں۔ ایک صاحب تو اپنی غزلوں کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا مسودہ لے کر مشرق کے دفتر پہنچ گئے کہ اس میں سے جو پسند آئے برائے اشاعت رکھ لیں۔ ان کا تمام کلام ابھی غیر مطبوعہ تھا۔ لہٰذا ازراہ ”مشرق پروری“ انہوں نے یہ عندیہ بھی ظاہر کیا کہ اگر ہم ہر ہفتے ان کا کلام شائع کریں اور اس پر ”خاص برائے مشرق“ یا ”بغرض اشاعت ادارہ مشرق“ لکھ دیا کریں تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ البتہ ایک ایسی غزل آئی جس کے ایک شعر کے سامنے ہم نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ شعر تھا:

جھوٹے عاشق ہیں جو روتے ہیں اور آہ و بکا کرتے ہیں
ہم تو شب ہجراں میں بھی مشرق ہی پڑھا کرتے ہیں

”مشرق“ کے قارئین میں ’گھر جیسے ہی کئی‘ لیکن ایسے بھی تھے جو قطعاً ان پڑھ تھے۔ اخبار خریدتے کسی دوسرے سے پڑھوا کر سنتے اور پھر پڑھے لکھوں کے ساتھ سیاست اور حالات حاضرہ پر بڑے ذوق کے ساتھ تبادلہ خیال کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان میں سے بعض اخبار پڑھنے کے اس قدر عادی ہو گئے کہ جب وہ دو ایک سال چھٹی گزارنے گاؤں جاتے تو یہ انتظام کر کے جاتے کہ مشرق انہیں باقاعدگی سے ان کے گاؤں میں ملتا رہے۔ مشرق کے قارئین میں ایسوں کی بھی کمی نہ تھی جو اپنے گاؤں کی مسجد سے قرآن شریف ناظرہ پڑھ کر آئے تھے اور عربی رسم الخط کے سہارے مشرق کی اردو پڑھتے تھے۔ انہیں اس سے غرض نہیں تھی کہ اس میں لکھا ہوا ہر لفظ پڑھ سکیں یا جو کچھ پڑھا جائے سمجھ سکیں۔ ان کے لئے یہی کافی تھا کہ یہ ان کا اپنا اخبار ہے اور اس کی موجودگی میں اب وہ ”ان پڑھ“ اور ”بے علم“ نہیں رہے۔ بڑی منحوس گھڑی میں بس میں بیٹھ کر وہ اپنی فیکٹری کو جا رہے ہوتے یا فیکٹری میں چائے یا دوپہر کے کھانے کے دوران جب ان کے انگریز ساتھی اپنا اپنا اخبار سامنے رکھ کر اس سے ”فٹ بال پول“ کے بارے میں اپنی معلومات میں اضافہ کرتے تو یہ بھی اپنا اخبار ”مشرق“ جیب سے نکال کر اس میں منہمک ہو جاتے۔ یہ ان کا اخبار تھا۔ ان کی زبان اور تہذیب کا مظہر تھا۔ ”مشرق“ نہیں تھا تو ایسے وقتوں میں ہونق بنے بیٹھے رہتے تھے یا آپس میں اپنی زبان میں باتیں کرتے تھے تو ان کے انگریز ساتھی انہیں ”نکں بلدہ“ اور ان پڑھ سمجھتے تھے۔ بعض انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ بعض کو ان سے ہمدردی ہوتی تھی انہیں دیکھ کر ان کے خداترسی کے جذبات اور ”جذبہ ترحم“ کو آسودگی ملتی تھی۔ بعض انہیں اس قابل ہی نہیں سمجھتے تھے کہ اپنی طرح کا انسان سمجھیں۔ لیکن اب ان کے ہاتھ میں ”مشرق“ دیکھ کر وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ یہ سانولی اور کالی مخلوق بھی ان ہی کی طرح انسان ہے۔ یہ بھی اپنی ایک زبان رکھتے ہیں اور یہ زبان اتنی ترقی یافتہ ہے کہ اس میں اخبار تک موجود ہے اور اگر یہ لوگ انگریزی سے نابلد ہیں تو اس کا یہ ہرگز جواز نہیں کہ انہیں ایک ایسا جانور سمجھا جائے جسے تھوڑی سی مشق کے بعد کولہو کا بیل بنا کر کسی جسمانی کام میں لگایا جا سکتا ہے۔ اب ان میں سے اکثر ان سے مرعوب بھی ہونے لگے تھے۔ اگر یہ لوگ انگریزی سے نابلد ہیں تو انگریز بھی تو ان کی زبان سے ناواقف ہیں۔ لہٰذا اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ”مشرق“ کی وجہ سے انہیں ایک تشخص مل گیا تھا۔ انہیں وہ ”عزت نفس“ مل گئی تھی جو اس سے قبل اس اجنبی دنیا میں ان کے لئے مفقود تھی۔

مشرق ان پڑھوں کا اخبار تھا۔ ان پڑھ مزدوروں کا اخبار تھا لیکن یہ ان پڑھ ایسے تھے جو کئی نام نہاد پڑھے لکھوں پر بھاری تھے۔ نئے ملک میں آ کر جب انہیں سازگار حالات اور اپنی زندگی بہتر بنانے کے مواقع میسر آئے تو ان کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہونے لگیں۔ ان کی شخصیت خود اعتمادی کا رنگ پا کر ایک نئے روپ میں ابھرنے لگی۔ ”آدابِ خود آگاہی“ نے جہالت کی وہ زنجیریں توڑ دیں اور اُن پر جو نسل بانسل سے جہالت اور بے علمی کے غلام تھے ”اسرار شہنشاہی“ کھلنے لگے۔ پاکستان اور ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی ڈگریاں ان کے مقابلے میں بے بضاعت ہو کر رہ گئیں۔

اخبار نکالنے سے پہلے ہمیں یہ احساس نہیں تھا کہ یہاں اپنے لیڈر لوگ بھی ہوں گے۔ اخبار نکالنے کے بعد پتہ چلا کہ جہاں اخبار ہو وہاں لیڈر خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں اور ہر ایک لیڈر اخبار میں اپنا نام اور تصویر چھپوانے کا متمنی ہوتا ہے۔ جب ہم نے دو ایک کی تصویر چھاپی تو کچھ اس طرح کی صورت

پیدا ہو گئی جیسے برطانیہ میں پاکستانیوں اور کشمیریوں کے ہر گھر میں ایک سیاسی یا سماجی جماعت موجود ہے۔ ہر ہفتہ اخبار میں چھپی ہوئی کسی خبر پر اظہار خیال کے طور پر ہمیں کسی نہ کسی جماعت کے صدر، سیکرٹری یا کسی اور عہدہ دار کا بیان موصول ہو جاتا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ بیانات "قارئین کے خطوط" کے کالم میں چھاپا کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خطوط کے صفحات ایک سے دو اور دو سے تین ہو گئے۔ اب ہم نے ان لیڈر حضرات پر یہ واضح کیا کہ ضروری نہیں کہ ہر لیڈر ہر ہفتہ کسی اہم خبر پر اپنے ردعمل کا اظہار کرے۔ بہتر ہو گا کہ وہ کوئی عملی کام کریں اور اس کی خبر بھیجیں۔ اس کے بعد ہفتہ جیسے سارے ملک میں مسئلہ کشمیر، اپنے علاقے میں مسجد کی تعمیر اور اپنے گاؤں میں قبرستان کی چار دیواری یا لڑکیوں کے اسکول کے لئے چندہ کی فراہمی کے جلسوں کی خبریں آنے لگیں۔ ہر مقرر کی پاسپورٹ سائز تصویر بھی برائے اشاعت خبر کے ساتھ ہوتی۔

اخبار کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ برطانیہ میں ہماری جماعتیں اور انجمنیں بڑھنے لگیں۔ ان کا دائرہ کار وسیع ہونے لگا۔ جلسوں سے معاملہ مظاہروں تک پہنچا۔ بھارتی ہائی کمیشن کے سامنے مسئلہ کشمیر کے بارے میں مظاہرہ، پاکستان ہائی کمیشن کے سامنے پاسپورٹ کی بیحد ناقص سروس کے سلسلے میں ہائی کمیشن کے رویے کے خلاف مظاہرہ، دولت مشترکہ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر مالبرو ہاؤس کے سامنے مظاہرہ اور پاکستان کے ہائی کمشنر کے ساتھ مختلف جماعتوں اور انجمنوں کے وفود کی ملاقاتیں عام ہونے لگیں۔ اس دوران کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ کوئی لیڈر صاحب، اپنی تقریر لکھوانے مشرق کے دفتر پہنچ جاتے۔ جب ہم ان سے معذرت کرتے کہ یہ ہمارا کام نہیں، کیوں کہ ہمارے پاس پہلے ہی عملے کی کمی ہے یا انتہائی مصروف ہیں تو وہ ناراض ہو جاتے کہ "یہ بھی خوب رہی اخبار تو نکال لیا لیکن ہمارا اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتے"۔

مشرق کا اجراء برطانیہ میں مقیم آزاد کشمیریوں اور پاکستانیوں کی زندگی کا ایک انتہائی اہم واقعہ تھا۔ مشرق ان کی ضرورت تھی اور اس ضرورت کو ان کی پسند کے مطابق پورا کیا اور اس کے باوجود کہ تعلیم بالغاں کا کورس بننے سے بچائے رکھا بلکہ پڑھے لکھوں کے لئے بھی قابل قبول بنایا، اس کے لئے بڑی ذمہ داری تھی۔ یہ ذمہ داری اس وجہ سے کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی کہ اب پڑھے لکھے لوگ بھی یہاں پہنچنے لگے تھے۔

۱۹۶۳ء میں تارکین وطن کے برطانیہ میں داخلہ پر پابندی کا قانون نافذ ہوا۔ پہلے یہاں پہنچنے کے لئے محض پاسپورٹ کافی تھا۔ اب یہاں آنے سے پہلے برطانوی حکومت سے انٹری سرٹیفکیٹ یا ویزا حاصل کرنا ضروری تھا۔ انٹری سرٹیفکیٹ میرپور اور پنجاب کے دیہاتیوں کے بجائے بی اے، ایم اے پاس قسمت آزماؤں کو زیادہ آسانی سے مل سکتے تھے۔ اب پڑھے لکھوں کے ساتھ ساتھ بیوی بچوں کو منگوانے کا دور شروع ہو گیا۔ آزاد کشمیر اور پنجاب کے دیہات سے یہاں پہلے سے آئے ہوئے شوہروں کے پاس ان کے بیوی بچے بھی پہنچنے لگے۔ یہ نو وارد برطانوی منظر پر کچھ اس انداز سے نمایاں ہوئے کہ ہمیں مشرق میں خواتین کا صفحہ اور تعلیم و تربیت کا صفحہ بڑھانا پڑا۔ خواتین کا صفحہ مختلف اوقات میں رفعت اقبال (شادی کے بعد رفعت مجیب) اور مشہور افسانہ نگار محسنہ جیلانی لکھا کرتی تھیں۔ محسنہ جیلانی اپنے شوہر آصف جیلانی کے ساتھ لندن پہنچی تھیں۔ آصف جیلانی "روزنامہ جنگ" کے نمائندہ بن کر لندن میں آئے تھے۔ کئی سال بعد جب "جنگ" کا لندن ایڈیشن شروع ہوا اور اس کے پہلے ایڈیٹر انعام عزیز نے "جنگ" سے الگ ہو کر لندن میں "روزنامہ ملت" کا اجراء کیا تو آصف جیلانی جنگ کے ایڈیٹر ہو گئے۔ اس کے بعد وہ بی بی سی اردو سروس میں چلے گئے۔

پاکستان اور ہندوستان سے نئے نئے لوگ آ رہے تھے۔ نئے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ مشرق جو ان کے دکھ درد کا ساتھی تھا ان کے لئے ایک مشترک پلیٹ فارم مہیا کرتا تھا۔ اب اس میں مکتوب پاکستان کے ساتھ مکتوب بھارت بھی چھپنے لگا۔ شروع شروع میں یہ سلسلہ صفحات پر چھپتا تھا جو بتدریج تین، چار حتیٰ کہ چالیس صفحوں پر چھپنے لگا۔ برطانیہ میں محمد صابر پہلے جسٹس آف پیس بنے تو ہم نے ان کی تصویر پورے ٹائٹل پیج پر دی۔ وہ لاہور میں ریلوے کے کسی دفتر میں کلرک ہوا کرتے تھے۔ یہاں پہنچنے کے چند ہی سال بعد مانچسٹر میں جسٹس آف پیس بن گئے۔ اسی طرح جب برمنگھم کے ایک سکول میں نجمہ حنیف کو "ٹاپ گرل" ہونے کا اعزاز ملا تو ہم نے اس خبر کو بھی ٹائٹل پیج سٹوری بنایا۔ ایک آدھ سال بعد جالاں میرپور سے آئے ہوئے محمد اسلم چاؤڈا کا ووٹنگ کی کر کے برطانیہ میں دوسرے جسٹس آف پیس بنے تو ہم نے اس خبر کو بھی بڑی اہمیت دی۔ جلد ہی ایشیائیوں کے جسٹس آف پیس بننے اور سکولوں میں ایشیائی بچوں کے مختلف اعزاز حاصل کرنے کا سلسلہ اس طرح جاری ہو گیا کہ ان خبروں میں پہلے کی سی چونکا دینے والی کیفیت نہ رہی۔ اب ہم انھیں "جہاں ہم ہیں" کے مقامی خبروں کے صفحہ پر چھاپنے لگے۔ آہستہ آہستہ ہمیں مقامی خبروں کے صفحات میں اضافہ کرنا پڑا۔

اس زمانے کی مشرق کی ایک ٹائٹل پیج سٹوری سمیع الدین سمیع کے بارے میں تھی۔ یہ صاحب برطانیہ کے پہلے ایشیائی ٹاؤن کلرک بنے تھے (یعنی سارے شہر کے افسر اعلیٰ)۔ سمیع صاحب ۱۹۴۷ء سے پہلے دہلی کی سبزی منڈی کے کسی گھر میں چپڑاسی تھے۔ والد کے انتقال کے بعد چوتھی جماعت سے آگے نہ پڑھ سکے۔ پاکستان بنا تو کراچی آ گئے اور یہاں انھیں مرکزی حکومت کے سیکرٹریٹ میں چپڑاسی کی جگہ مل گئی۔ ایک دن ان کے افسر نے دیکھا کہ ان کا چپڑاسی انگریزی کا قاعدہ لئے بیٹھا ہے اور کاپی پر اے بی سی لکھ رہا ہے۔ اس نے حوصلہ افزائی کی اور سمیع صاحب نے مڈل اور اس کے بعد کراچی کے

ایک سکول کی نائٹ شفٹ میں داخلہ لے کر میٹرک پاس کر لیا۔ آہستہ آہستہ بی اے ہو گئے اور ولایت آ گئے۔ یہاں آ کر انہوں نے بیرسٹری کی اور اخبار "مشرق" میں قانونی مسائل پر مضمون لکھنے لگے۔ اسی دوران انہیں والتھم فورڈ کونسل میں اسسٹنٹ سالیسٹر کی ملازمت مل گئی۔ پھر وہ ترقی پا کر وہیں سالیسٹر بن گئے اور جلد ہی پارک شائر کے ایک قصبہ میں اسسٹنٹ ٹاؤن کلرک اور پھر ویلز میں ٹاؤن کلرک بن گئے (آج کل ٹاؤن کلرک کو چیف ایگزیکٹو کہا جاتا ہے)۔ اسی دوران انہوں نے شادی بھی کر لی۔ شادی کے لئے انہوں نے پاکستان کے ایک اخبار میں اشتہار دیا کہ وہ ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں جو غریب ہو اور جسے اعلیٰ تعلیم کا شوق ہو۔ چنانچہ انہیں میمونہ مل گئیں جن کے والد پاکستان پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل تھے لیکن رشوت نہیں لیتے تھے۔ اس لئے اپنی بیٹی کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے شوق کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔ سمیع صاحب سے شادی کے بعد میمونہ نے آسٹریا کی کسی یونیورسٹی سے ماسٹر آف میڈیسن کا امتحان پاس کیا۔ مجھے جب لندن میں سمیع صاحب آخری مرتبہ ملے تو بہت خوش تھے اور انہیں وطن عزیز کی یاد ستا رہی تھی۔ وہ بیوی سمیت واپس کراچی جانا چاہتے تھے۔ نہ جانے اس کے بعد ان کا کیا انجام ہوا۔ کراچی کے ہنگامہ پرور اور طوفان آفریں شہر میں ان پر کیا بیتی اور آج کل وہ کہاں اور کس عالم میں ہیں؟

۱۹۶۵ء میں پاکستان اور ہندوستان کی جنگ چھڑی تو خواجہ عبدالرحیم اور جسٹس سردار محمد اقبال اتفاق سے لندن میں تھے۔ خواجہ عبدالرحیم امرتسر کے کشمیری تھے اور ۴۸-۱۹۴۷ء کے زمانے میں راولپنڈی میں کمشنر تھے۔ آزاد کشمیر کے ان اولین سالوں میں ان کا آزادی کشمیر کی تحریک سے بڑا قریبی تعلق رہا تھا۔ جسٹس سردار اقبال کا تعلق پونچھ سے تھا اور اس وجہ سے ہر وہ چیز جس کا تعلق بالواسطہ یا براہ راست کشمیر سے ہو انہیں بڑی پیاری تھی۔ دونوں مشرق کے دفتر اکثر آتے رہتے تھے۔ جنگ شروع ہوئی تو یہ ہر صبح مشرق کے دفتر میں آ جاتے اور مشرق کے قارئین سے نمٹتے رہتے جو جنگ کی تازہ ترین صورت حال جاننے کے لئے برطانیہ کے طول و عرض سے ٹیلیفون کرتے۔ بعض صورتوں میں مشرق کے دفتر بھی آ جاتے۔ جنگ کے زمانے میں مشرق کی کارکردگی کا سہرا بہت حد تک ان دونوں کے سر ہے ورنہ مشرق کا عملہ شاید اس صورت حال سے پوری طرح عہدہ برآ نہ ہو سکتا جو جنگ نے پیدا کر دی تھی اور جس نے سارے برطانیہ کے پاکستانیوں اور آزاد کشمیریوں کو کچھ اس طرح متحرک کر دیا تھا جیسے خود جنگ لڑ رہے ہوں جیسے اس کا ایک محاذ مشرق کا دفتر بھی ہو۔ جنگ کے ختم ہوتے ہوتے قارئین کے ساتھ ہمارا کچھ اس طرح کا تعلق قائم ہو گیا تھا کہ ہمیں اپنے صحافتی کردار کے ساتھ سماجی کردار بھی اجاگر کرنا پڑا اور اپنے پڑھنے والوں کی ان کارروائیوں میں بھر پور حصہ لینا پڑا جن کی بنا پر ان کو ایک طرح سے مشرق سے ملی تھی۔ فلسطین اور قبرص کے مسلمانوں کو مشرق کی وساطت سے کافی امداد ملی۔ پھر برمنگھم میں بڑی مسجد کی تعمیر کا منصوبہ شروع ہوا تو ہم نے ساڑھے چار ہزار کے قریب عطیات فراہم کر کے مسجد کی انتظامیہ کو دیئے۔ اس وقت یہ خاصی بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔ مشرق کے ان ابتدائی سالوں ہی میں مختلف شہروں میں دینی تعلیم کا آغاز ہونے لگا جو اس وقت برطانیہ کے مسلمانوں کی زندگی کا معمول بن چکا تھا۔

اس زمانہ میں مشرق کو دو شاعر صداقت حسین سوز اور بیتاب سوری ملے۔ دونوں مختلف اوقات میں مشرق کے لئے قطعہ لکھتے تھے جس میں برطانیہ کی ایشیائی آبادی کے کسی حالیہ واقعہ پر تبصرہ ہوتا تھا۔ ہم اسے انتہائی اہتمام سے چوکھٹے میں شائع کرتے تھے۔ اس طرح کے قطعات کے علاوہ بھی ان دونوں کا کلام مشرق میں چھپتا اور قارئین سے داد پاتا تھا۔ ایک مرتبہ اتفاق سے صداقت حسین سوز کے تخلص پر کاتب نے بے دھیانی میں پیش ڈال دیا اور وہ سُوز پڑھا جانے لگا۔ اس پر سوز صاحب نے ہمیں ٹیلیفون کیا اور اس غلطی کی طرف توجہ دلائی۔ جب ان سے کہا گیا کہ کتابت کی غلطی کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہے تو انہوں نے کہا جناب اگر کاتب صاحب کو غلطی سے پیش ہی ڈالنا تھا تو لگے ہاتھوں ز کا نقطہ بھی اڑا دیتے۔ اس طرح پنجابی میں ہی سہی لفظ با معنی تو ہو جاتا (اس صورت میں ان کا تخلص سُور ہو جاتا۔ سُور پنجابی میں سؤر کو کہتے ہیں) اس پر ہم بہت ہنسے۔ صداقت حسین سوز بعد میں بریڈ فورڈ چلے گئے۔

بیتاب سوری (بعد میں بیرسٹر سوری اب مرحوم بیرسٹر سوری) کا ایک اور واقعہ بھی یاد آ رہا ہے۔ ان کی ایک طویل نظم "لندن کی ایک رات" مشرق میں چھپی تو ہمارے ایک قاری ناراض ہو گئے۔ نظم میں لندن کے کسی کلب کا ذکر تھا اور اس میں ایک رقاصہ کا سراپا بیان کیا گیا تھا۔ ایک شعر میں اسے حور سے تشبیہ دی گئی تھی۔ ہمارے قاری کو اعتراض تھا کہ کسی انگریز رقاصہ کو حور سے تشبیہ دینا کافرانہ اور غیر اسلامی فعل ہے۔ میں نے اس کا ذکر بیتاب سوری سے کیا تو دوسرے دن ہی انہوں نے ایک اور طویل نظم لکھ بھیجی جس میں قاری کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ حضرت آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو گئے ورنہ جس رقاصہ کا میں نے اپنی نظم میں سراپا کھینچا تھا وہ تو "حور جب تھی زیب زرنگ نہ تھی"۔ ایک اور صاحب جن کا ان دنوں مشرق میں کلام چھپتا تھا، استاد جنگی تھے۔ ان کا نام عنایت خان اور تخلص جنگی تھا، جو مولانا ظفر علی خان کے اخبار زمیندار میں لکھنے والے حاجی لق لق کی یاد دلاتا تھا۔ استاد جنگی راولپنڈی کے کسی نواحی گاؤں سے نو عمر آئے تھے۔ کچھ عرصہ تک، اس زمانے کے پاکستان اور ہندوستان سے آئے ہوئے گریجویٹ رہ نوردانِ شوق کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بسوں میں کنڈکٹری کرتے رہے۔ پھر اپنا ماہنامہ آفاق جاری کیا۔ آفاق سمیت لندن منتقل ہوئے اور لندن میں مختصر قیام کے بعد عین جوانی میں اس عالم فانی سے کوچ کیا۔ اگر

زندہ رہتے تو طنز و مزاح کی شاعری میں نام پیدا کرتے۔ ان کی اس زمانے میں ایک نظم بچوں کو اپنے حسبِ حال معلوم ہوئی تھی۔ اس کا ٹیپ کا شعر تھا.....

لندن کی ایک مل میں اٹھاتے ہیں بوریاں
وطن میں جو کماتے ہیں کھاتی ہیں گوریاں

لیکن لندن کی مل میں بوریاں اٹھا کر گزر اوقات کرنے اور گریجویٹ ایشیائیوں کا بسوں میں کنڈکٹری کا زمانہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ نجمہ حنیظ جو اپنے اسکول میں "ٹاپ گرل" تھی کچھ سال بعد بی اے کرنے کے بعد برمنگھم سٹی کونسل میں کونسلر بن گئی۔ عنبر لون (آبائی وطن موضع کل ڈڈیال میرپور) جو برمنگھم میں پیدا ہوئی تھی دیکھتے ہی دیکھتے انگریزی کی افسانہ نگار اور شاعرہ بن گئی اور ابھی وہ اسکول کے آخری سالوں میں تھی کہ اس کی تین کتابیں بھی چھپ گئیں۔ ویسٹ فورڈ کی نسرین عزیز جو میرپور میں میرے گاؤں پنڈھ بگھن سے یہاں پہنچی تھی۔ بریڈفورڈ کے اسکولوں میں پڑھی۔ پھر لیڈز یونیورسٹی سے ایل ایل بی کیا اور مانچسٹر کونسل میں لیگل ایڈوائزر (قانونی مشیر) بنی۔ اس کے شوہر محمد نجابت کے والدین پنڈھ بگھن کے ایک قریبی گاؤں چک دیہاڑ سے نجابت کو لے کر ویسٹ فورڈ پہنچے تھے۔ اب نجابت صاحب لندن یونیورسٹی کے امپیریل کالج کے بی ایس سی (الیکٹرانکس) ہیں۔ ایک فرم کے ریسرچ ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے ہیں اور سال کا کچھ عرصہ امریکہ میں گزارتے ہیں، جہاں ان کی فرم کی ایک برانچ ہے۔ پنڈھ بگھن ہی سے محمد صادق یہاں آئے۔ فیکٹری میں کام کیا۔ پھر گروسری اور حلال گوشت کی دکان کھولی۔ خوب پیسے کمائے میرپور کی چار ماچس فیکٹری میں حصہ دار ہے۔ مشرق کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ پھر ایک دن ختنوں پر انکشاف ہوا کہ ان کا بیٹا اسلام جو اسکول سے آنے کے بعد مرغیاں حلال کرنے میں ان کا ہاتھ بٹاتا تھا، اتنا لائق فائق ہو گیا ہے کہ اب یونیورسٹی میں جا رہا ہے۔ اسلام نے شیفلڈ یونیورسٹی سے ریاضی میں بی ایس سی کیا اور یہاں کی ایک فرم کے پروڈکشن ڈیپارٹمنٹ میں اتنے بڑے مشاہرے پر ملازم ہو گیا کہ اس کے والد کو اپنا گروسری کا کاروبار کم منافع بخش نظر آنے لگا۔ اسی طرح پنڈ بروکے کے محمد سلطان (آبائی وطن پنڈھ بگھن میرپور) یہاں کے اسکولوں میں پڑھے اور ڈاکٹر بن گئے۔ برمنگھم کے تین بھائی جاوید، پرویز اور ابرار خالق (آبائی وطن موضع لدڑ میرپور) بھی ان ڈاکٹروں میں سے ہیں جو یہیں پلے بڑھے اور ڈاکٹر بنے۔ ان کی بہنوں میں سے ایک ڈینٹل سرجن ہیں اور دو نے انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کیا ہے۔ ان میں سے ایک انگریزی میں شاعرہ بھی ہے۔ مقصود الٰہی شیخ، جنہیں برطانیہ پہنچنے کے سولہ سترہ سال بعد بریڈفورڈ سے ہفت روزہ راوی نکالا تھا، اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو گجرات سے لے کر یہاں آئے۔ ان کے ایک بیٹے محمود الٰہی شیخ نے مانچسٹر یونیورسٹی سے ایم۔ ایس۔ سی (کیمسٹری) کیا اور دوسرا مشکور الٰہی شیخ رائل ایئر فورس میں سکواڈرن لیڈر رہا اور ڈاکٹر بنا اور آج کل ڈانکاسٹر میں جی۔ پی ہے۔ اسی طرح مشہور صحافی سلطان محمود ہاشمی اپنے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر برمنگھم پہنچے۔ جوان ہو کر وسیم محمود بی۔ بی۔ سی میں پروڈیوسر بنا اور چھوٹے مظہر محمود نے اپنی عملی زندگی کا آغاز عالمی شہرت یافتہ اخبار "ٹائمز" کا رپورٹر بن کر کیا۔ پاکستان اور آزاد کشمیر سے چھوٹی عمر میں آنے والے یا یہیں پیدا ہونے والے بچوں میں سے اکثر اب یونیورسٹیوں میں جا رہے ہیں اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد مختلف شعبوں میں ایسے عہدوں پر کام کرتے ہیں جو ان کے والدین کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔ یہ پاکستان اور ہندوستان سے آنے والے اُن طالب علموں سے بہت مختلف نظر آتے ہیں جو میں نے ۱۹۵۵ء میں لیڈز یونیورسٹی میں دیکھے تھے۔ اور جنہیں حصولِ علم کے ساتھ ساتھ یہ پریشانی بھی لاحق رہتی تھی کہ انہیں اپنی جوانی کی محرومیوں اور اپنی اس جنسی گھٹن کا بھی مداوا کرنا ہے، جس کا وہ طویل عرصے میں شکار رہے۔ بقول شخصے جوانی کے کچھ بقایا جات بھی وصول کرنے ہیں۔ ن۔ م۔ راشد کے الفاظ میں 'اپنے ابنائے وطن کی بے بسی کا انتقام' بھی لینا ہے۔ اب یہاں کی یونیورسٹیوں میں ہماری نئی پود کے خود اعتمادی سے معمور و مطمئن چہرے ہی نظر آتے ہیں۔ بلکہ لندن یونیورسٹی کے امپیریل کالج کے نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام اور برمنگھم یونیورسٹی کے ڈاکٹر سعید درانی جیسی ممتاز شخصیتیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ڈاکٹر سعید درانی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ دنیا کے ان چند سائنس دانوں میں سے ہیں، جنہیں چاند سے لائی ہوئی مٹی کا تجزیہ کرنے کا کام سپرد کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر درانی شاعر اور ادیب بھی ہیں۔ اُن کا شمار اپنی ایک تصنیف "اقبال یورپ میں" کی وجہ سے اقبالیات کے ماہرین میں بھی ہوتا ہے۔ اب یہاں ایسے پاکستانی، ہندوستانی اور آزاد کشمیری لیکچررز بھی ہیں جو یہیں پلے بڑھے اور یہیں تعلیم پائی۔ ان میں سے ایک کرامت اقبال ہیں جو میرپور کے گاؤں نرمی سے برمنگھم آئے۔ یہاں کے اسکولوں میں پڑھے، برمنگھم یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں ایم اے کیا اور وولور ہیمپٹن کے ایک کالج میں سینئر لیکچرر رہے۔

مشرق کا اجراء ایک چیلنج تھا، کچھ اس طرح کا چیلنج جس کے تجربے سے ناآشنا نئی دنیائیں دریافت کرنے والے بحر نورد گزرتے ہوں گے۔ کام کرنے میں ایک نشہ سا تھا جیسے کوئی بہت بڑی مہم سر کی جا رہی ہو۔ اپنے گھر چھ ساتھیوں کے ساتھ صبح سات بجے سے لے کر رات گئے تک، ہفتہ اور اتوار کی چھٹی کے بغیر کام کرنا تھا لیکن تھکن کا احساس تک نہ تھا۔

ہم سب بہت خوش تھے۔ احسان ملک کتابت کرتے تھے۔ وہ کاپیاں بھی جوڑتے اور کبھی کبھی میری دی ہوئی سرخیوں پر اضافہ بھی کر دیتے۔ اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل ہیمرشولڈ ایک فضائی حادثے میں انتقال کر گئے تو احسان صاحب میرے پاس جھجکتے جھجکتے آئے اور کہنے لگے "اس خبر پر دی ہوئی

سرخی کے ساتھ اگر سرخی کے اوپر دائیں طرف بار یک قلم سے ایک لکیر لگا دوں تو آپ بُرا تو نہیں مانیں گے۔'' میں کبھی بُرا نہیں مانتا تھا۔

ولی صاحب (اصل نام خان ولی سومڑو کیتال سمبر پور) پرنٹنگ مشین چلاتے تھے اور جب تک میلنگ مشین خریدنے کے قابل نہیں ہوئے تو وہ سالانہ خریداروں کے لفافوں پر ٹکٹ بھی لگایا کرتے تھے۔ ایڈیٹری کے علاوہ مجھے بھی بہت سے اور کام کرنے پڑتے تھے جن میں سے ایک لفافوں پر سالانہ خریداروں کا ایڈریس لکھنا ہوتا تھا۔ ولی صاحب اس بات کا بہت خیال رکھتے تھے کہ میں ایڈریس لکھتے وقت کوئی ''گھپلا بازی'' نہ کر جاؤں۔ مثلاً وہ خاص خیال رکھتے تھے کہ برمنگھم کے چوہدری اللہ دتہ کے ایڈریس میں ان کے نام کے ساتھ ''ناظمِ اعلیٰ'' لکھا ہے یا نہیں۔ ناظمِ اعلیٰ کے اضافے سے ایڈریس لمبا ہو جاتا تھا لیکن ولی صاحب کی ''پریشانی خاطر'' ہمیں گوارا تھی۔ لہٰذا ''ناظمِ اعلیٰ مسٹر چوہدری اللہ دتہ'' ہی لکھا جاتا' جو انگریزی میں بہت جگہ گھیرتا تھا۔ ولی صاحب مشرق کے ڈائریکٹر بھی تھے اور حصص کی ادائگی کے وقت سب سے پہلے انہوں نے ادائگی کی تھی۔ اس لئے ہم انہیں بانی ڈائریکٹر کہا کرتے تھے۔ ایک اور صاحب رحمان تھے۔ جو کیمرہ پر ''نیگیٹو'' بناتے تھے۔ پلیٹیں بنانا بھی ان ہی کی ذمہ داری تھی۔ پرنٹنگ مشین پر وہ ولی صاحب کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ایڈیٹوریل پیج (اداریہ صفحہ) کے علاوہ ہم ہر صفحہ بھی دو رنگوں میں چھاپتے تھے۔ ایک دفعہ پرچہ چھپ کر میرے سامنے آیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ صفحے کے عین درمیان کسی جملے میں ''اور'' یا ''بھی'' قسم کا کوئی لفظ سرخ تھا۔ میں نے رحمان صاحب کو بلایا اور استفسار کیا تو بڑے بھولے پن سے کہنے لگے ''آپ ہی کہا کرتے ہیں کہ صفحہ پر دو رنگ ہوں تو خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ لفظ صفحے کے درمیان میں تھا۔ میں نے سوچا سرخ رنگ میں یہ ''بندی'' خوبصورت لگے گی۔ اس لئے ایک اور پلیٹ بنا دی اور اسے سرخ کر دیا۔'' تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ یہ صفحہ دوبارہ چھاپنے کے لئے وقت نہ تھا۔ لہٰذا سوائے اس کے کہ میں رحمان صاحب کے جمالیاتی ذوق کی داد دیتا اور کیا کر سکتا تھا؟

لندن سے ہفت روزہ مشرق کا پہلا شمارہ ۲ اپریل ۱۹۶۱ کو شائع ہوا تھا اور احسان صاحب اسی سال اگست میں میرے ساتھ کام کرنے کے لئے لندن پہنچے تھے۔ اس سے قبل وہ راولپنڈی میں اس زمانہ کے مشہور روزنامہ کوہستان (چیف ایڈیٹر نسیم حجازی) کے کتابت کے شعبہ کے نگران تھے۔ کوہستان اس زمانے میں راولپنڈی' لاہور اور ملتان سے بیک وقت نکلتا تھا۔ اس کے منیجنگ ڈائریکٹر میرے اسکول کے زمانے کے دوست اور کلاس فیلو عنایت اللہ تھے۔ انہیں کے تعاون سے لندن کے مشرق کا اجرا ہوا تھا۔

مشرق کے ادارہ میں میرے سب سے اہم ساتھی احسان صاحب تھے۔ ان میں خوبیاں کچھ اس طرح رچی بسی تھیں کہ ان کی کسی ایک خوبی کا ذکر کرنا ان کی دوسری خوبی سے زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی شخصیت میں کہیں کوئی سلوٹ نہ تھی۔ وہ مجسم خوبی تھے۔ اپنے کام سے ان کی لگن کا یہ عالم تھا کہ انہیں کام کرتے ہوئے دیکھ کر بڑے سے بڑا کام چور بھی کام کرنے ہی میں عافیت پاتا تھا۔

احسان صاحب کے لندن آنے سے قبل میں صفحے تیار کر کے لاہور بھیج دیتا تھا۔ جہاں سے عنایت اللہ مجھے کتابت شدہ مسودہ کے آنے جانے میں دو تین ہفتے اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ عرصہ لگ جاتا تھا۔ اس وجہ سے یہ طریقہ کار تسلی بخش نہ تھا۔ ہم نے پرنٹنگ مشین خرید لی تھی لیکن ابھی تک ہمارے پاس کیمرہ اور پلیٹیں بنانے کے لوازمات نہیں تھے۔ اس لئے مسودہ کی وصولی کے بعد باہر سے پلیٹیں بنوانے میں مزید کئی دن لگ جاتے۔ تب کہیں جا کر وہ وقت آتا کہ ہماری ننھی منی ٹولی رتجگا کرتی اور ولی صاحب اپنے جوہر دکھائیں اور پرچہ چھپائیں۔ پرچہ چھپنے کے بعد ولی صاحب سالانہ خریداروں کے لئے لفافوں میں پرچے بند کرتے اور برطانیہ کے مختلف شہروں میں ایشیائی گروسری کی دکانوں پر بھیجنے کے لئے بنڈل بناتے۔ میں ان پر پتے لکھتا۔ پھر ہم دونوں بڑے بنڈل ریلوے اسٹیشن پر جا کر ریلوے والوں کے حوالے کر آتے۔ اس کے ساتھ ہی دفتر اور ریلوے اسٹیشن کے راستے میں جتنے لیٹر بکس آتے' ہم ان میں چھوٹے بنڈل اور لفافے ڈال دیتے۔ اس وقت ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ اگر ہم چاہیں تو ڈاک خانہ والوں کی وین مقررہ وقت پر آ کر ہماری ساری ڈاک لے جا سکتی ہے۔ اس سہولت کا ہمیں اس وقت علم ہوا جب ایک دن ڈاک خانہ کے ایک صاحب ہمارے پاس یہ شکایت لے کر آئے کہ ہم علاقہ کے بہت سے لیٹر بکس اس طرح بھر دیتے ہیں کہ کسی اور کے لئے خط ڈالنے کی گنجائش نہیں رہتی۔

احسان صاحب آئے تو قصّہ' زمیں برسرِ زمیں' طے ہونے لگا۔ انہوں نے دن رات ایک کر کے زیادہ سے زیادہ صفحات جلدی کتابت کرنے شروع کر دیے اور اشتہارات کی لے آؤٹ میں ایک نیا حسن پیدا کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ''مشرق'' کی اشاعت دن بدن بڑھنے لگی۔ بعض مشتہرین اس لئے اشتہار دینے لگے کہ انہیں 'مشرق' میں چھپوائے اشتہارات کا ڈیزائن بھلا لگتا تھا۔

اشاعت بڑھنے کے ساتھ ساتھ بنڈل بنانے اور لفافوں پر پتے لکھنے کا کام بھی بڑھ گیا۔ لیکن اس سلسلے میں کولیٹنگ مشین خریدنے سے پہلے کیمرہ اور پلیٹیں بنانے کا سامان خریدنا ضروری تھا۔ چنانچہ جب تک ہم نے کولیٹنگ مشین نہ خریدی' الگ الگ صفحات کو ترتیب وار جوڑنا اور ہاتھ سے کولیٹنگ کرنا ایک اچھا خاصا دردسر بنا رہا۔ جب کولیٹنگ کا مرحلہ آتا تو ہم سارا دن اپنا اپنا کام کرنے کے بعد اس کام میں جت جاتے۔ بعض اوقات اس سلسلہ میں پوری رات جاگنا پڑتا۔ اس دوران شامت کا مارا کوئی ملاقاتی آ جاتا' تو ہم اسے بھی گھیر گھار کر اس کام پر لگا لیتے۔

رزاق صاحب برطانیہ میں ۱۹۶۱ء میں احسان صاحب کے آنے کے کچھ عرصہ بعد پہنچے تھے لیکن وہ مشرق میں باقاعدہ ۱۹۶۸ء میں شامل ہوئے اور انہوں نے سرکولیشن اور اشتہارات کی ذمہ داری سنبھال کر میرے بوجھ کو ہلکا کر دیا۔ ۱۹۶۳ء میں افضل حق صاحب بھی ادارت میں میرا ہاتھ بٹانے کے لئے بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر پہنچے۔ ہم نے صفحات میں اضافہ کیا تو شعبۂ کتابت میں عاشق صاحب اور شبیر صاحب کا اضافہ ہوا۔ بعد ازیں اور صفحات بڑھانے پڑے تو ہمیں خلیفہ اسمٰعیل اور رشدی صاحب مل گئے۔ رشدی صاحب کئی ملکوں کی سیر کرتے ہوئے پاکستان سے یہاں پیدل پہنچے تھے۔ ایک زمانے میں ہمیں کچھ عرصے کے لئے محمود قاضی بھی ملے جو لندن میں یونیورسٹی میں پیٹرولیم پر پی۔ایچ۔ڈی کر رہے تھے اور ہمارے ہاں ویک اینڈ پر کتابت کیا کرتے تھے۔ ان کا تعلق لاہور سے تھا۔ حافظِ قرآن تھے اور کتابت کے ماہر بھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی والدہ کی شدید خواہش تھی کہ ان کا بیٹا اور کچھ کرے نہ کرے لیکن اسے ان دو علوم پر پوری دسترس حاصل ہونی چاہئے کیونکہ یہ اسلام کا عزیز ترین ورثہ ہیں۔ پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے بعد وہ کینیڈا چلے گئے۔

جب ہم نے کیمرہ خریدا اور پلیٹیں وغیرہ دفتر میں بنانے لگے تو پرنٹنگ سیکشن میں کام کرنے کے لئے قاضی سعید اور حنیف صاحب کی تقرری ہوئی پھر کولیٹنگ مشین اور پتے لکھنے کی میلنگ مشین آئی۔ ان کے ساتھ ساتھ کمال صاحب اور ایک دوسرے رزاق صاحب بھی آ گئے۔ جب مشرق کی اشاعت اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ ایک پرنٹنگ مشین ناکافی ثابت ہونے لگی تو ہم نے ایک بڑی سلنا پرنٹنگ مشین خریدی۔ کچھ عرصہ اس سیکشن میں برمنگھم کے سلیمان صاحب بھی رہے۔ فیض عالم صاحب بھی آئے اور ہم نے منصور ملک کو بھی بلوا لیا، جو ان دنوں کراچی کے اخبار خواتین میں کام کر رہے تھے۔ افضل حق اللہ کو پیارے ہوئے تو ہمیں نصر اللہ خان مل گئے جو ایک عرصہ تک ہمارے ساتھ رہے اور جنہوں نے "مشرق" میں میرے آخری زمانے میں پاکستان میں بھی ہماری نمائندگی کی۔ مجھے اس محبت اور محنت سے کی کہ میں انہیں اب بھی یاد کرتا ہوں۔ اسی دوران اسلم لون صاحب بھی اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کاروانِ مشرق میں ہمارے ہم سفر بنے۔ رشید بخش صاحب اور ڈی۔ اے کیانی صاحب بھی آئے جو مشرق میں آ کر علی کیانی ہوئے۔ مشرق کے بعد علی کیانی نے "نوا" نکالا۔ سرکار دربار میں دور دور تک ان کی رسائی ہوئی۔ شاعر قیوم جلی بھی ہمارے ساتھی ہے۔ جو آہستہ آہستہ فلمی اشتہار حاصل کرنے کے اسپیشلسٹ بن گئے۔ مشرق کے ادارہ میں وہی ایک شاعر تھے۔ ہم انہیں شاعرِ مشرق کہا کرتے تھے۔ اپنی بیگم ڈاکٹر کشری کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے، میں وزیر صاحب کو بھی لایا۔ جو شروع میں اکاؤنٹس کے انچارج بنے۔ ان سے پہلے دفتر میں ہمارے اکاؤنٹنٹ قدیر صاحب اور ان سے پہلے نسیم مسعود صاحب تھے۔ وزیر صاحب کی وجہ سے ایک اور رزاق صاحب (لیٹن کے عبدالرزاق) اور وجاہت شاہ صاحب کا اضافہ ہوا۔ عبدالغفور بھٹی بھی آئے آج کے مشہور آرٹسٹ اور افسانہ نگار تصدق سہیل بھی کچھ عرصہ مشرق میں ایک کالم "میں نے دیکھا، میں نے پڑھا، میں نے لکھا" کے عنوان سے لکھتے رہے۔ اسی طرح بریڈ فورڈ کی آج کی مشہور شخصیت ایف۔ ایم۔ ڈی۔ فاروقی نے بھی کالم نویسی کا آغاز "مشرق" سے کیا۔ ان کے کالم کا عنوان تھا "یہاں پگڑی اچھلتی ہے......" ہمارے کالم نویسوں میں یحییٰ سید بھی تھے جو اس زمانے میں ڈھاکہ اور کراچی سے بیک وقت نکلنے والے انگریزی اخبار "مارننگ نیوز" کے لندن میں نمائندہ خصوصی تھے۔

مشرق کے ان گیارہ سالوں میں ایک زمانہ ایسا آیا۔ جب ہم نے کچھ انگریز لوگوں کو بھی مشرق کے ادارہ میں شامل کیا۔ ان میں ایک مس ہیلپ تھیں، جنہیں ہمیشہ یہ گلہ رہا کہ ہم انہیں "سیکنڈ کلاس شہری" سمجھتے ہیں اور انہیں "تھینک یو" نہیں کہتے۔ ایک ڈیوڈ ہارڈی تھے انہیں ہم داؤد صاحب کہا کرتے تھے۔ ان کے چہرے پر خوش نما داڑھی تھی اور انہوں نے بڑے نستعلیق انداز میں السلام علیکم کہنا سیکھ لیا تھا۔ دفتر میں بعض ملاقاتی انہیں مسلمان سمجھتے تھے اور خوش ہوتے کہ "گورا مسلمان ہو گیا ہے"۔

مشرق کا ادارہ ایک کنبے کی مانند تھا۔ جس میں ایک عجیب طرح کی ہم آہنگی تھی۔ ہر فرد اپنے کام میں مگن تھا لیکن ایک دوسرے سے جدا بھی نہیں تھا۔ کسی دوئی کا احساس نہ تھا۔ مشرق کی ترقی کا گراف دن بدن اونچا ہو رہا تھا۔ یہ ایشیائی گروسری کی دکانوں پر بکتا تھا۔ دکان پر احسان صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا لگی پوسٹر "یہاں مشرق دستیاب ہے" دکان کی ساکھ بڑھاتا تھا اور آمدنی میں اضافے کی ضمانت بنتا تھا۔ گروسری کی ہر نئی کھلنے والی دوکان کا مالک "مشرق" کا ایجنٹ بننے کا خواہش مند تھا۔ بریڈ فورڈ کے پڑوسی قصبہ ہڈرز فیلڈ میں ایک نئی دوکان کھلی اور ہم نے دکان دار کو مشرق مہیا کرنے سے معذرت کی، تو اس نے یہ طریقہ نکالا کہ جس دن مشرق بریڈ فورڈ پہنچتا وہ سویرے سویرے وہاں پہنچ جاتا اور مختلف دکانوں سے ایک ایک دو دو پرچے خرید لاتا۔ پھر اپنی دوکان پر سستے داموں بیچتا تا کہ اس کے اسٹریٹ کے رہنے والے سستے مشرق خریدنے کے لئے اس کے ہاں آئیں۔ اور پھر اسی کے ہو رہیں۔ گروسری کی دوکان پر مشرق رکھنے کا خیال ہمیں عبدالرشید ڈار صاحب نے سمجھایا تھا۔ پہلے پہل دوکان دار اسے آٹا، دال اور مرچ مصالحوں کے ساتھ رکھتے ہوئے گھبراتے تھے لیکن آہستہ آہستہ ہر قسم کے دکان داروں نے اسے اپنی تجارت کے فروغ کا ذریعہ سمجھا بلکہ مشرق کے بعد برطانیہ میں چھپنے والے ہر اخبار نے اپنا تعارف گروسری کی دوکانوں کے ذریعے ہی کرایا۔

ڈار صاحب کی بریڈ فورڈ میں اردو کتابوں کی دکان اور "مشرق" کی ابتدا قریب قریب ایک ساتھ ہوئی۔ بریڈ فورڈ اور اس کے نواح میں مشرق کو متعارف

کرانے اور اسے دوکان داروں تک پہنچانے کا سہرا انہی صاحب کے سر ہے۔

یہی کام بریڈفورڈ میں سلطان محمود صاحب نے کیا۔ بریڈفورڈ اور اس کے نواح میں مشرق کی اشاعت بڑھانے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا۔ وہ ہمیں "مکتوب بریڈفورڈ" بھی بڑے اہتمام سے بھیجا کرتے تھے جو اب ان کی "نئی کہانیاں" بن کر کتابی صورت میں بھی چھپ گئے ہیں۔

مشرق اپنی مقبولیت کی اُن بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ جن پر کوئی اخبار بھی ناز کرسکتا ہے۔ رات کی آخری ٹیوب میں بیٹھے ہوئے جب میں دفتر سے گھر جاتا تو ٹیوب میں بیٹھے ہوئے مسافر دیکھ کے زندگی اچھی لگتی۔

لیکن جب نئی دنیا دریافت ہوئی۔ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ راستے کے گہرے سمندر ہم نے پار کر لئے۔ گہری گھاٹیاں سر کرلیں اور آسودگی کا دور دورہ شروع ہوگیا تو وہ نشہ جس نے مشرق کے ابتدائی دور میں مجھے مدہوش کر رکھا تھا آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگا۔

اب سفر آسان تھا۔ راستے کی رکاوٹیں دور ہوچکی تھیں اور زندگی میں اس حد تک ہموار ہوچکی تھی کہ اس میں چھوٹے چھوٹے خانوادوں کے ساتھ ساتھ اخبار جنگ جیسا بڑا ادارہ بھی اطمینان سے آباد ہوسکتا تھا۔ جنگ نے لندن میں اپنا انٹرنیشنل ایڈیشن ۱۹۷۱ء میں شروع کیا۔

مشرق میں اشتہارات کی بھرمار تھی۔ زندگی میں آسائشوں کی فراوانی تھی لیکن "میں نامرادوں کی تسلّی کو کیا کروں" کہ مجھے اب کام میں مزہ نہ آتا تھا۔

ہمیں جو اشتہار ملتے تھے۔ ان میں پاکستان کے ایک ادارہ کا ایسا اشتہار بھی تھا جسے مسلسل حاصل کرنے کے لئے مجھے ہر مہینے ایک معقول رقم اس کے سربراہ کو خوجا کرنقد دینی پڑتی تھی۔ یہ صاحب انتہائی شریف آدمی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح کی رقم لینا ان کی مجبوری ہے۔ پاکستان سے یورپ آنے والے افسران سے توقع رکھتے تھے کہ وہ انہیں یہاں کی کسی "نائٹ کلب" کی سیر کرائیں۔ ویسٹ اینڈ میں "مجرے" دکھائیں اور اس طرح کے دوسرے لوازمات سے انہیں محظوظ کرنے کا سامان کریں۔ ظاہر ہے اس طرح کی "مہمان نوازی" کے لئے ان کی تنخواہ متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ وہ مجھ پر بھروسہ کرتے تھے کہ میں اسے کاروبار کا معمول سمجھوں گا۔ "حساب دوستاں در دل" رہے گا۔ اس رقم کی اس طرح ادائیگی کے لئے ہمیں اپنے حساب کتاب میں خاصی گڑبڑ کرنی پڑتی تھی اور اس رقم کو کسی دوسری مد میں ڈالنا پڑتا تھا۔ ہر مہینے جس دن مجھے اس ادائیگی کے سلسلہ میں ان کے پاس جانا ہوتا۔ تو طبیعت سارا دن منغّص رہتی اور میں اپنے آپ کو کوستا رہتا کہ اس طرح کی کاروباری ضروریات کے مطابق اپنے آپ کو کیوں نہیں ڈھال سکتا۔ ورنہ خوامخواہ کیوں اپنی جان کا عذاب بنائے ہوئے ہوں؟؟

ان دنوں جب میں کاروباری ضروریات کے تحت اس طرح کی ذہنی کیفیات سے گذر رہا تھا‘ بی۔ بی۔ سی کے میرے دوست تقی احمد سید نے بھی ذہنی طور پر مجھے ایک جھٹکا دیا۔ وہ مشرق کی ابتداء سے ہمارے لئے ہر ہفتہ "برطانوی اخبارات پر ایک نظر" کے عنوان سے کالم لکھا کرتے تھے۔ ہم انہیں کوئی معاوضہ نہیں دیتے تھے لیکن وہ اپنا کالم ہمیشہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ عین وقت پر پہنچا دیتے تھے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کالم وقت پر پہنچانے کے لئے انہیں بھاگم بھاگ اپنے خرچ پر ٹیکسی میں آنا پڑتا۔

جب ہمارے حالات بہتر ہونے لگے تو میں نے انہیں کالم کے لئے معاوضہ دینا شروع کردیا لیکن اب اکثر ایسا ہونے لگا کہ ان کا کالم وقت پر نہ پہنچتا اور اس وجہ سے کتابت اور پرنٹنگ کے ہمارے نظام کار میں ہلچل مچ جاتی۔ جس سے ہمیں بہت پریشانی ہوتی۔ ہم نے تقی صاحب سے ان کے اس رویے کی شکایت کی تو کہنے لگے "بھائی صاحب جب میں پہلے کام کرتا تھا تو اس میں آپ کی اور مشرق کی مدد کرنے کا جذبہ تھا۔ اب وہ دور ختم ہوگیا ہے آپ مجھے معاوضہ دیتے ہیں۔ میں کام معاوضے کے لئے کرتا ہوں۔ اس لئے مناسبات ہے کہ کام اس طرح کروں گا جس میں مجھے آسانی ہوگی اور جتنی کروں گا"

مجھے تقی احمد سید اکثر یاد آتے۔ مشرق کے ابتدائی دور میں میرے کام کرنے میں تقی صاحب کے سے جذبے کا دخل تھا۔ اس دور میں دل لگتا تھا اب معاوضہ اور کمائی کا دور تھا۔ وفا اور عشق کا زمانہ رخصت ہو رہا تھا۔ غالب کا یہ شعر یاد آنے لگا:

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

مشرق کی مقبولیت کا اب بھی پہلے کا سا عالم تھا۔ ہر تازہ شمارے کے بڑے بڑے پارسل اب بھی بنتے تھے۔ برطانیہ کے مختلف حصوں میں اخبار پہنچانے والی گاڑیاں اب بھی ہر ہفتے آتی تھیں اور اخبار کے لدے پھندے واپس جاتی تھیں۔ لکھنے والے قلم اب بھی لکھ رہے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا تھا جیسے میرے خامہ کی لطافت کہیں کھو گئی ہے۔ اخبار چھاپنے والی مشینوں کی آواز کی موسیقی کا رنگ بدل گیا ہے۔

مشرق کے اجراء کے سات سال بعد ۱۹۶۸ء میں میں نے اس کے اشاعتی ادارہ لاکسلی پبلشرز لمیٹڈ کی مینجنگ ڈائریکٹری سے استعفیٰ دے دیا۔ ڈائریکٹروں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ میں کیوں مستعفی ہو رہا ہوں لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ میرا ارادہ اٹل ہے تو انہوں نے میرے نامزد کئے ہوئے وزیر صاحب کو مینجنگ ڈائریکٹری حیثیت سے قبول کرلیا۔

چار سال بعد میں نے مشرق کی چیف ایڈیٹری بھی چھوڑ دی۔ اس کی وجہ بھی ڈائریکٹروں کی سمجھ میں نہ آئی۔ میں بھی انہیں کچھ نہ سمجھا سکا۔

# مشرقی تہذیب کا امین

انور سدید

محمود ہاشمی کا شمار ایسے ادیبوں میں کرنا چاہیے جنہیں اپنے بچپن میں ہی ادب سے محبت پیدا ہو گئی تھی اور ادب ان کی شخصیت میں شامل ہو گیا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی اے اور علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے (ایل ایل بی) کرنے کے بعد انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز سری نگر (مقبوضہ کشمیر) کے امر سنگھ کالج میں لیکچرار شپ سے کیا۔ اس سے قبل انہوں نے پرنس آف ویلز کالج جموں میں بھی پڑھایا تھا چنانچہ ان کے نام کے ساتھ "پروفیسر" کا سابقہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ حالانکہ انہوں نے ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۳ء کے دوران پاکستان میں مختلف اوقات میں آزاد کشمیر کے چیف پبلسٹی افسر اور حکومت پاکستان کے محکمہ تعلقات عامہ میں انفارمیشن افسر کی خدمات بھی انجام دی تھیں۔ "وہ سکول میں پڑھتے تھے تو انہوں نے اپنے انگریزی کے استاد ممتاز مفتی کو افسانے لکھتے دیکھا اور محسوس کیا کہ ان کی افسانہ نگاری کی وجہ سے سکول میں ان کا بڑا احترام تھا" چنانچہ محمود ہاشمی کو بھی افسانے لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ انہوں نے افسانے کے فن میں اتنی ترقی کر لی کہ ان کے افسانے اس دور کے ایک معروف ماہنامے "پریت لڑی" میں چھپنے لگے جس کے ایڈیٹر اوپندر ناتھ اشک تھے جو خود بھی ایک بڑے افسانہ نگار اور سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور غلام عباس کے معاصر تھے۔ ان کا افسانہ "اور شہنائیاں بجتی رہیں" شاہد احمد دہلوی کے رسالہ "ساقی" دہلی میں شائع ہوا تو اسے سال کے بہترین افسانوں میں شمار کیا گیا۔ میں نے اس دور میں "ساقی" میں ان کے چند افسانے پڑھے تھے اور محسوس کیا تھا کہ ان کے معاصر پریم ناتھ پردیسی، رامانند ساگر، کشمیری لال ذاکر، ٹھاکر پونچھی، جگدیش کنول اور پریم ناتھ در کشمیر میں اور احمد ندیم قاسمی پنجاب میں غربت، ناداری اور سیاسی تشدد کے ردعمل میں کرشن چندر کے ترقی پسند فارمولے کے مطابق افسانے لکھ رہے تھے لیکن محمود ہاشمی نے کشمیر کی دیہات نگاری میں اپنا اسلوب الگ تراشا تھا۔ وہ جذباتی ردعمل ابھارنے کی بجائے کشمیر کی موجود حقیقت کو صداقت پسندی سے پیش کرتے اور قاری کو کسی مخصوص سیاسی نتیجے کی طرف لانے کی کوشش تو ہرگز نہیں کرتے تھے۔ ان کا حقیقی مفہوم افسانے کی سطح کے نیچے موجود ہوتا تھا اور قاری اس کا تاثر خود دریافت کرتا تھا۔ محمود ہاشمی کی اس تکنیک کی مثال پیش کرنا چاہوں تو مجھے عزیز احمد کا ناول "آگ" یاد آتا ہے جو انہوں نے اس زمانے میں لکھا جب محمود ہاشمی افسانہ نگاری ترک کر کے تنقید کے میدان میں ترکتازی کر رہے تھے۔

واضح رہے کہ گزشتہ دنوں مجھے محمود ہاشمی کے چند افسانے دوبارہ پڑھنے کا اتفاق ہوا اور مجھے خوشی ہوئی کہ ان کے بارے میں میرا سابقہ موقف بالکل درست تھا لیکن انہیں افسانہ نگار کی حیثیت میں قبول عام حاصل نہیں ہوا تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک کے "راگ درباری" میں شامل نہیں ہوئے۔ اور اس تحریک کے نقادوں نے انہیں نظر انداز کیا، دوم خود انہوں نے شہرت حاصل کرنے کے تمام ہتھکنڈوں کو مسترد کر دیا اور افسانہ اپنے مشاہدات اور داخل کے تقاضوں کے مطابق لکھا۔ آخری بات یہ کہ وہ چند افسانے لکھنے اور اس فن میں اپنی ادبی شخصیت کا نقش قائم کرنے کے بعد تنقید کے کارزار میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ افسانے کی صنف میں محمد حسن عسکری کی طرح محمود ہاشمی نے بھی کچھ زیادہ فن پارے پیش نہیں کیے لیکن ان کا اس میدان میں قیام طویل ہے اور حد یہ ہے کہ خود انہوں نے بھی اپنی ادبی شخصیت کے اس زاویے کو اہمیت نہیں دی اور افسانوں کا مجموعہ چھپوانے کا تردد نہ کیا۔ تاہم میرا اندازہ یہ ہے کہ افسانہ نگاری کے تخلیقی اسلوب نے ان کی ادبی شخصیت پر مستقل نقوش مرتسم کیے اور اس کے اثرات ان کی ڈرامہ نگاری اور رپورتاژ نویسی میں بلاواسطہ طور پر اور تنقید میں بالواسطہ دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

تنقید محمود ہاشمی کی ادبی شخصیت کا دوسرا زاویہ ہے جس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اپنے افسانوں میں انہوں نے گرد و پیش کے ماحول کو مختلف کرداروں کے وسیلے سے حقیقت کا روپ دیا تھا۔ اس تخلیقی عمل میں انہوں نے معاشرے کا ترجمان اور عکاس بننے کی کامیاب سعی کی لیکن تنقید میں ان کا رویہ محض ادب کے ان تخلیق کاروں کی طرف تھا جن کا ڈنکا اس دور میں زور زور سے بجایا جا رہا تھا اور شہرت عام کے وسیلے سے ان کے لیے بقائے دوام کے اسباب فراہم کیے جا رہے تھے۔ ترقی پسند ادیبوں کا رسالہ "نیا ادب" تھا لیکن "ساقی" دہلی، "ہمایوں" لاہور، "ادب لطیف" لاہور، "ادبی دنیا" لاہور اور "نظام" بمبئی میں بھی ان کے مضامین چھپتے تھے اور ان کے مضامین کی صدائے بازگشت خیبر سے کیماڑی اور راس کماری تک سنی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ ادبی محفلوں سے جو نعرے اور جملے لڑھکائے جاتے وہ بھی چند دنوں میں ہی پورے ملک کے ادبی حلقوں میں پھیل جاتے اور لمبے عرصے تک نہ صرف زبان زد خاص و عام رہتے بلکہ بعد میں ادیبوں کی شخصیات نگاری میں بھی استعمال کیے جاتے۔

محمود ہاشمی کا مندرجہ ذیل اقتباس شاہد ہے کہ آج کے ادبی ماحول کے مقابلے میں ۱۹۴۰ء کی دہائی کے ابتدائی برسوں کا ادبی ماحول بے حد فطری تھا۔ ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب "یہ شاعر و افسانہ نویس" (مطبوعہ فروری

۱۹۴۶ء) کے "پس منظر" میں لکھا ہے:

"اس زمانے میں کتابیں آج کی نسبت کم چھپتی تھیں۔ ادیبوں میں خود چھاپنے کی استطاعت تھی اور نہ حوصلہ۔ شاید وہ خود اعتمادی بھی نہ تھی جو آج کے لکھنے والوں میں ہے۔ پبلشرز گنتی کے تھے اور بڑی سوچ بچار کے بعد کسی کی کتاب چھاپتے تھے۔ آج کی طرح رسالوں کی بھرمار تھی اور نہ لکھنے والے اس کثرت سے تھے۔ لکھنا ایک ایسا بھاری پتھر سمجھا جاتا تھا جسے چومنے والے تو بہت تھے لیکن اٹھانے کی ہمت کوئی کوئی کرتا تھا۔ رسالوں میں قارئین کے خطوط چھپنے کی روایت بھی نہ تھی۔ تنقیدی مضامین کسی ایک زندہ ادیب کے بارے میں کم چھپتے تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ بالکل نہیں چھپتے تھے تو شاید صحیح ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ کوئی اپنے مضمون میں ادب میں نئے رجحانات کی بات کرتا تو مثال کے طور پر کچھ ہم عصر ادیبوں کے نام بھی دے دیتا تھا۔ لکھنے والے کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ کسی معیاری رسالے میں چھپ رہا ہے۔ رسالے کے ایڈیٹر کا چند سطری پوسٹ کارڈ اس کے لیے سند قرار پاتا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد اپنے "ادبی دنیا" میں کسی افسانہ نگار یا مضمون نگار کے بارے میں دو چار جملے لکھ دیتے تو وہ نہال ہو جاتا...."

فروغِ ادب کے حوالے سے آپ اس دور کو جو زرّیں دور قرار دے ڈالیں تو آج کا شہرت پسند ادیب شاید اسے غلط قرار دے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نشر و اشاعت کے بے شمار وسائل دستیاب ہونے کے باوجود ادب کو قبولِ عام اتنا حاصل نہیں جو اس دور میں تھا۔ جب محمود ہاشمی نے افسانے سے روگردانی اختیار کر کے تنقید کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ اور تنقید کو تحفظِ نظر بنانے سے شعوری طور پر گریز کیا تھا۔ مثال کے طور پر ان کا مضمون "جدید اردو شاعری میں پنجاب کا حصہ"۔ شاہد احمد دہلوی کے رسالہ "ساقی" میں شائع ہوا۔ اس وقت نیاز مندانِ لاہور اور دلی والے اہلِ زبان کے درمیان جو "ادبی جنگ" ہوئی تھی وہ ختم ہو چکی تھی لیکن محمود ہاشمی کے اس مضمون نے پنجاب کے نوجوان شاعروں کو چونکا دیا اور اس مضمون کو دلی اور لاہور کی طرف دوستی کا بڑھتا ہوا ہاتھ قرار دیا۔ اہم بات یہ ہے کہ اس وقت فیض احمد فیض کا پہلا مجموعہ "نقشِ فریادی" اور ن م راشد کا پہلا مجموعہ "ماورا" ابھی شائع نہیں ہوئے تھے لیکن محمود ہاشمی نے نئی نظم میں ان کی جدت پسندی کو بازیافت کر لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے میراجی، مختار صدیقی، قیوم نظر، الطاف گوہر، اعجاز بٹالوی، ضیا جالندھری اور ظہیر کاشمیری کے تجدد کا تذکرہ کیا جو سب پنجابی شاعر تھے۔ اسی سلسلے کا دوسرا اہم مضمون "جدید اردو شاعری اور یوپی والے" تھا اور یہ بھی "ساقی" دلی میں شائع ہوا۔ بقول محمود ہاشمی "اس کی پذیرائی بھی پہلے مضمون کی سی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی ہوئی۔" ان دو مضامین میں انھیں برصغیر کی شاعری کے داخل میں دو نظریے کارفرما نظر آئے۔ اوّل: مارکس کا اشتراکی فلسفہ۔ دوم: فرائیڈ کا جنسی نظریہ۔ انھوں نے ان نظریات کا اطلاق پنجاب اور یوپی کے شعرا پر کیا تو یہ حیرت انگیز نتیجہ نکالا کہ:

"ہمارے یہاں کے نوجوان شاعروں میں سے پنجابی فرائیڈ کو گلے لگائے ہوئے ہیں اور یوپی والے کارل مارکس پر جان دیے بیٹھے ہیں۔"

ضرورت اس بات کی تھی کہ ادبی دنیا کے بزرجمہر ان نتائج پر بحث کرتے اور ان کے داخل میں محمود ہاشمی نے جو حقیقت دریافت کی اس کی مزید توضیح کے لیے عملی تنقید کی جاتی۔ لیکن تساہل پسند نقادوں نے اتنی اہم بحث میں حصہ نہیں لیا۔ تاہم مجھے حیرت ہوئی کہ قریباً ۲۰ برس کے بعد برطانیہ کے رسالہ "ادب" میں محترمہ رضیہ شمشیر نے محمود ہاشمی کے حوالے سے اس سوال کو پھر اٹھایا لیکن اب اس کا جواب یوپی اور پنجاب کے نئے تناظر میں تلاش کرنا شاید ممکن ہی نہیں ہے۔ ان کا مقالہ "جدید افسانہ نویسی کا ایک سال" معیاری جائزہ نگاری کا ایک معیاری مقالہ ہے بلکہ ایک سال کے مختصر سے عرصے میں تخلیق ہونے والے افسانوں کے حوالوں سے مصنفین کے ذہنی دھاروں کے سراغ لگانے اور مختلف افسانہ نگاروں میں سوچ کی سمتیں تلاش کرنے کی بھی عمدہ کاوش ہے۔ محمود ہاشمی کی انفرادی خوبی یہ ہے کہ وہ ادب کے بڑے ناموں سے مرعوب نہیں ہوتے اور نئے لکھنے والوں کی خوبیوں کا اعتراف کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ چنانچہ متذکرہ ایک سال کے دوران انھوں نے راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی اور عصمت چغتائی کو جو اس دور کے چند بڑے نام تھے، کچھ اس طرح پیش کیا کہ وہ محمود گزیدہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اس دور کی تنقید میں شاعروں اور افسانہ نگاروں کے فن پر خصوصی مضامین لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ محمود ہاشمی نے حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی جیسے شعرا اور محمد حسن عسکری جیسے افسانہ نگار پر مقالات لکھ کر اپنی تنقید کا منفرد نقش قائم کر دیا۔ محمود ہاشمی کا تنقیدی سرمایہ کچھ زیادہ نہیں۔ ان کی کتاب "یہ شاعر و افسانہ نویس" میں بھی ان کے چند مضامین ہی اشاعت کے لیے دستیاب ہوئے۔ تاہم میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے اپنے اندر کے نقاد کو ہمیشہ زندہ رکھا اور نصف صدی سے زیادہ عرصے کے بعد ایک جرأت مندانہ مضمون "آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر" (کون زندہ رہے گا اور کیسے؟) لکھا تو اس میں ان کے عمر بھر کے ادبی مشاہدات کا جوہر موجود تھا۔ ان کی پیش گوئیاں متذکرہ ذیل اقتباسات سے عیاں ہیں:

☆ "افسانہ کی دنیا میں آج انتظار حسین کا بڑا نام ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان سے وہ سلوک ہو گا جو ہم حسن نظامی اور راشد الخیری کی تحریروں سے کر رہے ہیں۔"

☆ "اگر پطرس بخاری اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی نصابی کتابوں میں شامل نہ ہوں تب بھی ان میں اتنی جان ہے کہ مدت مدید تک پڑھے جائیں گے۔ رشید احمد صدیقی کا معاملہ ذرا مشکوک ہے۔"

☆ "الفاظ کا کھیل کھیلنے والے ہمارے ایک کالم نویس ابراہیم جلیس بھی تھے لیکن مجھے ایسے آثار نظر آتے ہیں کہ جہاں تک مقبولیت کا تعلق ہے بھارت اور پاکستان دونوں جگہ ان سے زیادہ ان کے چھوٹے بھائی مجتبیٰ حسین نمایاں ہوں گے۔"

☆ "انشائیہ نگاروں میں سب سے اہم ڈاکٹر وزیر آغا ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اکیسویں صدی میں انشائیہ نگاری سے زیادہ ان کا تنقیدی شعور انہیں زندہ رکھے گا۔ ان کا نام اکیسویں صدی کے قارئین میں "اردو شاعری کا مزاج" جیسی کتابوں کی وجہ سے مقبول رہے گا۔"

☆ "بیسویں صدی کے نصف آخر میں ناصر کاظمی اور مجروح سلطان پوری کا شمار ہمارے بڑے غزل گویوں میں ہوتا رہا ہے۔ اکیسویں صدی جانے ان کے ساتھ کیا سلوک کرے۔"

☆ "منٹو کے ہر زمانے میں موجود رہنے کے بڑے امکانات ہیں۔ اکیسویں صدی میں بھی تو وہ بابو گوپی ناتھ، جانکی اور موذیل جیسی کردار کہانیوں کی وجہ سے زندہ رہیں گے اور کبھی ان کے "زحمتِ مہر درخشاں" جیسے مضامین کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا جن میں انہوں نے ان مقدموں کے کوائف لکھے ہیں جو ان پر فحش نگاری کے الزام میں لاہور کی عدالتوں میں دائر ہوئے تھے۔ مستقبل کے قاری کو کبھی ان کے "سیاہ حاشیے" پسند آئیں گے کبھی وہ "گنجے فرشتے" اور "سرور جہاں نور جہاں" پڑھ کر محظوظ ہوگا۔"

☆ "مجھے امید ہے کہ لوگ کلیم الدین احمد کا سارا کہا لکھا بھول جائیں گے لیکن ان کا ایک جملہ کہ "غزل ایک نیم وحشی صنفِ سخن ہے" اچھے شعروں کی طرح بیسویں صدی میں بھی دہرایا جائے گا۔"

"سچ لکھنے اور پھر اس کا سامنا کرنے کی روایت ہمارے ہاں معدوم ہوتی جارہی ہے لیکن برطانیہ میں مستقل طور پر آباد ہوجانے کے بعد محمود ہاشمی نے اپنے اس جمہوری حق کو قائم رکھا اور اب ۸۵ برس کی عمر میں بھی اپنے تنقیدی سچ کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ بلاشبہ ان کی ادبی شخصیت کا ایک منفرد زاویہ ہے جو حق گوئی کا دعویٰ کرنے والے اکثر رسیدہ ادیبوں کے ہاں بھی نظر نہیں آتا۔

محمود ہاشمی کی ادبی شخصیت کا ایک اور زاویہ ان کی ڈرامہ نگاری ہے جسے میں ان کے شوق کی تجربہ کاری سمجھتا ہوں اسے ان کی ادبی زندگی کا تیسرا پڑاؤ بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔ محمود ہاشمی نے اس ضمن میں لکھا ہے:

"کشمیر اداس ہے" اور "مشرق" سے پہلے بھی میں نے لکھنے لکھانے کا کچھ کام کیا تھا۔ کالج کے زمانے میں افسانے لکھا کرتا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی گیا تو تنقیدی مضامین لکھے۔ اس کے بعد سری نگر کے امر سنگھ کالج میں لیکچرار بنا تو اسٹیج ڈرامے لکھنے کی صورت پیدا ہوئی جو سب کے سب سوائے "انارکلی کی واپسی" کہ جو "ساقی" کے سالنامہ جنوری ۱۹۴۲ء میں چھپا تھا، سری نگر ہی میں رہ گئے۔ نہ جانے ان کا انجام کیا ہوا؟"

"انارکلی کی واپسی" کا وومن کالج کی لڑکیوں نے کھیلا بھی تھا۔ اسے دوسرے شہروں میں بھی بہت پسند کیا گیا تھا اور شہنشاہ ایران کی آمد پر اسے کالج کراچی میں بھی اسٹیج کیا گیا۔ میں نے اسے "ساقی" کے سالنامے میں پڑھا تھا اور بہت متاثر ہوا تھا۔ یہ ڈرامہ امتیاز علی تاج کے ڈرامہ "انارکلی" سے متاثر ہوکر لکھا گیا لیکن اب اس کا زمانی تناظر تبدیل کر دیا گیا تھا۔ محمود ہاشمی نے اس ڈرامے میں مغلیہ وجاہت و عظمت کو امتیاز علی تاج کے انداز میں دوبارہ زندگی عطا کی لیکن اس کی تخلیق ان کے اپنے تخلیقی ذہن کی اختراع تھی۔ میں نے یہ ڈرامہ نصف صدی کے بعد دوبارہ پڑھا تو یہ محسوس ہوا کہ میں ایک دفعہ پھر مغلیہ دور میں پہنچ گیا ہوں لیکن اب "انارکلی" محض جہانگیر میں دھوکا کھانے کے بعد صرف اپنی بے بسی کی مظہر تھی۔ "کشمیر میں اردو" کے مؤلف نے ان کے ایک اور ڈرامے "آنکھ" کا ذکر بھی کیا ہے جو اسٹیج پر تو مقبول ہوگیا لیکن کسی ادبی پرچے میں شائع نہیں ہوا۔ اس لیے محمود ہاشمی کی ڈرامہ نگاری کی جہت صرف "انارکلی کی واپسی" سے قائم ہے جس کی اشاعت کی تجدید ہو تو یہ شاید قبولِ عام حاصل کر سکے گی۔

محمود ہاشمی کی ادبی شخصیت کے اوّل الذکر تین زاویوں کے علی الرغم ان کی رپورتاژ نگاری ایک ایسا زاویہ ہے جسے سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ ان کی تصنیف "کشمیر اداس ہے" ان معدودے چند خوش قسمت کتابوں میں سے ہے جو شائع ہوتے ہی اپنے تخلیق کار کو حیاتِ جاوداں سے سرفراز کر دیتی ہیں اور پھر مصنف کے ذاتی تشخص کا مستقل حوالہ بن جاتی ہیں۔ میں نے ان کی کتاب "یہ شاعر و افسانہ نویس" کا پیش لفظ لکھا تو گزارش کی کہ "ماضی میں اس کی ایک نمایاں مثال رتن ناتھ سرشار کے "فسانۂ آزاد" سے دی جاسکتی ہے جس کے تذکرے کے بغیر رتن ناتھ سرشار مکمل نہیں ہوتا۔ دوسری مثال "امراؤ جان ادا" کی ہے جس نے مرزا ہادی حسن رسوا کو اتنی شہرت دی کہ ان کی باقی سب تصانیف اس کتاب کے پس منظر میں چلی گئیں۔"

یہ سطور لکھتے ہوئے مجھے اچانک پطرس بخاری یاد آگئے جن کے ادبی اثاثے میں مزاحیہ مضامین کی ایک چھوٹی سی کتاب "پطرس کے مضامین" شامل ہے لیکن ان کی شہرت متعدد کثیر الکتب مزاح نگاروں سے زیادہ ہے۔ پطرس بخاری کی طرح یہ اعزاز محمود ہاشمی کو بھی حاصل ہے کہ وہ ۱۹۵۰ء میں صرف ایک کتاب "کشمیر اداس ہے" لکھ کر شہرت کے ہفت آسمان پر پہنچ گئے اور اسے قبولیت کا پہلا سرٹیفکیٹ "نیا دور" کی مدیر ممتاز شیریں نے دیا۔ انہوں نے لکھا: "کشمیر اداس ہے" کے بارے میں یہ دو جملے لکھتے ہوئے مجھے کوئی جھجک محسوس نہیں ہورہی:

"کشمیر اداس ہے" اردو کا بہترین رپورتاژ ہے

"کشمیر اداس ہے" ایک سچا رپورتاژ ہے

محمد حسن عسکری نے رسالہ "ساقی" کراچی میں اپنے کالم "جھلکیاں" میں اس کا ذکر خاص طور پر کیا اور لکھا:

"اردو کے ادیبوں کو مغربی ادیبوں کے برابر بتانا میری عادت نہیں مگر سچ یہ ہے کہ جنگ کے زمانے میں جس قوم کے رپورتاژ "سٹیو راننگ" میں شائع ہوتے رہے ہیں یہ رپورتاژ ان سے کسی طرح کم نہیں بلکہ (محمود) ہاشمی صاحب نے اسے رپورتاژ کہہ کر خاکساری برتی ہے"

اس کتاب کی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی اس کا مطالعہ ہندو پاک کے ادبی، علمی اور سیاسی حلقوں میں ہونے لگا اور اس کا ایک جعلی ایڈیشن دہلی کے کسی ناشر نے چھاپ دیا۔ حتیٰ کہ اس کی تردید لکھوانے کے لیے "کشمیر اداس ہے" کے ایک حقیقی کردار یوسف کو مائل کرنے کی کوشش بھی کی گئی جو انہوں نے یہ کہہ کر کہ کام غداری کی ایسی کتابوں کی تردید کتاب لکھ کر نہیں ہوا کرتی۔

"کشمیر اداس ہے" کا دوسرا ایڈیشن ۴۳ برس کے بعد ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا لیکن اس تمام عرصے میں یہ کتاب کشمیر کے سیاسی افق اور برصغیر کے ادبی منظر سے کبھی غیر حاضر تصور نہیں کی گئی۔ ممتاز نقاد علی سردار سیعید نے دس برس کے بعد رسالہ "عصرت" میں اس پر تبصرہ کیا تو اعتراف کیا:

"ہندوستان میں کشمیر پر لکھی ہوئی کسی تحریر میں ہندو ادبی وقار سے یہ مکمل صداقت جو محمود ہاشمی کے رپورتاژ میں پائی جاتی ہے.... اگر کسی قوم کو یہ مسئلہ پیش آتا اور ایسی تحریر لکھی جاتی تو صدیوں تک اسے کلاسیک کا درجہ دیا جاتا اور ادیبوں اور نقادوں کی زبان اس کی تعریف سے نہ تھکتی۔"

صدیوں تک کسی کتاب کے زندہ رہنے کا علم تو کسی کو نہیں لیکن میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ "کشمیر اداس ہے" کی قرأت، مطالعہ وسیع طبقے میں اب تک جاری ہے۔ چنانچہ قدرت اللہ شہاب نے لکھا:

"مسئلہ کشمیر کا اگر حل ہو جائے۔ اس کتاب (کشمیر اداس ہے) کی اہمیت اور افادیت دونوں صورتوں میں برقرار رہے گی۔"

دسمبر ۱۹۹۹ء میں ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی کتاب "داستان تاریخ رپورتاژ نگاری" شائع ہوئی تو انہوں نے تسلیم کیا:

"حقیقت یہی ہے کہ اردو میں اب تک بہت سے رپورتاژ لکھے گئے ہیں جن میں کرشن چندر، ابراہیم جلیس، قرۃ العین جیسے بڑے ادیبوں کے رپورتاژ بھی شامل ہیں مگر فن، اسلوب، مواد اور تاثر کے لحاظ سے اس رپورتاژ (کشمیر اداس ہے) کی گرد تک بہت کم رپورتاژ پہنچ سکتے ہیں۔"

"کشمیر اداس ہے" محمود ہاشمی کا پہلا اور آخری رپورتاژ ہے۔ اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۹۱ء) میں محمود ہاشمی نے "کچھ اپنی باتیں" کی ذیل میں لکھا ہے کہ میری گم ہو جانے والے مسودوں میں ایک وادیٔ کشمیر کے بارے میں بھی تھا جو دہلی کے رسالہ "آجکل" کے اس زمانے کے ایڈیٹر یعقوب دوانی کی فرمائش پر لکھ رہا تھا۔ اگر یہ مکمل ہو کر چھپ جاتا تو شاید یہ بھی رپورتاژ ہی کا نام پاتا۔ اس کی صورت رپورتاژ ہی کی سی تھی" لیکن یہ رپورتاژ چونکہ طباعت و اشاعت سے محروم رہا ہے اس لیے اس صنف ادب میں "کشمیر اداس ہے" کو ہی محمود ہاشمی کی ادبی شخصیت کا ایک نقش زریں قرار دیا جائے گا۔

محمود ہاشمی نے اپنی زندگی میں خانہ بدوشی کا عنصر نمایاں دیکھا تو صرف "مشرق" کی ادارت کو ایک ایسا کام شمار کیا جو انہوں نے ٹھیک کر انجام دیا تھا تاہم یہ بات واضح ہے کہ ادبی ادارت کالج کے ایام میں ہی ان کی ادبی شخصیت کا جزو بن گئی تھی۔ انہیں پرنس آف ویلز کالج جموں کے میگزین "توی" کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا تو انہوں نے اسے اپنا ایک اعزاز سمجھا۔ ان سے قبل قدرت اللہ شہاب اور اسحاق قریشی بھی اس کے ایڈیٹر رہ چکے تھے اور "توی" کو سارے شہر میں ادبی مجلہ ہونے کی حیثیت حاصل تھی۔ "توی" کے علاوہ انہوں نے اس کالج میں ایک نیا تجربہ "پرنس آف ویلز کالج ویکلی" کے اجرا سے بھی کیا جس میں اردو اور ہندی میں کالج کی خبریں، خطوط اور مضامین شائع ہوتے تھے اور مقصد اردو اور ہندی کو ایک دوسرے کے قریب لانا تھا۔ ایک روایت کے مطابق محمود ہاشمی نے امر سنگھ کالج کے رسالہ "لالہ رخ" کے ابتدائی دور میں نگران کے فرائض بھی ادا کیے تھے۔ جناب عطاء اللہ کے ایک مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود ہاشمی امن سر حد گئے تو اپنے صحافتی شوق کی تکمیل کے لیے روزنامہ "کوہستان" راولپنڈی میں "ڈائری" کا سلسلہ شروع کر دیا جسے قبول عام بھی حاصل ہو گیا اور اس کی داد نہیں جناب عطاء اللہ نے بھی دی۔ ان کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

"تمہیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ "کوہستان" ان دنوں ساڑھے چھ ہزار چھپ رہا ہے۔ پنجاب اور سرحد کے اخبارات میں سرکولیشن کے اعتبار سے ہماری پوزیشن تیسری ہے۔ لیکن اگر تم باقاعدگی سے ڈائری لکھتے تو شاید یہ دوسری ہو جائے۔ جب "کوہستان" لاہور سے نکلنا شروع ہوگا تو تمہیں ہر حالت میں باقاعدگی سے کچھ نہ کچھ بھیجنا پڑے گا۔ ابھی تک تو ہم نے خود اس طرف توجہ نہیں کی لیکن اس وقت تمہارا اپنا بہت مشکل ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ ابھی سے تیاری شروع کر دو بلکہ ایک آدھ ڈائری بھیج ہی دو تو اچھا ہے ....میں نے ابھی سے لوگوں سے کہنا شروع کر دیا ہے کہ ہاشمی کے لیے ڈائری کی کرسی خالی کر دو۔" (مکتوب جناب عطاء اللہ ۱۱ نومبر ۱۹۶۵ء)

۱۷ اپریل ۱۹۶۱ء کو برطانیہ سے ہفت روزہ "مشرق" کا اجرا ہوا تو یہ

گوروں کے اس ملک میں ان پڑھ سانولے مزدوروں کا پہلا اخبار تھا جنہوں نے اس سے قبل اخبار جیسی شے کا نام بھی نہیں سنا تھا لیکن برطانیہ کے کارخانوں کے لیے یہ طبقہ سستا ایندھن فراہم کر رہا تھا اور دوسری جنگِ عظیم کی زوال آمادہ معیشت کو اپنے خون سے سیراب کر رہا تھا۔ ایڈیٹر "مشرق" کی حیثیت میں محمود ہاشمی نے اس میں وطنِ عزیز کی تازہ بتازہ خبریں، حالات، واقعات، ڈائریاں اور خطوط چھاپ کر اسے وطن سے آیا ہوا ایک ایسا مشترکہ خط بنا دیا جس کا سب تارکینِ وطن انتظار کرتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ "مشرق" کے بے شمار قارئین تو ان پڑھ تھے لیکن وہ اخبار باقاعدگی سے خریدتے تھے اور دوسروں سے پڑھوا کر سنتے تھے۔ "مشرق" نے انہیں یہ احساس بھی دلایا کہ "اس کی موجودگی میں اب وہ "ان پڑھ" اور "بے علم" نہیں بسوں ٹرینوں میں بس میں بیٹھے جب وہ اپنی فیکٹری کو جا رہے ہوتے یا فیکٹری میں چائے یا دوپہر کے کھانے کے دوران جب ان کے انگریز ساتھی اپنا اپنا اخبار سامنے رکھ کر اس سے "فٹ بال پول" کے بارے میں اپنی معلومات میں اضافہ کرتے تو یہ بھی اپنا اخبار "مشرق" اپنی جیب سے نکال کر اس کے مطالعے میں منہمک ہو جاتے" محمود ہاشمی نے لکھا ہے:

"اب ان کے ہاتھ میں "مشرق" دیکھ کر ان کے انگریز ساتھی جو انہیں "پسماندہ" اور ان پڑھ سمجھتے تھے محسوس کرنے لگے کہ یہ سانولی سلونی اور کالی مخلوق بھی ان ہی کی سی انسان ہے۔ یہ بھی اپنی ایک زبان رکھتے ہیں اور یہ زبان اتنی ترقی یافتہ ہے کہ اس میں اخبار تک موجود ہے اور اگر یہ لوگ انگریزی سے نابلد ہیں تو یہ اس کا ہرگز ہرگز جواز نہیں کہ انہیں صرف ایسا جانور سمجھا جائے جسے تھوڑی سی مشق کے بعد کولہو کا بیل بنا کر کسی جسمانی کام پر لگایا جا سکتا ہے۔"

مجموعی طور پر محمود ہاشمی کی ادبی شخصیت کے اس صحافتی گوشے کا یہ خصوصی اعتراف کرنا پڑے گا کہ انہوں نے اپنے ہم وطنوں کو ایک مخصوص مشرقی تشخص عطا کیا اور ان کی عزتِ نفس کو تحفظ فراہم کرنے کے علاوہ ان کے باطن سے لیڈروں کے اوصاف بازیافت کیے جو پہلے "جہالت اور بے علمی کے غلام تھے لیکن اب "اسرارِ شہنشاہی" کھولنے کی استطاعت بھی رکھتے تھے۔ برطانیہ میں اردو صحافت کی دنیا میں "مشرق" پہلا تجربہ تھا جسے بعد میں مقصود الٰہی شیخ نے "راوی" کے وسیلے سے توسیع دی اور اب اس خطے سے اردو کے اتنے اخبارات و رسائل نکلتے ہیں کہ جن کا شمار مشکل ہے۔

محمود ہاشمی نے ۱۲ سال تک "مشرق" میں گیسوئے صحافت سنوارے۔ اس دور میں ہی انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کے ہم وطن اپنی قومی زبان اردو سے ناواقف ہیں اور ان کے بچوں کی برطانیہ میں تربیت غلط خطوط پر ہو رہی ہے۔ اس مرحلہ پر ان کے باطن سے وہ مصلحِ قوم بیدار ہو گیا جو اپنے ہم وطنوں کو جادۂ تعلیم پر ڈالنے اور انہیں اپنی قومی زبان "اردو" کے صحیح خطوط سکھانے کا آرزومند تھا۔ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے "اردو کا قاعدہ ... پہلا قدم" .... "دوسرا قدم" اور "تیسرا قدم" اپنے تخلیقی اسلوب میں تالیف کیا اور نئی طرز ترکیب استعمال کے طور پر "اردو کیسے پڑھائی جائے" پیش کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس "قاعدہ" کی تالیف ان کے سر پر ایسی سوار ہوئی کہ "کشمیر اداس ہے" کے بارے میں کچھ سوچنے اور مزید ایڈیشن چھپوانے کا خیال بھی پس پشت چلا گیا۔ اس "قاعدہ" کے بارے میں محمود ہاشمی نے لکھا ہے:

"کہنے کو تو میں اسے "قاعدہ" کہتا ہوں لیکن یہ محض اردو کا قاعدہ نہیں بلکہ تین حصوں پر مشتمل پڑھائی اور لکھائی کا ایک ایسا کورس ہے جسے نہایت کم عرصہ، سال ڈیڑھ سال میں ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ایک طالب علم اپنی دلچسپی کی ہر کتاب صرف ایک ڈکشنری کی مدد سے پڑھ اور سمجھ سکتا ہے.... مجھے یہ کورس لکھنے میں قریباً پانچ سال لگے اور سچی بات یہ ہے کہ اسے لکھ کر میں کچھ اس طرح کی نشہ کی سی کیفیت سے سرشار تھا جس کا تجربہ اس سے پہلے "مشرق" کے دوران یا "کشمیر اداس ہے" لکھتے وقت ہوا تھا۔"

میرا خیال ہے کہ جس کام کو کرتے وقت اس میں سرشاری کی کیفیت شامل ہو جائے اسے بہر صورت تخلیقی درجہ ملنا چاہیے۔ محمود ہاشمی نے بھی یہ قاعدہ تخلیقی نشے میں لکھا جس کی پذیرائی اہلِ علم کی جانب سے ہوئی لیکن بقول محمود ہاشمی ادیبوں نے اسے منہ نہ لگایا۔ ان کے نزدیک یہ غیر ادبی کاوش تھی۔ میں نے ڈاکٹر وحید قریشی سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے بتایا کہ لندن میں ان کے قیام کے دوران قاعدے کا پہلا ایڈیشن محمود ہاشمی نے انہیں عنایت کیا تھا اور وہ ان کی اس تخلیقی کاوش پر حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ یہ قاعدہ مشرقی بچوں کی نفسیاتی مشکلات اور حروفِ تہجی کی الجھنوں کو سامنے رکھ کر لکھا گیا تھا اور اس میں تعلیم کی جدید ترین ٹیکنیک استعمال کی گئی ہے جسے محمود ہاشمی کی ادبی شخصیت ہی سمجھ سکتی تھی۔

محمود ہاشمی کی ادبی شخصیت کا ایک اور اہم زاویہ ان کی "یادنگاری" ہے جس میں ایک اچھی خودنوشت سوانح عمری کے تمام عناصر موجود ہیں۔ میں نے اس سلسلہ میں ان کے دو مضامین "لیڈز یونیورسٹی کی یادیں" اور "اخبار مشرق کی کہانی" پڑھے ہیں لیکن ان کا سب سے اہم مضمون "چالیس سال بعد.... کچھ اپنی باتیں" ہے جو "کشمیر اداس ہے" کے ساتھ ایک چھوٹی کتاب کے طور پر چھاپا گیا ہے اور یہ کتاب اپنی منفرد حیثیت رکھتی ہے اگرچہ اس کتاب میں بیشتر یادیں "کشمیر اداس ہے" کے حوالے سے ہی پیش کی گئی ہیں لیکن اس میں چالیس برس کی رواں دواں زندگی کے واقعات اور کردار اپنے جلال و جمال سے جلوہ گر ہوتے اور قاری کو مسحور کرتے ہیں۔ محمود ہاشمی نے عزیز احمد سے ایک ملاقات کا ذکر یوں کیا ہے:

"مشہور ناول نگار اور افسانہ نگار عزیز احمد لندن آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز میں لیکچرار ہو کر آئے تھے۔ ان کا ایک افسانہ "تیری دلبری کا بھرم" بی بی سی سے نشر ہوا تھا۔ ایک مرتبہ ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا:
"کیا آج کل آپ کوئی نیا ناول یا افسانہ لکھ رہے ہیں؟"
وہ جیسے بلبلا اٹھے۔ بولے "بہتا لکھی، اتنا لکھا، اتنا لکھا وہ کہیں ملا کیا؟ جو چوٹی چھوٹ نقاد اٹھتا ہے کہتا ہے مخش نگار ہے کیا مخش نگار کہلانے کے لیے لکھیں؟" وہ پھر سے بیٹھے تھے "اب اردو میں تو ہرگز ہرگز نہیں لکھوں گا۔ یہ بات کیا ہوئی کہ ہم اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ اردو بھی تو ہماری خدمت کرے۔ ہم نے اپنے سب سے بڑے افسانہ نگار پریم چند کو ہندی کی طرف بھگا دیا۔ اردو والے لفظی زبانی جمع خرچ سے اپنے ادیبوں کا دل بہلاتے ہیں۔ اردو کی خدمت کرو۔ بس خدمت کیے جاؤ۔ ہم تو اردو کی خدمت کرتے کرتے تنگ آ گئے۔"
۱۹۵۸ء کی دہائی کے برطانیہ کو یاد کیا تو ان کے سامنے وقت کا "ایکشن ری پلے" شروع ہو گیا (واضح رہے کہ محمود ہاشمی ۱۹۵۲ء میں انگلستان آ گئے اور پھر یہیں آباد ہو گئے تھے)۔
"برطانیہ میں گھومتے پھرتے میں نے دیکھا کہ انگریز نے اپنے ان ادیبوں کو اور شاعروں کو جو یہ دنیا چھوڑ چکے ہیں زندہ رکھنے کا خاص اہتمام کر رکھا ہے اور ہر ایک کا گھر اس کے ذاتی سامان کے ساتھ اس طرح محفوظ کر لیا ہے کہ وہاں جا کر معلوم ہوتا ہے جیسے وقت اور ماحول اب بھی قائم ہے جس میں شاعر نے زندگی بسر کی تھی۔ گھر میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے گھر کا مکین کسی نہ کسی صورت میں آپ کے ساتھ ہے.... اور اب یہاں اپنے دیوان خانے میں آپ سے ملتے ہوئے کہہ رہا ہے:
"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آپ کا سفر کیسا رہا؟ میرا گھر تلاش کرنے میں آپ کو دقت تو نہیں ہوئی۔"
میں دریائے "ایون" کے کنارے سٹریٹ فورڈ گیا۔ جہاں شیکسپیئر سے اس کے گھر میں ملا۔ میں نے اسے دریائے ایون میں غیر قانونی طور سے چوری چوری مچھلی شکار کرتے بھی دیکھا اور پھر لندن میں اسے گلوب تھیٹر میں اپنے لکھے ہوئے ڈراموں میں ایکٹنگ کرتے دیکھنے کے لیے بھی گیا۔ لندن میں جو ہمپسٹڈ شاعر کیٹس کے گھر بھی گیا اور اسے فینی براؤن کو محبت نامے اور اس کی یاد میں سانیٹ لکھتے ہوئے دیکھتا رہا۔"
محمود ہاشمی کی یادنگاری اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ عمر عزیز کے اسی سے زیادہ سال گزار لینے کے باوجود ان کا حافظہ کمزور نہیں پڑا۔ ان کا سینہ یادوں کا خزینہ ہے اور وہ جب چاہتے ہیں اس خزینے کے پٹ کھول کر واقعات کو اپنے فطری "تسلسل" کے ساتھ پیش کرنے لگتے ہیں اور ان کا بیانیہ اتنا سادہ اور معصوم ہے کہ سچائیوں کا مرقع نظر آنے لگتا ہے۔ لیڈز یونیورسٹی کی یادوں میں ایک کیف بار منظر ملاحظہ کیجیے:
"کیمبرج یا آکسفورڈ سے آنے والی ایک اور شخصیت صوفی نذر محمد کی تھی جو ایم اے صوفی کہلاتے تھے۔ ان کے ساتھ ہمیشہ دو لڑکیاں ہوتی تھیں۔ ایک دن نجانے کس ہونق دانشوری کی نے کہا کہ کوئی کو کیا ہوا کہ اس نے کہا:
"مسٹر صوفی۔ یہ آپ کے ساتھ دو لڑکیاں کیوں ہوتی ہیں؟"
اس پر مسٹر صوفی نے بڑے بھولپن سے جواب دیا:
"بھئی اپنے لیے صرف ایک ہے۔ دوسری اپنے دوست حامد انجینئر کے لیے ہے۔ مجھے کراچی ایئر پورٹ پر چھوڑنے آیا تھا آتے وقت میں نے اپنی آٹوگراف بک میں اپنے سب دوستوں سے ان کے آٹوگراف لیے تھے۔ حامد انجینئر نے اپنے دستخط کے ساتھ یہ شعر لکھا تھا

ولایت جا رہے ہو صاحب روئے گو لالا
خیالِ یار حاجت مند رکھنا بلکہ دو لالا

یہ دوسری "خیالِ یار حاجت مند" کے سلسلے میں ہے۔ یہ حامد انجینئر کے لیے ہے۔ کوشش کر رہا ہوں کہ اگلے سال جب وطن واپس جاؤں تو یہ دونوں ساتھ چلنے پر رضامند ہو جائیں۔"
اخبار "مشرق کی کہانی" میں جب میں نے استاد جنگی کا ذکر پڑھا تو مجھے اپنے دوست نسیم شائل پوری بے اختیار یاد آ گئے لیکن پہلے استاد جنگی کی بات:
"ان کا نام عارف خان اور تخلص جنگی تھا جو نصف صدی پہلے لاہور کے اخبار "زمیندار" میں لکھنے والے لعل بی لعل کی یاد دلاتا تھا۔ استاد جنگی راولپنڈی کے کسی نواحی گاؤں سے نوٹنگھم آئے تھے۔ کچھ عرصے تک وہاں اس زمانے کے بھارت اور پاکستان سے آئے ہوئے گریجویٹ اور نوجوانوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بسوں میں کنڈکٹری اور ڈرائیوری کرتے رہے۔ پھر اپنا ماہنامہ "آفاق" جاری کیا۔ نوٹنگھم سے آفاق سمیت لندن منتقل ہو گئے اور لندن میں مختصر قیام کے بعد عین عالمِ جوانی میں اس عالمِ فانی سے کوچ کیا.... ان کی ایک نظم اس زمانے میں بہتوں کو اپنے حسبِ حال معلوم ہوتی تھی۔ اس کا ٹیپ ایک شعر تھا

لندن کی ایک مل میں اٹھاتے ہیں بوریاں
ہفتے میں جو کماتے ہیں کھاتی ہیں گوریاں

میں یہاں یہ بتانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ماہنامہ "آفاق" کے پس پردہ مدیر نسیم شائل پوری تھے جو ڈاکٹر وزیر آغا اور اس ناچیز انور سدید کے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ وہ "آفاق" کے لیے ہم سے مضامین طلب کرتے اور

بڑے خوبصورت انداز میں شائع کرتے تھے۔ شمائل بڑی غزل کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کا مجموعہ کلام "خرامِ ابر" جس کا پیش لفظ میں نے لکھا تھا مکتبۂ فکر و خیال سرگودھا سے شائع ہوا تھا۔ کتاب کی رونمائی کی تقریب کے لیے سرگودھا آنے والے تھے کہ ایک روز شب کے حادثے میں اپنی بیگم کے ساتھ جاں بحق ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی "آفاق" سے ملاقات بھی ختم ہو گئی۔ مجھے ہمیشہ افسوس رہا کہ مرحوم اپنی پہلی اور آخری کتاب بھی دیکھ نہ سکے۔

محمود ہاشمی کی ادبی زندگی مختلف جہات میں پھیلی ہوئی ہے جس کا رجحان میں اوپر پیش کر چکا ہوں۔ ان کا اپنا خیال ہے کہ "میں سوائے مشرق کی ایڈیٹری کے ہمیشہ گردش میں رہا یہاں تک کہ کبھی کوئی کام نہیں ہوا۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں، جو منظر دل کو بھلا لگا وہاں ڈیرہ ڈال دیا۔ قیام کیا اور لگے ہاتھوں کچھ کام ہو بھی گیا.... جب طبیعت بھر گئی تو نئی منزل کی تلاش ہوئی۔ پھر کسی اور منزل کی اور پھر کسی اور...."

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے جس مقام پر جتنا قیام بھی کیا وہاں اپنا ایک نقش چھوڑا اور جہاں گئے وہاں پر حلقے میں مقبول ہوئے۔ "کشمیر اداس ہے" کے تریپن برس کے بعد ان کے مضامین کی کتاب "یہ شاعر و افسانہ" ۲۰۰۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی تو "شب خون" کے مدیر شمس الرحمان فاروقی نے انہیں ایک خط میں لکھا:

"آپ کی کتاب پڑھ کر مجھے بہت مزا آیا۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب کا نظم و مضامین ہیں جو آپ نے سن چالیس کی دہائی میں لکھے تھے۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا اور مجھے نئے ادب کے معاملات اور ترقی پسند ادب کے آغازی عہد کا حال کئی سال بعد کتابیں پڑھ کر معلوم ہوا۔ اس وقت تک فضا تھوڑی بہت بدل چکی تھی اور وہ ریاضت اور ہم جولی کا وہ ماحول نہیں تھا جس کا انعکاس آپ کے مضامین میں نظر آتا ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر وہ تاریخی عہد ذہن میں زندہ ہوتا جاتا ہے۔ مجھے تو ایک عجیب سا احساس ہوا کہ راشد، میرا جی، محمد حسن عسکری وغیرہ جن کا پیکر میرے ذہن میں دیو قامت ادیبوں کا ہے۔ آپ کے مضامین میں نوآمدہ اور تجربہ کوش، تھوڑے بہت لڑکھڑاتے ہوئے لکھنے والوں کی طرح چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔"

(مکتوب شمس الرحمان فاروقی۔ ۲۱ جولائی ۲۰۰۳)

فاروقی صاحب کی تحسین کا یہ بے ساختہ انداز ظاہر کرتا ہے کہ محمود ہاشمی کی تحریریں اب بھی پڑھے جانے کی صلاحیت رکھتی اور قاری کو مسحور کر رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک اردو زبان زندہ ہے محمود ہاشمی پڑھے جاتے رہیں گے اور ان کی ادبی شخصیت متاثر کرتی رہے گی۔ اور اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ "کشمیر اداس ہے" کو کشمیر کونسل نے ۲۰۰۵ء میں اس تقریب میں ایوارڈ دیا جس کی صدارت پاکستان کے وزیر اعظم شوکت عزیز کر رہے تھے۔

## غلام مرتضیٰ راہی (فتح پور، بھارت)

قدم اپنے ملا کر تیز پانی سے
ہماری ناؤ چلتی ہے روانی سے

بھرا ہے اختلافِ رنگ و بو اُن میں
کھلے جو گل تمہاری باغبانی سے

ہوئی ناکام ہر کوشش دبانے کی
اُٹھا وہ شور میری بے زبانی سے

حقیقت کو میں پس منظر میں رکھتا ہوں
کہ دلچسپی ہے دنیا کو کہانی سے

مہک رچ بس گئی ہے میری سانسوں میں
تعلق ہے مرا پھولوں کی رانی سے

سمائی جا رہی ہے کائنات اس میں
ہے ذرّہ تنگ اپنی بے کرانی سے

رہے کانٹے بھی شامل خیر مقدم میں
لیا وہ کام ہم نے گل فشانی سے

تمہاری دُوریاں مٹنے کو ہیں راہی
مصوّر زیبؔ عرفانؔ اور بانیؔ سے

# فکرونظر کے تازہ ابواب... جعفر بلوچ

جناب محمود ہاشمی ۱۹۵۵ء میں لیڈز یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ انہوں نے اسی سال اس یونیورسٹی سے گریجویٹ سرٹیفکیٹ ان ایجوکیشن حاصل کیا تھا۔ پھر وہ ایم اے ایجوکیشن کرنے کے لیے برمنگھم یونیورسٹی میں داخل ہوئے لیکن وہ ایم اے مکمل نہ کر سکے اس کی وجہ یہی تھی کہ روزنامہ "مشرق" (لندن) کے اجرا کی کشش نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ "لیڈز یونیورسٹی کی یادیں" ہاشمی صاحب کے اسی دور سے وابستہ ہیں لیکن یہ تقریباً اٹھائیس برس بعد ۱۹۸۳ء میں قلم بند کی گئیں ان یادداشتوں سے لیڈز یونیورسٹی کا ۱۹۵۵ء کا ماحول بالعموم برعظیم کے اور بالخصوص پاکستان کے طالب علموں کے حوالے سے ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان مختصر یادداشتوں میں یونیورسٹی کے علمی پہلوؤں کو زیادہ اجاگر نہیں کیا گیا البتہ حصول تعلیم کے لیے وہاں جانے والے اہل برعظیم کی معاشرتی، معاشی اور نفسیاتی کیفیات کو بڑے عمدہ اور دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس اجنبی ماحول میں برعظیم کے طالب علموں کا طرز عمل ان کے اپنے اپنے پس منظر اور حالات کے مطابق تھا اور ہر کردار اس مشہور مصرع کے سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے

ع فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

ہاشمی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہر کردار کو بڑی مہارت اور چابک دستی سے صفحۂ قرطاس پر منعکس کیا ہے۔ اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں کیا کیا جتن کیے۔ دیار غیر میں ان غیور محنت کشوں کی ہمت، عزیمت کی شہادتیں ہاشمی صاحب کی اس تحریر میں بہت نمایاں ہیں اور وہ اپنے قاری کو بھی متاثر کرتی ہیں۔

اپنے مضمون 'مشرق کی کہانی' میں جناب محمود ہاشمی نے اپنے اخبار "مشرق" (لندن) کی روداد بیان کی ہے۔ جناب محمود ہاشمی اردو زبان و ادب کے ان محسنین میں سے ہیں جنہوں نے اس زبان اور اس کے ادب کو برعظیم سے باہر کے خطوں اور ملکوں میں متعارف کرایا اور اس طرح اردو کی توسیع اور مقبولیت میں اضافے کا باعث بنے۔ ہاشمی صاحب نے یہ اخبار اپریل ۱۹۶۱ء کو شروع کیا اور نہایت حوصلہ مندی اور استقامت سے بتدریج اس کو روز افزوں ترقی سے ہمکنار کیا اور جب ان لگاتار اور ان تھک کوشش کی بدولت یہ اخبار دنیائے علم و ادب میں اپنی پہچان بنا چکا بلکہ اسلامی دنیا کا آرگن سمجھا جانے لگا تو ہاشمی صاحب ۱۹۷۷ء میں اس اخبار کی ادارت سے مستعفی ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے اپنی جملہ صلاحیتوں اور توانائیوں سے کام لے کر اس اخبار کو کامیاب بنایا۔ وہ یورپ میں بلا واسطہ اپنی قومی زبان کی تکریم افزائی اور اپنی قومی ثقافت کے لیے اعزاز آفرینی کا باعث بنے۔ ان گراں قدر خدمات کے پیش نظر محمود ہاشمی صاحب ملکی اور قومی حوالے سے ہمارے رجال عظیم (ہیروز) میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں۔ برطانیہ سے "مشرق" کا اجرا کئی سطحوں پر خیر و برکت کا باعث بنا۔ اس اخبار نے بیسویں صدی کی ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں ان طبقوں کی ذہنی، معاشرتی، جذباتی اور نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے میں شاندار اور قابل رشک کردار ادا کیا جو پاکستان، بھارت یا بنگال وغیرہ کے علاقوں سے روزگار کی تلاش میں برطانیہ گئے اور وہاں غریب الوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ہاشمی صاحب نے بتایا ہے کہ ان لوگوں کی اکثریت ناخواندہ یا نیم خواندہ تھی اور اس احساس کمتری کو دور کیا اور ان میں خود اعتمادی پیدا کی۔ "مشرق" کی دعوت اور ترغیب پر برطانیہ میں اردو کے متعدد نئے ادیب و شاعر بھی نمودار ہوئے اور کئی پرانے لکھنے والوں کو اپنی مشق و کاوش جاری رکھنے کی سہولتیں بہم پہنچیں۔ اس سے بھی اردو کے آفاق وسیع تر ہوئے۔ مثال کے طور پر صداقت حسین ساز، جناب سوری اور استاد جگی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان حضرات کی نگارشات میں اس قدر دلکشی اور ثقاہت کی تلاش تو مناسب نہیں ہوگی جو اردو کے معتبر اور عظیم معاصر ارباب ادب کے یہاں ملتی ہے لیکن شعر و ادب کی فضا بندی کرنے والوں سے ان حضرات کے حصے کو فراموش بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جناب محمود ہاشمی کے مضامین میں زبان و بیان کے محاسن بھی قاری کو متوجہ کرتے ہیں۔ ان کی عبارت میں بے ساختگی اور روانی ہے اور مجموعی طور پر ان کے انداز بیان کو دلآویز کہا جا سکتا ہے۔ ہاشمی صاحب کا ذوق شعر بھی خاصا تربیت یافتہ معلوم ہوتا ہے خصوصاً غالب سے ان کی دلچسپی کا اظہار ان کی تحریروں سے جابجا ہوتا ہے۔ انہوں نے متعدد دیگر مشہور شاعروں کے شعروں اور مصرعوں کے برمحل استعمال سے بھی موقع بہ موقع اپنی نثر کی دلفریبی میں اضافہ کیا ہے۔

جناب محمود ہاشمی کی تحریروں میں خاکہ نگاری کا جوہر بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ وہ مختصر لفظوں میں کسی کردار کو کاغذ پر منتقل کر دینے کا فن جانتے ہیں۔ زیر نظر مضامین میں متعدد افراد اور کردار ان کے اعجاز قلم سے مجسم اور متحرک صورت میں ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ ان کرداروں میں جناب سعید اختر درانی (مشہور سائنس دان اور 'اقبال یورپ میں' کے مصنف) اور جناب مقصود الٰہی شیخ (معروف ادیب، افسانہ نگار اور ادبی مجلہ 'مخزن' کے مدیر) جیسے صاحبان کمال بھی ہیں اور متعدد کم معروف یا غیر معروف حضرات بھی۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی منزل کو قریب تر کرنے میں ان کے دیگر شخصی محاسن کے علاوہ ان کی خوئے دلنوازی نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ "مشرق کی کہانی" میں اپنے مشرق کے تمام کارکنوں کا ذکر بہت محبت سے کرتے ہیں اور ان کی خوبیوں کو دل کھول کر سراہتے ہیں۔ حضرت علامہ اقبال نے فرمایا تھا

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں ۔ فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق

"مشرق" کو پروان چڑھانے میں جناب محمود ہاشمی کے خلق و احسان کی کارفرمائی نمایاں نظر آتی ہے۔

غرض جناب محمود ہاشمی کے مضامین دلچسپ، افادہ بخش اور لائق مطالعہ ہوتے ہیں۔ ان کے مضامین کے مطالعے سے فکر و نظر کے کئی تازہ ابواب قاری پر وا ہوتے ہیں۔

# اردو کا قاعدہ

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

گذشتہ دو تین عشروں سے پاکستانیوں کی بہت بڑی تعداد مختلف ضرورتوں یا مجبوریوں کے تحت یورپ، امریکہ، کینیڈا اور مشرق وسطیٰ کے ممالک میں منتقل ہوتی رہی ہے۔ ان کے بچے وہیں پلے بڑھے اور تعلیم حاصل کی یا کر رہے ہیں۔ بیشتر صورتوں میں یہ نئی نسل اردو زبان سے نابلد ہے کیونکہ گھروں میں اردو (یا پنجابی) بولی جاتی ہے اس لیے بچے اردو سمجھتے اور بول لیتے ہیں مگر لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ ہمارے ہاں بچوں یا غیر ملکیوں کو اردو سکھانے پڑھانے کے لیے کئی طرح کے قاعدے اور ریڈر ملتے ہیں مگر اردو کی تدریس سے متعلق اساتذہ بخوبی جانتے ہیں کہ مختلف طلبہ کی ذہنی صلاحیت کے مطابق اور مختلف ماحول اور پس منظر رکھنے والے طلبہ کو اردو سکھانے پڑھانے کے تقاضے الگ الگ نوعیت کے ہیں۔ غیر ممالک میں مقیم جن بچوں کا اوپر ذکر ہوا انہیں اردو سکھانے کے تقاضے کیا ہیں؟ اس پر خاطر خواہ غور و فکر نہیں ہوا اور نہ اس پر ضروری تحقیق کی گئی ہے۔ بیرون ملک خصوصاً برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کے ساتھ وہاں کے بھارتی مسلمانوں کو بھی یہی مسئلہ درپیش ہے کہ بچوں کو تدریس اردو کے لیے مناسب نصابی کتابیں اور مواد دستیاب نہیں ہے۔ یہ کام تو مقتدرہ قومی زبان یا انجمن ترقی اردو جیسے اداروں کا تھا مگر اس فرض کا ایک حصہ برطانیہ میں مقیم معروف ادیب محمود ہاشمی نے ادا کیا ہے۔ انہوں نے تین درجوں کے لیے تین تین کتابیں تیار کی ہیں:

۱۔ اردو کا قاعدہ

۲۔ اردو ورک بک (لکھائی سکھانے کے لیے)

۳۔ اردو کیسے پڑھائی جائے؟ (اساتذہ کے لیے رہنمائے تدریس یا گائیڈ بک)

محمود ہاشمی اردو ادب میں اپنے معروف رپورتاژ ''کشمیر اداس ہے'' کے مصنف کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ زیر نظر کاوش کے ذریعے وہ ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ برطانیہ میں ان کا قیام خاصا طویل ہے اور انہوں نے برطانیہ میں مقیم برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل کا خاصا قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ وہ ۱۲ سال تک برطانیہ کے پہلے اردو ہفت روزے ''مشرق'' کے بانی ایڈیٹر بھی رہے، پھر تدریس سے وابستہ ہو گئے اور یوں اردو پڑھنے والے طلبہ کی ضروریات، مسائل اور مشکلات سے براہ راست آگاہی حاصل کی۔ وہ برطانیہ کے بعض سرکاری اور نیم سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے اردو کا نصابی اور تدریسی مواد تیار کرنے میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ اپنے اس طویل تدریسی تجربے اور طلبہ کے مسائل کے براہ راست مشاہدے کی روشنی میں موصوف نے زیر نظر تدریسی قاعدے تیار کیے ہیں۔

تدریس اردو کو محمود ہاشمی نے تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے قاعدے میں طلبہ کو اردو کے صرف ۱۹ حروف تہجی سے متعارف کرایا گیا ہے اور تمام الفاظ اور جملے انہی حروف سے بنائے گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے اور بالکل بجا ہے کہ اگر بچوں کا تمام حروف سے بیک وقت تعارف کرا دیا جائے تو اکثر طلبہ ب، پ، ت اور ج، چ، ح، خ اور د، ذ جیسے ملتے جلتے حرفوں کی بھول بھلیوں میں الجھ جاتے ہیں اور یوں بہت سا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے بچوں میں بددلی بھی پیدا ہوتی ہے۔ حروف کے ساتھ آواز کی شناخت کے لیے بچوں کے روزمرہ کے ماحول سے عام فہم الفاظ چنے گئے ہیں اور ہر حرف کے ساتھ اس حرف سے شروع ہونے والی کسی چیز یا کسی لڑکی لڑکے کا نام اور اس کی تصویر دی گئی ہے۔

محمود ہاشمی اپنے تجربے کی بنا پر کہتے ہیں کہ ان بچوں کا جن کے لیے یہ قاعدہ تیار کیا گیا ہے جو کچھ پڑھایا جاتا ہے عام طور پر اس کا انداز بے مزہ سا ہوتا ہے۔ ان کے لیے اس میں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ اسے پڑھتے ہوئے ان کے ذہن میں کوئی حرکت نہیں ہوتی، سوچ منجمد اور ذہن کا دروازہ بند رہتا ہے اور اردو کی پڑھائی سکول میں پڑھائے جانے والے دوسرے مضامین کے مقابلے میں بے رنگ اور بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ پڑھنے پڑھانے کا سارا عمل اکثر و بیشتر بے جان اور اکتا دینے والا بن جاتا ہے اور بچے محض اپنے والدین کی خوشنودی کی خاطر اور ان کی ناراضی سے بچنے کے لیے اسے برداشت کرتے رہتے ہیں۔ اردو پڑھتے ہوئے انہیں کوئی اپنائیت محسوس نہیں ہوتی۔'' چنانچہ مصنف نے اپنے تین قاعدوں کو مختلف پہلوؤں سے زیادہ سے زیادہ مفید اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے اور بلاشبہ وہ اس میں کامیاب رہے ہیں۔ جملے، عبارتیں اور مثالیں روایتی انداز سے مختلف ہیں۔ ان میں ایک تازگی اور ندرت کا احساس ہوتا ہے۔ عام قاعدوں کے مقابلے یہاں دلچسپی اور شگفتگی کا عنصر زیادہ ہے۔ مثلاً:

کرسی پر ایک گاجر ہے
میز پر ایک جگ اور گلاس ہے
جگ نے گلاس سے کہا ''یار گلاس، کرسی پر کیا ہے؟''
گاجر نے جگ کی بات سن لی۔
گاجر بولی: ''میرا نام گاجر بیگم ہے''
جگ مسکرانے لگا

(ورک بک دوم ص ۱۲)

ایک اور مثال دیکھیے:

ٹام بلی کو کیٹ کہتا ہے
ٹام بلی کو کیٹ اور نانا کو گرینڈ فادر کہتا ہے
اور شیر کو ٹائیگر کہتا ہے
ٹام کی اردو کمزور ہے

(اردو کا قاعدہ، دوم ص ۱۶)

اسباق کو دلچسپ بنانے میں عبارتوں کے مکالماتی اسلوب اور اس میں پوشیدہ ہلکے مزاح کو بھی دخل ہے۔ (دوسری مثال تو ہم پاکستانیوں کے لیے زیادہ برمحل ہے کیونکہ آج کل ہماری اردو شاید "ام" سے بھی زیادہ کمزور ہے۔)

قاعدے کے ہر حصے کے ساتھ "ورک بک" بھی تیار کی گئی ہے۔ طالب علموں کو اردو کی لکھائی سکھانے اور سائنسی انداز میں لکھائی کو آسان اور ایک خوشگوار عمل بنانے کی کوشش ہے۔ "ورک بک" میں طلبہ کا ذخیرہ الفاظ بڑھانے پر بھی توجہ کی گئی۔ اس سلسلے میں مصنف نے "بیت بازی" کے طرز پر "لفظ بازی" کا نیا تصور دیا ہے جس کے ذریعے طلبہ کو نئے الفاظ تلاش کرنے کا شوق دلایا گیا ہے اس شوق کے ذریعے تیسرے مرحلے میں طلبہ سے یہ توقع کی گئی ہے کہ وہ اساتذہ کی مدد سے لائبریری سے کتابیں لے کر اپنی صلاحیت میں اضافہ کریں گے۔ ورک بک میں الفاظ، جملوں اور مشقوں کے ساتھ انگریزی میں بھی ہدایات دی گئی ہیں۔ اسی طرح ہر ورک بک کے آخر میں ذخیرہ الفاظ کی فہرست اور انگریزی میں اس کا تلفظ اور معنی بھی بتائے گئے ہیں۔ لکھائی کے سلسلے میں سیدھی اور ترچھی لکیریں اور نصف دائرے بنانے کی مشق کے ذریعے اردو حروف لکھنے کی مشق کرائی گئی ہے۔ حروف کسی لفظ میں شامل ہوتے وقت کیسے مختصر ہو جاتے ہیں اور کس طرح آپس میں جڑتے ہیں؟ اور اگر نہیں جڑتے تو کیوں؟ حروف میں سے الف، د، ڈ، ذ، ر، ڑ، ز، ژ، و، ی، ے طالب علموں کے لیے بالخصوص الفاظ میں شامل ہوتے وقت طرح طرح کی مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ محمود ہاشمی نے اپنے سالہا سال کے تدریسی تجربے کی روشنی میں ان تمام مشکلات کو آسان بنانے کے گُر بتائے ہیں۔

چونکہ اردو کی لکھائی سکھانے کا عمل اساتذہ کی مدد اور رہنمائی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا اس لیے مصنف نے قاعدے کے ہر حصے کے ساتھ "ورک بک" کے علاوہ "اردو کیسے پڑھائی جائے؟" کے عنوان سے اساتذہ کے لیے ایک گائیڈ بک یا تدریسی رہنما بھی تیار کیا ہے اور قاعدے کے صفحات کے مطابق ترتیب سے لفظوں اور جملوں کی پڑھائی اور لکھائی کے بارے میں تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں اور واضح کیا ہے کہ بعض خاص الفاظ کے انتخاب میں کیا مصلحت یا حکمت ہے۔ مثلاً قاعدہ اول کے ص ۵ تا ۸ ان کے صفحات متعلق میں لکھے لفظ ہیں: انگور، بوٹ، آم، بندر، پتنگ، مگر، سانپ، کوا، پھول، انگوٹھی جیسے بہت سے عام فہم الفاظ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں نون غنہ دو چشمی ھا یا تشدید ہے۔ جس طرح صفحہ ۲۴ تک سوائے ان اٹھارہ حروف کے جو صفحوں پر دیے گئے ہیں، حروف تہجی کے باقی حروف (پ، ت، ٹ، ث، چ، ح، خ، ڈ، ذ، ڑ، ژ، ش، ص، ض، ظ، غ، گ، ی) کسی لفظ میں نظر نہیں آتے اسی طرح یہ اہتمام بھی ضروری سمجھا گیا ہے کہ وہ الفاظ جن میں دو چشمی ھا، نون غنہ، تشدید یا شد، تنوین، مد، واؤ معدولہ اور تنوین ہو بچوں کو اس وقت تک پڑھائے اور لکھائے نہ جائیں جب تک کہ وہ ان کے بارے میں باقاعدہ اسباق پڑھ کر ان کی باریکیوں سے پوری طور پر واقف نہ ہو جائیں۔" (اردو کیسے پڑھائی جائے، اول ص ۳)

علم التعلیم میں نظام تعلیم، مدرسے، استاد اور نصاب کی اہمیت اور درس و تدریس میں ان کے رول (کردار) کے بارے میں بہت بحثیں ملتی ہیں۔ راقم اپنے ۳۰ سالہ تجربے کی بنا پر یہ بتا سکتا ہے کہ تعلیمی اور تدریسی پیش رفت اور معیار کا انحصار بڑی حد تک استاد پر ہوتا ہے اگر استاد لائق، ماہر اور باصلاحیت ہو تو نصاب جیسا بھی ہو وہ اپنی مہارت کے ذریعے طلبہ کو بہت کچھ پڑھانے، سکھانے اور آگے لے جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ محمود ہاشمی نے اساتذہ کی راہنمائی کے لیے یہ مفصل گائیڈ بک تیار کی ہے۔ وہ قاعدے اور ورک بک کی روشنی میں استاد کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اسے کس مرحلے پر کیا کرنا ہے؟ لکھائی میں بچوں کو کیا مشکلات پیش آتی ہیں؟ کن کن مقامات کا خدشہ ہوتا ہے؟ لکھائی میں بچوں کی دلچسپی کیسے پیدا کی جائے؟ بچوں کا تجسس ابھارنے کے کیا طریقے ہیں؟ محمود ہاشمی ایک ماہر تعلیم (Educationist) کی طرح طلبہ کی نفسیات کو سمجھتے ہیں۔ ان کی باریک بین نگاہیں ان مشکلات کی طرف بھی جاتی ہیں جن سے بیشتر اساتذہ بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ سادہ مگر دلچسپ انداز میں ان مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کا طریقہ بھی سمجھاتے ہیں، مثلاً: حرف "ہ" کی "کنگھی بنانے والی" فطرت اور اس کی "رنگا رنگ شخصیت" کا تعارف کراتے ہوئے بتاتے ہیں کہ روپیہ اور صوفہ کے آخر میں "ہ" کی شکل کچھ ایسی ہے کہ اسے "ہ" کی مکمل شکل نہیں کہا جا سکتا البتہ فریدہ میں "ہ" اپنی مکمل شکل میں نظر آتا ہے اور اس کی چلبلی اور شوخ طبیعت نے ہم سے کوئی "بیر پھیری" نہیں کی۔ فریدہ میں "ہ" سے پہلے "د" ہے جو اردو بنانے والے حروف میں سے ہے لہٰذا "د" نے (ا) "ہ" کے ساتھ جڑنے سے انکار کر دیا اور "ہ" کو سر چھپانے کی جگہ نہیں دیا کہ وہ ہم سے کوئی آنکھ مچولی کر سکے (۴) (اردو کیسے پڑھائی جائے، اول ص ۲۵۔۲۶)

اس طرح کی مثالوں اور وضاحتوں میں بچوں کے لیے حرف بھی ایک کردار بن کر سامنے آتا ہے۔ مصنف "آ گے چل کر استاد کو ہدایت کرتے ہیں کہ "ی" کی رنگا رنگ شخصیت پر روشنی ڈالیے۔ اس کے بدلتے ہوئے "پیتروں" کا ذکر کیجیے" اسی طرح اس کے "چال چلن" پر بھی بات کیجیے۔ (ص ۴۸، ۴۹) ایک جگہ وہ حروف کے جادو کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ہر لفظ میں متعدد دوسرے الفاظ کا خزانہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ مثلاً "اکرم" میں کام، کر، کرم کا اور مار پوشیدہ ہیں۔ "سفید" میں دس، دف، فیس، دیس اور سیف چھپے ہوئے ہیں وغیرہ۔ (ص ۲۷، ۷۲) حرف بڑی جادوگری چیز ہیں، اپنی جگہ بدل کر نئے نئے الفاظ کو جنم دیتے ہیں۔ ایسے ایسے کھیل دکھاتے ہیں کہ دنیا بھر کی معلومات ان کے قبضے میں آ جاتی ہیں۔ یہ حروف کا جادو ہے۔ یہی کتابیں بناتے ہیں، کہانیاں، لطیفے اور دنیا بھر کی باتیں بتا کر لوگوں کو عالم فاضل بناتے ہیں۔ یہ بہت بڑی "جادوگر" ہیں۔ "حروف کی کہانیاں" (گائیڈ بک ص ۳) میں تو شرح و تفہیم کا انداز افسانوی و مکالماتی اور خیال انگیز انداز بہت دلچسپ ہے۔

زبان و بیان کے بعض مسائل پر بھی اردو میں اختلاف پائے جاتے ہیں۔ محمود ہاشمی نے ان اختلافات سے بچتے ہوئے اعتدال کا راستہ اختیار کیا ہے جیسے سکول اور اسکول۔ وہ کہتے ہیں ہمارے بزرگوں کا کہنا تھا کہ یہ اسکول ہے کیونکہ صرف اسی طرح ہی اس کی صحیح ادائیگی ممکن ہے لیکن آہستہ آہستہ زبانوں کے میل جول سے ایک دوسرے کے الفاظ اپنانے کا فطری انداز ہی غالب آیا۔ ہم نے اسکول، اسٹیشن، اسٹریٹ وغیرہ کو بھی اپنے لہجے میں ڈھال کر سکول، سٹیشن اور سٹریٹ کہنا شروع کردیا۔ اب ان دونوں کا چلن ہے۔ اسلام آباد میں گلیوں کے ناموں کی تختیوں پر سٹریٹ لکھا ہوا نظر آتا ہے اور کراچی والے انھیں اسٹریٹ کہنے پر مصر ہیں۔ (ص ۳۲) اسی طرح شلجم کو شلغم کہنے میں کوئی حرج نہیں وغیرہ۔

ادیب اور شاعر کا تخلیقی جوہر اس کے معمولی اور چھوٹے کاموں میں بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ قاعدہ نویسی بظاہر ایک معمولی اور آسان کام ہے (لیکن درحقیقت مشکل اور اہم فن ہے) محمود ہاشمی نے اسے بھی ایک خوش گوار تخلیقی تجربہ بنا کر پیش کیا ہے۔ طلبہ قاعدہ پڑھتے ہوئے ورک بک میں عملی کام کرتے ہوئے اور اساتذہ اردو پڑھاتے ہوئے ایک نئے لطف سے آشنا ہوں گے۔ "اور اساتذہ کے لیے اردو پڑھانے کا کاروبار ان کے شاگردوں کے ساتھ ساتھ ان کے اپنے لیے بھی ایک دلچسپ اور مفید مشغلہ بن جائے گا۔" یہی مصنف کی کامیابی کی دلیل ہے۔

پاکستان اور بھارت نیز بعض دوسرے ملکوں (چین، جاپان، ایران، فرانس وغیرہ) میں بالغوں کو اردو سکھائی پڑھائی جاتی ہے۔ محمود ہاشمی کا تیار کردہ یہ سیٹ بالغوں کی اردو تعلیم کے مختلف درجوں کے لیے بھی بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ اسے اپنی ضرورتوں کے تحت معمولی ترمیم و تبدیلیوں کے ساتھ اپنا سکتے ہیں۔

کتابت اور طباعت معیاری ہے۔ البتہ تصاویر اور خاکوں کو مزید بہتر اور خوب صورت بنانے کی ضرورت ہے۔ نیز اگر چھپائی دو تین رنگوں میں ہو سکے تو بعض حروف اور الفاظ زیادہ نمایاں ہو جائیں گے اور مفہوم اور زیادہ واضح ہوگا۔ کہیں کہیں کوئی لفظ یا حرف رہ گیا ہے۔ مثلاً: اردو کیسے پڑھائی جائے؟ اول ص ۱۳، سطر ۲، اور آخری سطر ص ۲۷، سطر ۷۔ بیدار ہونا کا انگریزی مترادف to wake ہونا چاہیے نہ کہ be alert (گائیڈ اول، ص ۱۰۱) "بنیاد" کا تلفظ "Boon-yad" (ص ۱۰۱) کے بجائے Bun-yad بہتر ہے۔ اسی طرح "چلن" کا تلفظ challn (قاعدہ اول، ص ۲۵) بجائے chalan مناسب ہو گا۔ جیب کا تلفظ jayb کیا گیا ہے اور سیب کا seb، ہمارے خیال میں ان دونوں لفظوں کا اردو تلفظ یکساں ہے اس لیے انگریزی تلفظ اور املا بھی یکساں ہونا چاہیے۔ اکا دکا لفظوں کا نیا درست املا اختیار کر لیا جائے۔ مثلاً لیے (نہ کہ دیے) لکھیے (نہ کہ دیے) انھوں، انھیں (نہ کہ انہوں، انہیں)، تمھارا (نہ کہ تمہارا) وغیرہ۔

☆

# رستے پُھل وچھاون

شاعری تے شاعراں دا عاشق، عاشق جعفری اک با کمال شخصیت اے۔ آپوں شاعر ہون دے باوجود وہ جے شاعراں دی عزت کردا اے تے اوہناں نوں سر اکھاں تے بٹھاندا اے۔ برطانیہ جان والا شاید ای کوئی لکھاری ہووے جیہڑا عاشق جعفری ہوراں دی میزبانی توں لطف اندوز نہ ہویا ہووے۔ میں ممنون آں تگڑے بھرا ڈاکٹر نثار ترابی دا جنھاں میتوں ایس ہیرے نال متعارف کرایا۔ ایس درویش صفت شاعر دا پہلا مجموعہ اردو وچ آیا سی تے ہن اوہدا پنجابی/پوٹھواری کلام چھپ رہیا اے۔ ماں بولی وچ چھپن والی ایس کتاب وچ اوہناں دیاں نظماں تے غزلاں پڑھ کے پتہ لگدا اے جے ملکوں باہر ہون دے باوجود اوہنا دا دل اپنی دھرتی دے بُنھے وچ دھڑکدا اے۔ اوہ پیار محبت دی کہانی وی پاندے نیں عشق وارتا وی روندے نیں تے اپنے آل دوالے دیاں حقیقتاں نوں نگاہ وچ رکھدے نیں۔ ایہو جیہا اے جے اوہناں دی شاعری وچ دو معاشریاں تے دو ثقافتاں دا بھرواں نال میل لبھدا اے۔ پر ایس طرح کہ پڑھن والا سواد لین دے نال نال متاثر ہوئیوں بغیر وی نہیں رہ سکدا۔ ایس اک اُٹھیلے بند توں ای اندازہ لایا جا سکدا اے جے عاشق جعفری ہوراں دی سوچ کنی سچی تے کنی ڈونگی اے۔

ڈاڈھے اوکھے سبق سکھائے گوری نے
جاپے جیویں سمس نوائے گوری نے
اتھے کجھ وسدے ہوئے اُزلدے ویکھے
اتھے کجھ لوک وسائے گوری نے

(ڈاکٹر انعام الحق جاوید)
چیئرمین شعبہ پاکستانی زبانیں
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

# مستقبل کا تنقیدی اساسہ.... احمد صغیر صدیقی

..... "اکیسویں صدی کی تیسری دہائی تک پہنچتے پہنچتے کرشن چندر، شفیق الرحمن اور جناب امتیاز علی تاج فسانہ نگاری کے روایتی ستون شمار ہوں گے۔"

..... "منٹو میں بڑا تنوع اور قاری کو اپنی گرفت میں لینے کا وافر سامان موجود ہے۔ عصمت چغتائی کو اکیسویں صدی میں اپنے قدر دانوں میں بے باکی اور مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بغیر لگی لپٹی کے بات کہنے کی وجہ سے یاد کیا جائے گا۔"

..... اس صدی کی پہلی دہائیوں کے قاری قرۃ العین حیدر کی کتابوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھا کریں گے کون جانے اکیسویں صدی میں ممتاز شیریں کی کتابیں ڈھونڈلی جائیں اور انہیں وہ مقام حاصل ہو جائے جس کی وہ مستحق تھیں۔"

..... "امید ہے آنے والے دنوں میں شوکت صدیقی کی حیثیت اب ایک سے زیادہ مستحکم ہوں گی۔"

..... "فسانے کی دنیا میں آج انتظار حسین کا بڑا نام ہے۔ مجھے ڈر ہے وقت گزرنے کے ساتھ ان کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو ہم راشد الخیری اور حسن نظامی کی تحریروں سے کر رہے ہیں۔"

..... "پاکستان کی اردو پر انگریزی اور پنجابی زبانیں چھا جائیں گی۔"

..... "اکیسویں صدی کے قاری کو "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کے معاملات کی جانب دھیان دینے کی فرصت کم ہوگی اور نہ دلچسپی۔ ادب کے سنجیدہ قاری اس زمانے میں بھی ہوں گے مگر ان کی تعداد بتدریج کم ہوتی جائے گی..... اردو پڑھنے والے لکھاری ادب کو محض تفریح کا ذریعہ سمجھیں گے۔"

..... "مشتاق احمد یوسفی آج ان کا بڑا نام ہے لیکن اس زمانے میں جب وہ اور ان کے چاہنے والے اس جہان میں نہ ہوں گے ان کا رتبہ بھی ان کے ساتھ رخصت ہو جائے گا۔"

..... "اکیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو کا نقاد ابن صفی کو وہی درجہ دے گا جو انگریزی میں شرلاک ہومز کے خالق کانن ڈائل کا ہے۔"

..... مستقبل کے قاری تک جب عالی کی شاعری کی منظوم خود نوشت پہنچے گی تو وہ سوچے گا کہ اس کے مصنف کے پاس سچے تجربات کے لئے کتنا وقت تھا..... ان کی خود نوشت سوانح حیات کی صورت میں کوئی خاص مقام پیدا کر سکے گی۔"

..... "کبھی کبھی کوئی ن۔ م۔ راشد کا نام بھی لے لیا کرے گا ورنہ بہت سے شاعروں کی طرح جو اپنے زمانے میں اہم تھے ان کا نام بھی ادب کی تاریخوں میں مقید ہو کر رہ جائے گا۔ جن میں ایک سطر لکھی ہوتی ہیں۔"

..... "اکیسویں صدی میں مشفق خواجہ کا دور مقبول ہوگا۔"

..... "جون ایلیا کا نام اکیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے کسی قاری کی نظر سے گزرا تو وہ بڑی کشمکش میں گرفتار ہو جائے گا..... وہ انہیں کوئی انگریزی شاعرہ بھی سمجھ سکتا ہے جو اردو میں شاعری کرتی تھی۔"

..... "احمد ندیم قاسمی..... اپنے بعد حسب شاعری اور اخبارات میں چھپوائے کالموں کے ڈھیر میں دب جائیں گے۔"

آپ نے پڑھ لیا؟ یہ دولی پیش گوئیاں کسی نجم نے نہیں کی ہیں، یہ جناب محمود ہاشمی نے کی ہیں اپنے اس مضمون کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے:

"سنجیدہ تنقید میں کوئی اہم اضافہ نہیں تاہم اس طرح کی گپ شپ کے دوران میں لکھی گئی تحریر میں ایسے اشارے تلاش کیے جانے چاہئیں جن سے بیسویں صدی کے بعض معروف شاعروں اور افسانہ نویسوں کا مقام و مرتبہ متعین کرنے میں کچھ نہ کچھ آسانی ہو۔"

یہ محمود ہاشمی صاحب وہ ہیں جن کی پہلی ہی کتاب کو کلاسیک کا درجہ حاصل ہو چکا ہے اردو ادب سے گہری دلچسپی رکھنے والوں نے چاہے کتاب نہ پڑھی ہو مگر وہ "کشمیر اداس ہے" نام کی اس کتاب کی گونج سے ضرور واقف ہوں گے۔

محمود ہاشمی صاحب آزادی سے قبل ایک فسانہ نگار و نقاد کی صورت میں نمایاں ہو گئے تھے۔ وہ تنقید کے میدان میں ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک خاصے فعال رہے تھے۔ انور سدید صاحب لکھتے ہیں:

"ان کے تنقیدی مضامین کو پذیرائی کے بجائے عدم پذیرائی کا سامنا کرنا پڑا ہوگا کیونکہ انہوں نے اپنی تنقید کی اساس جس تجزیاتی صداقت پر استوار کی تھی اسے صبر و تحمل سے برداشت کرنا اردو کے کاہل پرست مصنفین کو کسی بھی دور میں گوارا نہیں رہا ہے۔"

ان کے لکھنے کے ڈھنگ سے متعارف ہونے کے لیے ذرا یہ چند سطور دیکھیں جو انہوں نے ۱۹۴۲ء کے دور میں کی جانے والی افسانہ نویسی کے بارے میں لکھی تھیں:

"اسی سال ہمارے چند ممتاز لکھنے والوں کے سانس کی گھٹن کے احساس سے لرزتے معلوم ہونے لگے جیسے زندگی کی ایک رگ ان کے لئے خون بنتی جاری ہو جیسے وہ ایک ہی راہوں پر چل چل کر اکتا گئے ہوں۔"

یہ باتیں انہوں نے کرشن چندر، منٹو، عصمت اور اشک جیسے افسانہ نگاروں کے لیے لکھی تھیں۔

ان کے نزدیک فسانہ تھوڑے وقت میں بڑی بات بتانے اور فسانے کی تکنیک میں ماحول کی جامعیت خوبی سے سمونے کا فن ہے۔ وہ بڑے ناموں سے مرعوب ہونے والے نقاد نہیں۔ اگر فن مصنف کا دفاع نہیں کرتا تو ہاشمی صاحب مصنف کی ناکامی کا برملا اظہار کر دیتے ہیں۔

یہ تمام باتیں میں نے اس لئے لکھ دی ہیں کہ آج کے قاری (جن میں بڑی تعداد ادیبوں اور شاعروں ہی کی ہے) کو ماضی قریب تک کا زمانہ حال کے لکھنے والوں کے ناموں تک کا پتہ نہیں۔ میں ایسے شاعروں کو جانتا ہوں جن کے پاس ماشاء

اللہ بخشی ڈگریاں بھی ہیں مگر ان کی شاعری کی پھپھوندی صاف کرنے سے بھی صاف نہیں ہوتی۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ان کا مطالعۂ ادب NIL ہے۔ وہ تو شمس الرحمٰن فاروقی تک کو نہیں جانتے جو آج کل بہت فعال ہیں محمود ہاشمی کو کیا جانیں گے۔

اس جگہ میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہوں گا کہ اب سے قبل میں نے محمود ہاشمی صاحب کا صرف نام سن رکھا تھا۔ کبھی ان کا کوئی مضمون یا کتاب پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس وقت میرے پاس ان کی کتاب ”یہ شاعر و فسانہ نویس“ رکھی ہوئی ہے جو مجھے جناب احمد زین الدین نے پڑھنے کے لئے دی ہے۔

اردو کے قارئین سے مجھے ہمیشہ یہ شکایتیں رہی ہیں کہ ان میں سے بہت سے نہایت خشک اور غیر دلچسپ لکھتے ہیں۔ ان کے ادبی Jargon کو سمجھنا آسان نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں میں ظفر صدیقی، سلیم احمد اور سراج منیر کا ذکر کرنا چاہوں گا جن کے ہاں بہت readability ہے۔ محمود ہاشمی کی یہ کتاب پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ اگر وہ برطانیہ کے بجائے پاکستان میں ہوتے تو شاید اچھی تنقید نگاری سے ہم محروم نہ رہتے۔ ان کی تحریر واضح اور دلکش ہے۔ اس میں کوئی تقعرالیت ہے نہ جناتی اصطلاحات۔ ان کی کتاب کا ہر صفحہ اس بات کی ضمانت دے رہا ہے کہ اس کے لکھنے والے کے پاس سے پڑھنے والوں کو کس طرح کی تحریر ملی ہے۔

ان کی یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے:

۱) ادبی جھلکیاں ..... اس زمانے کی جو گزر گیا۔

۲) آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر

پہلے حصے میں جو مضامین ہیں ذرا ان کے عنوانات دیکھیں:

۱۔ جدید شاعری میں پنجاب کا حصہ

۲۔ جدید شاعری اور یوپی والے

۳۔ جدید فسانہ نویسی کا ایک اہم سال

۴۔ محمد حسن عسکری کے تجزیے“

۵۔ حفیظ اور اختر شیرانی کی شاعری

اس کے دوسرے حصے سے ہم نے کچھ اقتباسات پہلے ہی پڑھوا دیے ہیں جس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ محمود ہاشمی کے پاس کہنے کے لئے کیا کیا ہے اور انہوں نے اسے کس طرح کہا ہوگا۔ ان کی تحریر کی جاذبیت اور اہمیت کے ایک چھوٹے سے تعارف کے طور پر ان مضامین سے چند سطور دیکھیں جو پہلے حصے میں شامل ہیں:

”اگر ہم نئی شاعری کی شان دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں جنگ عظیم کے بعد کے زمانے پر نظر ڈالنی ہوگی۔ اس سلسلے میں تین دور ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پہلے دور میں جیسے کوئی جھجک کر قدم رکھ رہا ہو۔ شعر کی فطرت بدل چکی ہے مگر قالب وہی پرانا ہے۔ دوسرے دور میں ہیئت زائل ہو چکی ہے۔ خیالات بھی نئے ہیں مگر قالب بھی غزل ہی کا سا ہے۔ تیسرا دور نئے خیالات کی ایک نئی دنیا کی بشارت دے رہا ہے۔“

(”جدید شاعری میں پنجاب کا حصہ“ ۱۹۴۳ء)

”ہمارے یہاں کے نوجوان شاعروں میں سے پنجابی فرائیڈ کو گلے لگائے ہوئے ہیں اور یوپی والے کارل مارکس پر جان دیتے ہیں.....“

(”جدید شاعری اور یوپی والے“ ۱۹۴۲ء)

..... ”حرام جادی“ میں عسکری کا آرٹ اپنے شباب پر ہے۔ شاید یہی کہانی ہے جس نے ہمارے افسانہ نگاروں کو یہ خیال دلایا کہ اگر کرشن چندر اور بیدی جدید ہیں تو عسکری جدید تر ہیں۔“ (”محمد حسن عسکری کے تجزیے“ ۱۹۴۳ء)

اب دوسرے حصے سے چند اور اقتباسات۔

”اپنے زمانے میں احمد ندیم قاسمی نے ادب میں چوری کی۔ ”فنون“ نام کے مجلے میں ان کے ذہین مریدوں کا تمکنت والا منہ بولی بہنوں اور منہ بولی بیٹیوں کی بھی گہما گہمی رہی..... اور انجام؟ مستقبل کے دھندلکوں میں نظر خیرہ ہو جاتی ہے..... اور میں ”فنون“ والے مجلے سے پہلے بھی کچھ ادبی مجلے اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ ان میں تاجور نجیب آبادی کا مجلہ بڑا بارونق تھا..... دنیا نے تاجور کو بڑی عجلت میں بھلا دیا۔“ (”احمد ندیم قاسمی کا معاملہ“)

ماہنامہ ”شاعر“ کا حال ہی میں ۱۲۴۰ صفحات پر مشتمل ”ہم عصر اردو ادب نمبر“ چھپا ہے۔ اس میں علامہ سیماب اکبر آبادی کے بارے میں دو سو کے قریب صفحات ہیں۔ اس کے بارے میں جناب محمود ہاشمی کا تبصرہ دیکھیں:

”اس خاص نمبر میں ایک مضمون ”اقبال اور سیماب۔ ہندوستان کے دو بے مثل نظم نگار“ کے عنوان سے چھپا ہے۔ شاعر کے موجودہ ایڈیٹر نے لکھا ہے: ’اقبال کے ساتھ یا اقبال کے بعد اگر کوئی دوسرا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ سیماب ہے۔‘“

”کیا واقعی؟“

محمود ہاشمی صاحب آگے جا کر اسی باب میں لکھتے ہیں:

”اس طرح کی تحریروں کا نہ جانے عالم بالا میں سیماب مرحوم کا ردعمل کیا ہوا ہوگا؟ اگر وہاں سے یہاں خط و کتابت کی کوئی صورت ہوتی تو ممکن ہے وہ مدیر محترم کو کچھ اس طرح کا خط لکھتے:

اے عزیز من۔ یہ میری دی ہوئی تربیت کا اثر اور تمہاری سعادت مندی ہے کہ تم دنیائے ادب میں میرا نام اونچا کرنے میں مصروف ہو لیکن اب بہت ہو چکا۔ اسے بند کرو۔ یہاں غالب، اقبال، میر وغیرہ سب موجود ہیں..... اقبال خاموش رہتے ہیں۔ حالی بھی فطری شرافت سے مجبور ہو کر خاموش رہتے ہیں لیکن حفیظ اور جوش ٹھٹھول بازی سے باز نہیں آتے۔ میں بہت شرمندہ ہوتا ہوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ قارئین کو اپنے طور پر فیصلہ کرنے دو۔ اب بہت ہو چکا۔“

(”سب سے بڑا انگ“)

بقول ڈاکٹر صفات علوی (جنہوں نے کتاب کا فلیپ لکھا ہے) جناب محمود ہاشمی کی یہ کتاب برصغیر پاک و ہند کے تناظر میں ادب کو جنم دینے والوں اور اس کے نقادوں کے لئے ایک اہم اساس مہیا کرتی ہے۔

# ہم یہاں کیسے پہنچے

محمود ہاشمی

پہلا رابطہ

انگریز ہندوستان میں 1639ء میں پہنچے اور انہوں نے اپنی ایسٹ انڈیا کمپنی کی پہلی تجارتی چوکی مدراس میں قائم کی۔ حالات بڑے ناسازگار تھے اور انہیں مقامیوں (بقول انگریز نیٹوز) سے زیادہ ان پرتگیزی اور فرانسیسی ہم بازوں سے نپٹنا تھا جو شرقی اور مغربی ساحل کے بڑے بڑے شہروں میں پہلے ہی سے اپنی دکانیں لگائے بیٹھے تھے۔ انگریزوں کو سو سال سے زیادہ عرصہ تک جدوجہد کرنا پڑی۔ تب کہیں جا کے 1660ء میں ان کی رسائی بمبئی اور 1696ء میں کلکتہ میں ہوئی۔ آخرکار 1757ء میں پلاسی کے میدان جنگ میں انہوں نے برتری منوائی۔ پھر وسیع و عریض ہندوستان میں اپنا سیاسی اقتدار قائم کرنے کے لیے ایک نئی خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھے اور ہم تک پہنچے جو ہزاروں میل دور شمال میں صوبہ سرحد، پنجاب اور کشمیر میں رہتے تھے۔

اس دوران انگریز نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کا واسطہ ایسے لوگوں سے ہے جن کی تہذیبی اور علمی روایات کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ جنہیں اپنی تاریخ اور تمدن پر ناز ہے اور جنہیں راہ پر لانے کے لئے بڑی سیاست اور بصیرت کی ضرورت ہے۔

یہ بصیرت لارڈ میکالے نے مہیا کی۔ 1814ء میں کمپنی نے "ادب کی تجدید و ترقی، نیز علماء و فضلاء کی حوصلہ افزائی اور ہندوستان کی عملداری میں رہنے والوں کو سائنسی علوم سے متعارف کرنے اور فروغ دینے کے لیے" ایک لاکھ روپے سالانہ کی گرانٹ منظور کی۔ آئندہ بیس سالوں میں آہستہ آہستہ اسے ایک باقاعدہ پالیسی کی صورت دے دی گئی اور لارڈ میکالے نے اس کی وضاحت یوں کی۔ "ہمیں انتہائی کوشش کرنی چاہیے کہ ہم ایک ایسا طبقہ پیدا کریں جو ہمارے اور ان کروڑوں افراد کے درمیان جن پر ہم حکومت کرتے ہیں ترجمان کا کام کر سکے۔ یہ طبقہ ایسے افراد کا ہو جو خون اور رنگ کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں لیکن جن کا ذوق، خیالات، طور و اطوار اور ذہن انگریزی ہو۔ یہ کام اس طبقہ پر چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ ملک کی دیسی زبانوں کو سنوارے، انہیں علوم کی مغربی اصطلاحات سے مالا مال کرے اور بتدریج انہیں ایک ایسا موزوں ذریعہ اظہار بنائے۔ جس کے ذریعے علم ساری آبادی تک پہنچ سکے۔"

اس پالیسی کا بنیادی اصول "ڈاؤن وارڈ فلٹریشن" تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ تعلیم صرف راجوں مہاراجوں، نوابوں اور جاگیرداروں کے بیٹوں بھتیجوں کو دی جائے۔ جب وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو علم کی یہ روشنی ان کے ذریعے نچلے طبقوں میں پھیلے گی اور تعلیم کا یہ سلسلہ "اوپر سے نیچے کی طرف" آخر عوام تک تقطر کر پہنچتا رہے گا۔

یہی وجہ تھی کہ سب سے پہلے جن لوگوں نے انگریز کا قرب حاصل کیا، وہ ریاستوں کے راجے اور بڑی بڑی جاگیروں اور ریاستوں کے مالک تھے۔ لیکن محلات اور حویلیوں میں پل کر جوان ہونے والے ان خانوادوں کو تعلیم سے وہ دلچسپی پیدا نہ ہو سکی جس کی انگریز کو توقع تھی۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جا کر کتابوں کے ساتھ سر مارنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔

"ڈاؤن وارڈ فلٹریشن" والا اصول جس کی رو سے تعلیم کو اس اونچے سماجی طبقہ سے نیچے کے طبقوں تک پہنچنا چاہیے تھا۔ بارآور نہ ہوا۔ کہاں راجوں مہاراجوں اور جاگیرداروں کے گل زادے اور کہاں ملازموں اور مزارعوں کی مٹی اور کیچڑ میں لتھڑی ہوئی مخلوق! علم کی روشنی اوپر سے نیچے کی طرف کیسے آتی؟ راستے میں سو سو دیواریں کھڑی تھیں۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ انگریزی ذوق، انگریزی اطوار اور انگریزی ذہن اپنانے میں ان میں سے بعض تیز نکلے اور نئی تعلیم پانے کے بعد انگریزوں سے بڑھ کر انگریز بن گئے۔ اس طرح ہندوستان میں ایک نیا طبقہ پیدا تو ہوا لیکن اس کی افادیت صرف ان تک ہی محدود رہی۔ حکمران انگریز کا مسئلہ پورے طور پر حل نہ ہو سکا۔

اب یہ فیصلہ کیا گیا کہ اعلیٰ تعلیم ان کو دی جائے گی جو اسے خود حاصل کرنا چاہیں گے۔ اعلیٰ تعلیم سے مراد انگریزی زبان میں انگریزی طرز کی تعلیم تھی۔ اس کے لیے ہائی سکولوں اور یونیورسٹیوں میں انتظام کیا گیا۔ لیکن پرائمری تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔ یہ ضروری اور ابتدائی مرحلہ افراد کے شوق اور ہمت پر چھوڑ دیا گیا۔ گنے چنے افراد کے لیے یہ راہ عیسائی مشنریوں کے قائم کیے ہوئے سکولوں نے ہموار کی۔ ان سکولوں کی فیسیں اور دوسرے اخراجات عام والدین کی برداشت سے باہر تھے۔ چنانچہ یہاں جاگیرداروں زمینداروں اور سرمایہ داروں کے بچے تعلیم اور تعلیم سے زیادہ نئی روش کی تربیت حاصل کرتے اور پھر بیرسٹری کرنے انگلستان آ جاتے۔ جب یہاں سے واپس جاتے تو ان کا خاندانی طنطنہ، حکمران انگریز کی قربت اور ولایت پلٹ ہونے کی مہر ہم وطنوں پر قیامتیں ڈھاتی۔ ان کے بڑے ٹھاٹھ ہوتے۔ انگلستان آنا اس زمانے کے امراء کا فیشن تھا۔ بیرسٹری کے لیے انگلستان آنے والوں کے علاوہ ایک اور گروہ بھی تھا جو "تیج رہی ہے" لندن میں عافیت کی

شہانی'' کا ورد کرتے ہوئے آتا۔ اور ''ڈپٹی کمشنری بھی خدائی سے کم نہیں'' کے خواب پالتا واپس آجاتا۔ یہ وہ آئی سی ایس تھے جنہیں واپس جا کر سرکار انگلشیہ کا ستون بننا تھا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو لارڈ میکالے کے خواب کی اصل تعبیر تھا۔ ہندوستانی خون، ہندوستانی رنگ لیکن افرنگی ذوق، فرنگی اطوار اور فرنگی ذہن۔

لندن جاؤ۔ انگریزی پڑھو

1857ء ہندوستان کی تاریخ کا وہ اہم سال ہے جس کے بعد ایک بہت بڑا ملک سات سمندر پار سے آئے ہوئے کچھ تاجروں کے حوالے کر دینے کے بعد شکست خوردہ ہندوستانی اپنی قسمت پر قناعت کرنے کی عادت ڈال رہے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے آپ کو کمپنی بہادر کہلواتی تھی۔ اور اکبر الٰہ آبادی کے الفاظ میں سر سید کا حکم تھا کہ ''لندن جاؤ۔ انگریزی پڑھو'' اور ''قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع وتراش'' ایک عظیم ملک انگریز کے پاؤں کے نیچے تھا۔ ہر طرف قبرستان کا سا سناٹا و سکون چھایا ہوا تھا۔ اور اس قبرستان میں اکبر جیسے سرپھرے کے اس طرح کے الفاظ بھی طنز بھرے نشتر معلوم ہوتے تھے۔ کبھی قبرستان میں چلتی پھرتی لاشوں کے لیے ایک لحظہ پیہم۔ کبھی ایک خیال انگیز تازیانہ اور ہاے اور جمالی کی بات لیکن پھر بھی اکبر بھی اسی کو سمجھتے تھیں سلامتی سمجھتا تھا کہ:

سدھاریں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

انگلستان میں ''خدا کی شان'' دیکھنے اکبر الٰہ آبادی کے زمانے (1846, 1905) سے پہلے بھی ہندوستان کے لوگ آتے جاتے رہے ہیں۔ مرزا ابو طالب خان 1799-1801ء کے سالوں میں آئے۔ اور واپس جا کر اپنا سفرنامہ ''سیر طالبی فی البلاد فرنجی'' کے نام سے لکھا۔ اور عوام الناس میں ''لندنی'' مشہور ہوئے۔ 1837ء میں حیدرآباد دکن کے رہنے والے یوسف کمبل پوش بھی یہاں آئے۔ اور انگریزی خواتین سے بالخصوص بہت متاثر ہوئے واپس جا کر انہوں نے اپنے سفرنامے میں ان ''پریوں'' کے بارے میں لکھا کہ ''قصوں میں بادشاہ ہند نہ ہوا۔ نہیں تو ہر پری کو ایک ایک ملک بخش دیتا۔'' انگریز مردوں کے بارے میں بھی اپنے تاثرات بیان کیے اور تحریر کیا کہ ''صد آفرین امیران انگلستان پر کہ کوئی تمام دن میں ایک گھڑی اپنی بیماری کرتا ہے ہر کوئی اپنے کام میں مشغول رہتا ہے رات کو عیش و عشرت کرتے ہیں۔ خیال سیر ملکوں کا سر میں رکھتے ہیں......''

اَرن اینڈ لرن

بزرگوں کا کہنا ہے کہ بادشاہوں کی بات باتوں کی بادشاہ ہوتی ہے۔ ہندوستان کا بادشاہ برطانیہ تھا۔ اس لیے اس کی ہر بات سب پر بھاری تھی ہندوستانی سکولوں میں نئی پود سرکار انگلشیہ کی برکات اور انگریزی کتاب ''چیمبرز ہوم انگلش لائف'' پڑھ پڑھ کر جوان ہو رہی تھی۔ اور اس کے مستقبل کی کسوٹی یہ تھی کہ انہوں نے اس مطالعہ سے علم حاصل کیا ہے کس حد تک اپنے دل میں جگہ دی ہے اور اس سے ان کے ذہن کے کتنے گوشے روشن ہوئے ہیں؟..... غلام ہندوستان کی باتوں میں کوئی خاص جان نہ رہی تھی۔

تاہم اس کے عظیم الشان ماضی سے چشم پوشی ممکن نہ تھی۔ علم و فن کے جو خزانے انگریز کے ہاتھ لگے تھے اس کو ان کی اہمیت کا پورا احساس تھا۔ چنانچہ اپنی تحویل میں لینے کے بعد اس نے انہیں لندن منتقل کر دیا۔ انڈیا آفس لائبریری میں کتابیں، مسودات، پرانے سکے اور فنون لطیفہ کے بیش بہا شاہکار جمع کر دیے گئے۔ سلطان ٹیپو کا کتب خانہ بھی یہاں کی ایک لائبریری کا حصہ بن گیا ہندوستان کے بارے میں علمی تحقیق کے لیے ''رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن'' کی بنیاد رکھی گئی اور پھر اس کے قیام کے پانچ سال بعد 1828 میں سوسائٹی نے ایک دارالترجمہ بھی کھول دیا۔ جہاں عربی، فارسی اور سنسکرت کی علمی کتابوں کے انگریزی میں ترجمے ہوتے تھے۔ 1866ء میں لندن میں ایک اور جماعت ''ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن'' کے نام سے قائم کی گئی۔ جس کا بنیادی مقصد ''اہل ہند کی آئینی اور جائز طریقوں سے مدد'' کرنا تھا۔ اس کے قیام کے محرک غالباً 1857ء کے واقعات تھے۔ اور یہ ایک طرح سے خیر سگالی کی جماعت تھی۔ اس کے بانیوں میں مشہور پارسی دادا بھائی نوروجی بھی تھے۔ اس کے کوئی سال بعد 1889ء میں لندن سے کچھ میل دور ووکنگ کے قصبے میں ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر ہوئی۔

جب بیسویں صدی شروع ہوئی تو لندن کے راستے کی اجنبیت ختم ہو چکی تھی اور یہاں خواص کے علاوہ عام والدین کے بیٹے بھی حصول تعلیم کے لیے آنے لگے اب لندن، آکسفورڈ اور کیمبرج کے علاوہ ہندوستانی چہرے دوسری یونیورسٹیوں میں بھی نظر آتے تھے۔ ان کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر حکومت نے 1909ء میں ان کی رہنمائی کے لیے ایک تعلیمی مشیر مقرر کر دیا۔ اتفاق سے یہ تعلیمی مشیر علامہ اقبال کے پرانے استاد گورنمنٹ کالج لاہور والے تھامس آرنلڈ تھے۔

ہندوستان میں ولایتی تعلیم کا رعب قائم تھا لیکن آہستہ آہستہ ولایت پاس نوجوانوں کے لیے ملازمتوں کا میدان محدود ہونے لگا۔ اور ''سرمہ چشم خسروی'' صرف آئی سی ایس ہی رہ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طالب علموں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جسے برطانیہ سے واپس جانے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ بیرسٹری کے علاوہ پی ایچ ڈی میں داخلہ مقبول ہونے لگا۔ بیرسٹری اور

پی ایچ ڈی میں ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں میں وقت کی کوئی قید نہیں۔ دو سال کا کورس بڑی آسانی سے مزید کچھ سالوں تک پھیلایا جا سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ جتنے زیادہ سال لگیں اخراجات اسی حساب سے بڑھیں گے اس کا علاج "ارن اینڈ لرن" (کماؤ اور پڑھو) کا نسخہ تھا۔ ریستورانوں میں پلیٹیں دھو کر تعلیمی اخراجات پورے کرنا سکۂ رائج الوقت تھا۔ کمائی کا ایک اور ذریعہ ٹیوشن تھا۔

انگریز ہندوستان میں برطانوی راج کے مزے لینے کے بعد چھٹی پر گھر آتے تو جانِ محفل بن جاتے تھے۔ ہندوستان۔ بھیدوں بھرا ہندوستان۔ مشرق پراسرار مشرق!!..... ادھر جان پین نے حافظ شیرازی کی غزلوں اور فٹز جیرالڈ نے عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ کر کے قیامت ڈھا رکھی تھی۔ حافظ اور خیام کی رندی و سرمستی اس زمانے کے امیرانِ انگلستان کے مزاج کے عین موافق تھی۔ پھر جب انہیں بتایا جاتا کہ یہ سب معرفت کی رمزیں ہیں تو اسرار اور بھی بڑھ جاتے اسرار کے پردوں میں جھانکنے کی لگن اور بھی تیز ہو جاتی۔ اس زمانے میں ایسے لارڈز اکثر مل جاتے تھے۔ جو شام کے ایک دو گھنٹے شیری اور پورٹ کی شرابات کی چسکیاں لیتے ہوئے حافظ اور خیام کے اشعار کی باریکیاں کسی مشرقی استاد سے سمجھنے کے لیے بے تاب ہوتے۔ ہندوستانی طالب علموں میں سے جس کسی نے بی اے میں فارسی پڑھی تھی اس کی چاندی ہو گئی۔ اور وہ فرصت کے اوقات میں کسی لارڈ کا ٹیوٹر بن بیٹھا۔ جو بچارے سفارش سے عاری تھے ان کے لیے بھی اللہ مسبب الاسباب تھا۔ ملازمت، تجارت یا محض پھرنے پھرانے کے لیے ہندوستان جانے والوں کی کمی نہ تھی۔ ان میں سے کچھ یہیں سے ہندوستانی (اردو) زبان سیکھ کر جانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اخبار میں اشتہار پڑھ کر یا خود اشتہار دے کر اس طرح کی ٹیوشن کا مل جانا کوئی مشکل نہ تھا۔ بعض کی مشکل اس طرح بھی آسان ہوئی۔

ہندوستانی ڈاکٹر اور ہندوستانی ریستوران

1930ء کے آتے آتے صرف لندن میں قریباً اڑھائی ہزار ہندوستانی تھے۔ ان میں طالب علم بھی تھے، کاروباری بھی اور ملازم بھی۔ ملازمت کرنے والوں میں استاد سید علی کا بڑا نام تھا۔ یہ لندن کے چڑیا گھر میں ہاتھیوں کے استاد تھے۔ اور ان کے بارے میں مشہور تھا کہ ہاتھی سدھانے میں ساری دنیا میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔ زیادہ تعداد طالب علموں کی تھی پانچ سو کے قریب بیرسٹری کر رہے تھے۔ کچھ دوسرے علوم کی ڈگریاں لے رہے تھے۔ کچھ ڈگری لینے کے بعد یہیں رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ڈاکٹروں کے لیے یہاں ٹک جانے میں سب سے آسانی تھی۔ ان کی سرجریوں میں مریضوں کی کمی نہ تھی۔ کم از کم چھ دیسی ریستوران بھی کھل گئے تھے۔ جن میں سے پانچ لندن کے دل پکاڈلی کے ارد گرد تھے۔ لیسٹر سکوائر کے قریب جیرارڈ سٹریٹ میں شفیع ریستوران تھا جہاں بقول اس کے منتظمین کے "شہزادے اور شخصیتیں" جاتی تھیں۔ سوہو سٹریٹ (ریجنٹ سٹریٹ کے ساتھ) میں ویراسوامی اور پری سٹریٹ (ٹوٹنہم کورٹ روڈ کے پاس) میں کوہ نور تھا۔ تاج محل چیئرنگ کراس روڈ پر تھا اور آدھی رات تک کھلا رہتا تھا۔ وِل ریستوران ٹوٹنہم کورٹ روڈ پر مشہور فرنیچر سٹور ہیپلو کے سامنے تھا اور اس بات پر فخر کرتا تھا کہ وہاں کے کھانے گرٹن کالج کیمبرج اور سمرویل کالج آکسفورڈ کی لڑکیوں، سیلون کی خواتین اور ہندوستانی مہاراجوں میں خاص طور پر مقبول ہیں۔ سٹاکی کین میں صرف سبزی والے کھانے ملتے تھے۔ یہ اندرون شہر کے ذرا دور گولڈرز گرین کے "پوش" علاقے کے نزدیک بلسائز پارک میں تھا۔ ہندوستانی گروسری کی دوسری دکانیں بھی اہلِ ذوق میں خاص طور پر مشہور ہو رہی تھیں۔ ان میں سے ایک "کماریا اینڈ کمپنی" چٹنیوں اور کری پوڈر میں اپنا کمال ظاہر کرتی تھی اور دوسری "ویسٹ اینڈ گروسری" کی خصوصیت بمبئی کی مرغابی تھی۔ حلوائی کا کام بھی شروع ہو رہا تھا۔ نارتھ وڈ روڈ ہائی گیٹ میں گلاب جامن بنتے اور پھر دو شلنگ اڑھائی شلنگ فی درجن کے حساب سے فروخت ہوتے تھے۔

دیسی اشیائے خوراک کے علاوہ خالص انگریزی طرز کے کاروبار بھی جاری ہو رہے تھے۔ ان میں پیش پیش بمبئی سے آئے ہوئے پارسی تھے۔ رستم جی دارو والا کی پرانے نوادرات کی دکان تھی۔ مسز آر۔ دادا جی جی اچھی نسل کے کتوں کی تجارت کرتی تھیں۔ اور پی جمشید صاحب نے انگریزی ڈانس سکھانے کی کلاسز کا انتظام کر رکھا تھا۔ جہاں آکسفورڈ اور کیمبرج کے طالب علموں کو خاص رعایت دی جاتی تھی۔

1922ء میں لندن کے علاقے بیٹرسی نارتھ سے ایک ہندوستانی شاپور جی سکلات والا ممبر پارلیمنٹ بھی چنے گئے۔ حلقہ انتخاب میں ہندوستانیوں کی تعداد برائے نام تھی۔ تاہم وہ جیتے۔ اور 1929ء تک ممبر پارلیمنٹ رہے۔

لندن شہر کی لاکھوں کی آبادی میں اڑھائی ہزار ہندوستانی آٹے میں نمک کے برابر تھے لیکن اس نمک کی ایک منفرد حیثیت ضرور تھی۔

یہ طالب علموں اور پارسیوں کا لندن تھا۔ طالب علم پڑھ بھی رہے تھے۔ کمائی کے ذرائع بھی تلاش کر رہے تھے۔ اور یہ بھی ہو رہا تھا کہ "ارن اینڈ لرن" کی جدوجہد میں "ارن" کے معاملات "لرن" پر چھا جاتے اور تعلیم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ادھوری رہ جاتی۔ نجانے اس زمانے میں کتنے

ہونے والے بیشتر صرف ڈرٹی جوکوں کا لازمی حصہ ہیں کھا سکے۔ اور امتحانات التوا میں پڑتے پڑتے محض ماضی کی یاد بن کر رہ گئے۔ اسی طرح نجانے پی ایچ ڈی کے کتنے تھیسس اپنے انجام کو ترستے رہے اور گراں بہا تحقیقی مقالات گندی کاپیوں اور بے ترتیب کاغذات کی فائلوں میں دفن ہو گئے۔

دروازے کا کاروبار

اسی زمانے میں ایک اور انکشاف ہوا۔ کسی نے یہ دریافت کر لیا کہ "پیڈلنگ" جسے عام طور پر پھیری یا سیلانی اور سست حال قسم کے لوگ اپنی روزی کا ذریعہ بناتے ہیں اصل میں ایک نہایت دلچسپ اور سودمند کاروبار ہے۔

طالب علموں اور بمبئی کے چند تاجر پیشہ پارسیوں کے علاوہ جو لوگ یہاں محض روٹی کمانے کے لیے آئے انہیں پہلے سے آئے ہوؤں نے اسی راہ پر لگایا۔ مقامی پولیس سٹیشن سے پیڈلرز لائسنس حاصل کرنے میں کوئی دقت نہ تھی۔ اور پیڈلنگ کے استادی گر اور "راہ و رسم منزل ہا" بتانے والے بھی موجود تھے۔ انداز یہ تھا کہ ہول سیل کی کسی دکان سے زنانہ ملبوسات خریدے (کسی نہ کسی ہول سیل کی دکان سے پہلے ہی خیر سگالی قائم ہوتی۔ اور وہ نئے آنے والے کی امداد اور رہنمائی ایک فرض سمجھ کر کرتا۔ نو وارد اگر رشتہ دار یا واقف کار نہ ہوتا تب بھی یہ خدشہ نہیں تھا کہ وہ حساب کتاب میں کوئی گڑبڑ کرے گا۔ اس کی رہائش وغیرہ کا انتظام بھی یہی ..... کرتے تھے۔ بلکہ اکثر اپنے ساتھ ہی رکھ لیتے تھے) اور یہ مال کسی سوٹ کیس میں ڈال کر کسی ایسی بستی میں چلے جاتے جہاں کے مکانات سے ظاہر ہو کہ وہاں ورکنگ کلاس کے خوش باش خوش طبع لوگ رہتے ہیں۔ کسی کا دروازہ کھٹکھٹاتے اور جب یہ کھلے تو مسکراہٹ کے ساتھ "یو بائی سم تھنگ" کہہ کر دہلیز پر اپنا سوٹ کیس کھول دیتے بلکہ الٹ دیتے۔ عام طور پر گھریلو بیویوں کو اس میں کوئی نہ کوئی ضرورت کی چیز نظر آ ہی جاتی۔ جب اس کے بعد زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ اس وقت اس کے پاس سے خریدنے کے لیے نقد پیسے نہیں ہوں گے تو اس کا طریقہ بلکہ ایک طرح سے کاروبار کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جس شے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو وہ بے تکلفی پر ادھار دے دیجیے اور پہلی قسط کی وصولی کے لیے اگلے ہفتے کا کوئی وقت طے کر لیجیے۔ اگلے ہفتے جب وصولی کے لیے جائیں تو ایک آدھ چیز اور تھما آئیں۔ اس طرح یہ سلسلہ مستقل ہو جائے گا۔ ایک دفعہ جو دروازہ کھلا تو ہمیشہ کے لیے کھلا رہے گا۔ جتنے زیادہ گھر ہوں گے اسی حساب سے آمدنی بھی زیادہ ہوگی۔

یہ کاروبار بظاہر لاکھ معمولی معلوم ہو لیکن ہمت اور حوصلہ رکھنے والوں نے اس سے بڑی کمائی کی۔ پنجاب سے ہوشیار پور اور ضلع جالندھر اور ریاست جموں و کشمیر کے ضلع میرپور کے دیہاتوں سے آنے والوں نے اسے ایک منظم اور باقاعدہ کاروبار کی صورت دے دی۔ اس کاروبار میں ایک سہولت یہ بھی کہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولے بغیر بھی کام چل جاتا تھا۔ "یو بائی سم تھنگ" اور اس کے بعد پرائس ٹکٹ ویک، نائم، تھینک یو، بائی بائی جیسے چند الفاظ میں ساری منزلیں طے ہو جاتی تھیں۔ جہاں زبان نے کوئی رکاوٹ پیدا کی وہاں مسکراہٹیں خانہ پری کر دیتی تھیں اور مسکراہٹوں کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔

ایسٹ لندن، گلاسگو اور نیو کاسل کے قریب ڈرہم کی کوئلہ کی کانوں میں کام کرنے والوں کی بستیوں میں یہ کاروبار جسے "ڈور بزنس" (دروازے کا کاروبار) کا نام دیا گیا تھا خوب پروان چڑھا۔ بعض نے جب انگریزی زبان میں کچھ مہارت پیدا کر لی تو زنانہ ملبوسات کے ساتھ ساتھ ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتانا بھی شروع کر دیا۔ دست شناسی سونے پر سہاگہ بنی اور اس نے کاروبار کو بڑی ترقی دی۔ بعض کے لیے تو یہ اتنی بابرکت ثابت ہوئی کہ وہ ملبوسات کا کام چھوڑ کر کل وقتی "دست شناس" بن گئے۔ دوسروں کی قسمت کا حال بتاتے بتاتے انہوں نے اپنی قسمت کا راز پا لیا۔

دروازے کا کاروبار کرنے والے ان ہی لوگوں میں سے بعض نے بعد میں ذرا بہتری کی ہول سیل دکانیں کھول لیں۔ ظاہر ہے گاہکوں کی انہیں کوئی کمی نہ تھی۔ دروازے کے کاروباری سارے ہم وطن ان کے گاہک تھے۔ اس طرح کی اولیں دکانیں ایسٹ لندن، گلاسگو، نیو کاسل، مانچسٹر، لیڈز اور برمنگھم میں کھلیں۔

لینڈ لیڈی سے لینڈ لارڈ تک

شروع شروع میں جو طالب علم یہاں آئے وہ عام طور پر کسی "لینڈ لیڈی" کے ہاں "پے انگ گیسٹ" یا کسی بڑے مکان میں ایک "لاجر" کے طور پر رہتے تھے۔ ہندوستان میں لینڈ لیڈی اور پے انگ گیسٹ کی کوئی روایت نہ تھی۔ یہ لوگ اپنے رہائشی معاملات کے بارے میں گھر خط لکھتے تو کچھ ایسی تصویر کشی کرتے کہ "پے انگ گیسٹ" ہونا بڑا رومانی معلوم ہوتا۔ لینڈ لیڈی کا تذکرہ ایک مشفق ماں کا سا ہوتا۔ جو اپنے مکان میں جگہ دینے کے لیے کرائے اور کھانے کے لیے پیسے ضرور وصول کرتی تھی۔ گھر میں ایک خاص اصول اور ضابطے کی پابندی پر بھی بہت زور دیتی تھی۔ لیکن اس کی اخروٹ کی سی سختی کے اندر بڑا نرم دل ہوتا تھا۔ اس کی عام طور پر ایک نوجوان بیٹی بھی ہوتی تھی۔ جو "قوم انگلش سے ملے سیکھو وہی وضع و تراش" کے سلسلے میں ہمارے طالب علموں کی بہت مدد کرتی۔ اور ایک ہمدرد اور اچھی ساتھی ثابت ہوتی۔

لینڈ لیڈی کے ساتھ اس کی بیٹی کا ذکر تو ہوتا تھا لیکن یہ پتہ کبھی نہ چلا کہ لینڈ لیڈی کا کوئی شوہر اور اس کی بیٹی کا کوئی باپ بھی ہے۔ وہ نہ جانے کن پردوں میں چھپا تھا۔ ہمارے نوجوانوں نے بھی ان پردوں کو چاک کرنے کی کبھی ضرورت نہ سمجھی۔

لاجز جو پے انگ گیسٹ کے دور سے ذرا بعد کی پیداوار ہیں' بڑے بڑے مکانوں کے کسی ایک کمرہ "بڈ سٹر" میں رہتے تھے۔ کمرے میں سونے کے لیے ایک چارپائی' بیٹھنے کے لیے دو ایک کرسیاں' منہ ہاتھ دھونے کے لیے ایک بیسن اور کھانا پکانے کے لیے ایک گیس رنگ ہوتا تھا۔ ہمارے طالب علموں کو زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے ہاتھ سے کھانا پکانا بڑا "انگلش" اور بڑا "رومانٹک" معلوم ہوتا۔

لیکن ہندوستان کے دیہاتوں کی کھلی فضاؤں میں پل کر یہاں آنے والوں کو زندگی کے یہ طریقے نہ بھائے۔ انہیں بڑے بڑے مکانوں کے ایک کمرہ میں اکیلے دبک کر رہنے سے بڑی گھٹن ہوتی۔ کچھ عرصہ تو انہوں نے جوں توں کر کے گزارا۔ جب انہیں آس پاس سے کچھ واقفیت ہونے لگی اور یہاں کی بات کرنے کا ڈھنگ آ گیا تو وہ کمرہ کی بجائے مکان کرائے پر لینے لگے۔ پرانے محلوں میں ایک عام مکان ایک پونڈ فی ہفتہ پر مل جاتا تھا۔ مکان میں بہت سے مل کر رہتے۔ کرایہ کی رقم کا حساب ہوتا تو شلنگ دو شلنگ فی کس پڑتا۔ اپنی مرضی کا کھانا پکانے کی سہولت بھی تھی۔ دروازے کے کاروباری گھومنے گھمانے والے لوگ تھے۔ کسی فارم سے مرغی لے آتے اور اسے حلال کر کے کھاتے۔

دوسری جنگ عظیم سے ذرا پہلے ایسٹ لندن کے علاوہ برطانیہ کے بعض دوسرے شہروں میں کرائے پر لیے ہوئے مکانوں میں رہائش شروع ہو چکی تھی۔ اور اب کچھ لوگ کرائے کی بجائے مکان خریدنے کی سکیم بھی کر رہے تھے۔ خود لینڈ لارڈ بننے کا زمانہ آ رہا تھا۔ 1939ء میں برمنگھم میں پہلا مکان بالسل ہیتھ کے علاقے میں خریدا گیا۔ اس زمانے میں کسی کو اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ علاقے کی حیثیت کیا ہے یا مکان کیسا ہے۔ برطانیہ کے سبھی مکان اعلیٰ معلوم ہوتے تھے۔

ہندوستان میں حاکم انگریزوں نے اپنے لیے جدید طرز کے مکان "کن ٹونمنٹ" یا "سول لائنز" میں شہر سے دور بنائے تھے۔ "ڈاؤن وارڈ فلٹریشن" کی تعلیمی پالیسی کے تحت جو لوگ تعلیم حاصل کر کے آئی سی ایس بنتے یا کوئی اور عہدہ پاتے تب انہیں بھی سول لائنز میں ہی انگریزی بنگلہ مل جاتا اور یہ طبقہ برتری کی سند اور حکمرانوں کی قربت پا کر اپنے آپ کو "نیٹوز" سے دور کر لیتا تھا۔ "نیٹوز" یا تو دور دیہات کے کچے مکانات میں رہتے تھے یا صدیوں پرانے شہروں میں سب کے سب "محلہ" بنے ہوئے تھے۔ حاکم اور محکوم کے درمیان اتنے فاصلے تھے کہ ان کے کوچہ و بازار کی بو سول لائنز اور چھاؤنیوں میں رہنے والوں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ ان کی موٹر کاروں کے لیے شہر کی گلیاں بھی بہت تنگ تھیں۔ مقامی رہائشی مسائل پر ان کی نگاہ کیسے پڑتی؟

اس سلسلے میں انگریزوں نے ہندوستان میں جو سب سے بڑا کرم کیا وہ یہ تھا کہ دارالحکومت دہلی کے باہر نئی دہلی بنوا دی۔ یا چند دوسرے بڑے شہروں میں شہر کے ایک طرف مال روڈ قسم کی ایک وسیع سڑک بنوا کر اس کے دورویہ انگریزی سامان کی بڑی بڑی دکانیں کھلوا دیں اور بس..... لائل صاحب اور منٹگمری صاحب نے پانچ دریاؤں کی سرزمین پنجاب میں نہروں کا ایک سلسلہ قائم کر کے ویرانوں کو کاشت کے قابل بنایا تا کہ وہاں کپاس پیدا کر کے لنکا شائر اور یارک شائر کی ملوں کے لیے خام مواد مہیا ہو۔ لائل پور اور منٹگمری جیسے شہر تعمیر ہوئے لیکن یہاں بھی گھنٹہ گھر اور کشادہ بازاروں پر ہی توجہ دی گئی۔ عوام کے رہائشی مکانات کو حکومت نے کبھی اپنی ذمہ داری نہ سمجھا۔ نئے نہری علاقوں کے دیہات میں صرف اس حد تک پلاننگ کی گئی کہ مکانات ..... بے شک کچے ہیں.... ایک قطار میں ہوں اور گلیاں کشادہ ہوں۔

یہی وجہ تھی کہ ہمارے پیشرو جب یہاں پہنچے تو انہیں یہاں کے "محلہ" بھی اپنے یہاں کے محلوں سے کہیں بہتر نظر آئے۔ ہر مکان "سول لائنز" کے مکانوں جیسا نظر آیا۔ یہ مکان سستے بھی تھے۔ کرائے پر بھی انہیں ان ہی علاقوں میں ملتے تھے اور اس بارے میں ان کے تجربات بڑے خوشگوار تھے۔

ہمیں لینڈ لارڈ بنانے میں کارنر شاپ کی مالکہ اور پڑوس کی "مسز" کا بڑا حصہ ہے (یہ ہمیں اب پتہ چلا ہے کہ ہم لینڈ لارڈ نہیں' محض اونر آکیوپائر تھے۔ بہر حال) اس ملک کے دفتری اور غیر دفتری سارے معاملات میں ان دو خواتین نے ہماری بڑی مدد کی۔ ہماری ٹوٹی پھوٹی انگریزی انہوں نے سمجھی اور ہمارے فارم انہوں نے پُر کیے۔ جب کبھی گیس یا بجلی کا میٹر پڑھنے والے انسپکٹر کو آنا ہوتا تو ان ہی میں سے کوئی ہمیں کام پر جاتا دیکھ کر ہم سے مکان کی چابی لے لیتی اور ہمارے مکان کے دروازے پر انسپکٹر کے لیے یہ نوٹس لگا دیتی کہ "مکان کی چابی مکان نمبر..... سے حاصل کی جائے"۔ اگر ہمارے کچن کا سنک بند ہو جاتا تو بھی ہم ان ہی میں سے کسی ایک کے پاس جاتے اور اس کا شوہر ہمارے ہاں آ کر سنک ٹھیک کر دیتا اور ہمیں اس کی ساری کاریگری بھی سمجھا دیتا تا کہ کبھی آئندہ ہمیں اس طرح کی پریشانی ہو تو ہم اپنی مدد آپ ہی کر سکیں۔

ستے اور جیتے

جو لوگ ہمارے ساتھ محبت سے پیش آئے۔ ہم نے ان ہی کے گلی محلوں میں مکان خریدے۔ یہ بات ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھی کہ جہاں ہم رہتے ہیں یہ اچھا رہائشی علاقہ نہیں ہے۔ یا یہ کہ اسے کچھ سال بعد ختم کیا جائے گا۔ ہم نے اپنا رہائشی مسئلہ بڑے سیدھے سادھے بغیر کسی پر بوجھ بنے خود ہی حل کر لیا تھا۔

جنگ کے بعد نئے مکانات کی تعمیر کی منصوبہ بندی ہوئی۔ اور اس پر زور و شور سے عمل ہونے لگا۔ ہر سال کئی ہزار مکان بنے۔ اور ان میں کئی لاکھ افراد اور کنبے آباد کیے جاتے لیکن ہمیں ان نئی آبادیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہم جہاں تھے وہیں خوش تھے۔ ہر شہر کی مقامی کونسلیں اپنے ہاں کے بے گھر افراد کو مکان یا فلیٹ کرایہ پر دیتی تھیں اور اس طرح کے مسائل عام تھے کہ کونسل کے پاس مکان کم ہیں۔ انتظار کرنے والوں کی فہرست طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی تھی۔ ان فہرستوں میں بھی ہماری وجہ سے کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ پولیٹیکل اینڈ اکنامک پلاننگ (پپ) کے مطابق 1974ء میں ہم میں سے صرف 4 فیصد کونسل کے مکانات میں رہتے تھے۔ چنانچہ ہم کسی کونسل کے لیے رہائشی مسئلہ نہیں بنے۔ یوں بھی کونسل سے مکان لینے کی شرائط کچھ ایسی تھیں کہ اس زمانے میں ہم آسانی کے ساتھ ان پر پورے نہیں اترتے تھے۔ کونسل کے ہاؤسنگ رجسٹر پر نام لکھوانے کے لیے ضروری ہے کہ درخواست دینے والا کونسل کے علاقے میں ایک معینہ مدت تک رہ چکا ہے۔ کم از کم 1960 تک ہم میں سے بہت کم یہ شرط پوری کر سکتے تھے ہم اس وقت تک سیلانی بنے ہوئے تھے اور ایک فیکٹری سے دوسری فیکٹری اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں پہلے سے بہتر کام کی تلاش ہمارا شعار تھا۔ پھر ہمیں ہر دو چار سال بعد دو چار سال کے لیے اپنے بال بچوں سے ملنے وطن بھی جانا پڑتا تھا۔ فیکٹری میں اپنا کام چھوڑ کر جانے سے پہلے ہم عام طور پر کسی رشتہ دار کو بلوا لیتے۔ اور اسے فیکٹری میں اپنی جگہ کام دلوا دیتے تھے۔ ہمیں ان فوائد کا ابھی تک پورے طور پر پتہ نہ تھا جو ایک ہی جگہ مستقل کام کرنے سے ہوتے ہیں۔ فیکٹری والوں کے لیے بھی یہ صورت حال بڑی سازگار تھی۔ ان کا کام جاری رہتا۔ ہم محض عارضی ورکر رہے۔ اور اس وجہ سے مستقل ورکرز کی طرح اپنے حقوق کے لیے کوئی مطالبہ نہ کرتے۔ ہم اسی میں مگن تھے کہ اس ملک میں مستقل طور پر رہنے کے لیے تھوڑے آئے ہیں۔ جو کسی لمبی چوڑی منصوبہ بندی کا جھنجھٹ پالتے پھریں۔

لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ اور برطانیہ کو مزدوروں کی بہت ضرورت تھی۔ 1947ء کے بعد بھارت اور پاکستان سے ایسے لوگ زیادہ آئے جن کے لیے "ڈاؤن وارڈ فلٹریشن" کے ذریعے پہنچنے والی تعلیم بھی دور ہی تھی۔ یہ ان دیہاتوں کے باسی تھے جہاں سے نزدیک ترین پرائمری سکول کم از کم تین چار میل کے فاصلے پر تھا۔ مڈل سکول اس سے بھی دور تھا اور ہائی سکول تو خیر بہت ہی دور کی بات تھی۔ ان کے جسم کا کس بل اور بازوؤں کا دم خم پنجاب، سرحد اور آزاد کشمیر کے دیہاتوں کی تازہ ہواؤں کی دین تھا۔ اور اس کی برطانیہ کی فیکٹریوں میں بڑی مانگ تھی۔ برطانیہ نے اپنا دروازہ بڑی کشادہ دلی سے کھول رکھا تھا۔ طالب علموں کا دور ختم ہو رہا تھا۔ اب برطانیہ کی ضروریات مختلف تھیں۔

ہم یہاں آئے۔ ہم نے یہاں کی فیکٹریاں چلائیں۔ بسوں میں بس کنڈکٹری کی اور ریلوے کے پلیٹ فارموں پر پورٹر بنے۔ ہمیں کام کی ضرورت تھی۔ اور برطانیہ کو کام کرنے والوں کی۔ ہم نے بڑی محنت اور خوش اسلوبی سے ان کے وہ سب کام کیے جو یہ خود کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ہماری محنت کی جس نے ہمیں جو قیمت دی۔ وہ ہم نے دل و جان سے قبول کی۔ اور اس طرح اپنے ایمپلائر کے چہیتے اور سستے مزدور بن گئے۔ ہم صرف اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ انگریزی زبان نہ ہمیں آتی تھی اور نہ سیکھنے کی فرصت تھی۔ ہمارے ایمپلائر کو ہماری یہ بات بھی اچھی لگی۔ "اس طرح نہ ہمیں اپنے آس پاس کا پتہ چلے گا نہ ہمارے حوصلے بڑھیں گے۔ اور نہ ہم زیادہ مزدوری مانگیں گے.... ٹریڈ یونین نے بھی ہمیں کسی خاص توجہ کا مستحق نہ سمجھا۔ البتہ یونین کا ممبر ضرور بنا لیا اور ہم میں سے کسی ایک کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ ہر ہفتہ شلنگ دو شلنگ اپنے ہم زبان ساتھیوں سے اکٹھے کر کے اپنے ہاں کے "یونین والے" کو دے دیا کریں۔ یونین کا ممبر بننے سے جو حقوق اور مراعات حاصل ہونی چاہئیں ان کا ہمیں علم تھا نہ کسی نے بتانے کی زحمت گوارا کی۔ ہم بھی یونین کا ہفتہ وار چندہ ایک جزیہ قسم کا ضروری عطیہ سمجھ کر ادا کرتے رہے۔ ہم میں سے جتنے آئے وہ سب کے سب اپنے بیوی بچوں کو پیچھے چھوڑ کر آئے تھے۔ ہمیں اکثر صورتوں میں اپنے دادا، دادی بلکہ چچاؤں اور ان کے بیٹوں پوتوں تک کی کفالت کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ کمائی کا بیشتر حصہ وطن عزیز کی جانب منی آرڈر ہو جاتا۔ یہاں رہائش کی صورت یہ تھی کہ ایک دوسرے سے ادھار لے کر کوئی ایک مکان خرید لیتا اور پھر اس میں دس بارہ افراد رہائش پذیر ہو جاتے۔ عام طور پر یہ سب رشتہ دار یا کسی قریبی گاؤں کے جان پہچان کے لوگ ہوتے تھے۔ ہانڈی روٹی ایک ساتھ پکتی۔ سب لوگ جان مار کر پورا ہفتہ کام کرتے۔ اتوار آتا تو کسی محلے کی کسی اور گلی یا کسی اور محلے کے اسی طرح کے مکان میں اپنے دوستوں رشتہ داروں سے ملنے چلے جاتے۔ گھر سے آئے ہوئے اپنے خط انہیں پڑھواتے۔ اور اگر ان میں سے کسی کا کوئی خط آیا ہوتا تو وہ بھی سب کے لیے ایک مشترکہ اخبار بن جاتا۔ گاؤں، تحصیل، ضلع اور

دوست رشتہ دار نمبردار پٹواری سب کی خیر خبر رہے معلوم ہو جاتی۔ پھر بات سے بات نکل نکلتی۔ اور سارا دن اس مزے سے گزرتا کہ پورے ہفتے کی تھکن چند گھنٹوں میں دور ہو جاتی۔ بینک ہالیڈے اور اگست کی چھٹیوں میں ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر ہوتا اور اسی طرح کے کسی مکان کے مکینوں سے ملاقاتیں اور باتیں ہوتیں۔ پردیس کا بوجھ کم ہو جاتا۔ اور لگے ہاتھ اندرون ملک کی سیر بھی ہو جاتی۔ جب کسی کے پاس کچھ سال بعد اتنی رقم جمع ہو جاتی کہ وہ وطن عزیز کا ایک چکر لگا سکے تو وہ اپنے بیوی بچوں سے ملنے چلا جاتا۔ اس مٹی سے جہاں اس نے اپنا بچپن اور جوانی گزاری تھی اپنا رشتہ قائم رکھتا۔ اور ایک طویل "چھٹی" گزارنے کے بعد واپس برطانیہ کی فیکٹریوں کا رخ کرتا۔ ان دنوں صرف پاسپورٹ حاصل کرنے کی منزل کڑی ہوتی تھی۔ ورنہ اس کے بعد جب جی چاہے اور حالات اجازت دیں وہ بے جھجک آ جا سکتا تھا۔ کچھ عرصہ اس ولایت میں رہتا اور کچھ عرصہ وطن عزیز کی فضاؤں میں "فرصت کے رات دن" گزارتا۔

ہم اب امیگرنٹ ہیں

کہتے ہیں ایک سید زادہ پھرتے پھراتے دور دراز کسی گاؤں میں جا نکلا۔ گاؤں والوں کو جب پتہ چلا کہ یہ سید زادہ ہے تو انہوں نے اسے گھیر لیا۔ عقیدت سے گلے لگایا اور اپنی ساری محبت اس پر ارزاں کر دی۔ جب اس نے واپسی کا عزم کیا تو سب کے سب اس کی راہ میں کھڑے ہو گئے۔ اور کہا.... "سید بادشاہ اب تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔ ہم تمہیں یہیں رکھیں گے۔ جب مرو گے تو تمہارا مزار بنائیں گے۔ اپنی منتیں پوری کرنے اور نذر نیاز چڑھانے کے لیے ہمیں پورے ستر میل دور مزار پر جانا پڑتا ہے۔ اللہ نے ہم گنہگاروں پر کرم کیا جو تمہیں ہمارے پاس بھیج دیا۔ اب تم یہیں رہو گے اور یہیں تمہارا مزار بنے گا۔"

معلوم ہوتا ہے ہم پر بھی کچھ ایسی ہی افتاد آ پڑی ہے۔ ہم وہ سید زادے نہ تھے۔ جن کے مزار کی اہل برطانیہ کو ضرورت تھی۔ البتہ یہاں کی فیکٹریوں، ملوں، ہسپتالوں، سکولوں، بسوں اور ریلوے کو ہماری یقیناً ضرورت تھی۔ اور یہاں کے ایمپلائر کی نگاہ میں ہم محنتی اور دیانت دار ورکر تھے۔ اس ملک میں ہمارا قیام یہاں کی ترقی کے لیے اشد ضروری تھا۔

برطانیہ نے ہمارے لیے دروازہ کھولا اور پھر بند کر لیا لیکن کچھ اس طرح کہ ہمارے شوق کی آگ اور بھڑکی۔ دروازے کو..... اپنی ضرورت کے مطابق اور ہمیں ذرا تسلی دینے کے لیے.... تھوڑا سا کھلا بھی رکھا گیا۔ سیاست گروں اور جمہوریت پسندوں نے ہم سے اپنا پن اور بیگانگی کے عجب عجب کھیل کھیلے۔ کبھی مسکرائے۔ کبھی تیوری چڑھائی اور میٹھے تیکھے انداز میں ایسا الجھایا کہ ہم جو ولایت میں اس لیے نہیں آئے تھے کہ یہاں اپنا گھر بسائیں گے اور تارکین وطن کہلائیں گے حالات کی سازش کا شکار ہو گئے۔

آپ نے وہ کہانی تو سنی ہو گی کہ ایک جنتی کو جنت میں بیٹھے بیٹھے ایک دن خیال آیا کہ نجانے جہنم کیسا ہو گا۔ اس کے بارے میں سنا تو بہت کچھ تھا لیکن اسے کاش کبھی اس کی ایک جھلک دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ قریب سے ایک فرشتہ گزر رہا تھا۔ ان جنتی صاحب نے اسے روک لیا اور پوچھا۔ "میاں فرشتے یہ تو بتاؤ کہ ہم کبھی جہنم کی سیر کر سکتے ہیں؟" فرشتے نے کہا "محترم آپ جنتی ہیں جو چاہیں ہو سکتا ہے۔ جب چاہیں جا سکتے ہیں" کچھ ہی دیر بعد وہ جہنم میں تھے۔ لیکن انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ جہنم کا جو نقشہ ان کے ذہن میں تھا یہ جہنم اس سے بہت مختلف تھا۔ یہاں ساز تھے، موسیقی تھی، رقص و سرود کی محفلیں تھیں۔ ہر طرف مسکراہٹ ہی مسکراہٹ تھی۔ نازنینوں کے غمزہ و ادا کی یہ کیفیت تھی کہ جنتی حور و غلمان کو بھولنے لگے۔ قیام عارضی تھا اس لیے جلد ہی واپس لوٹنا پڑا لیکن اب جنت میں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ ایک دن اس فرشتے سے پھر ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا "ہم جہنم میں گئے پر جلد ہی لوٹنا پڑا۔ یہ تو بتاؤ اگر کوئی جنتی جہنم میں مستقل طور پر جانا چاہے تو کیا وہ جا سکتا ہے؟" فرشتے نے کہا "محترم آپ جنتی ہیں جو چاہیں ہو سکتا ہے۔ جب چاہیں جا سکتے ہیں۔ وہاں مستقل رہنے کے لیے کچھ دفتری کارروائی ضروری ہے لیکن یہ معاملہ بھی پلک جھپکنے میں ہو جائے گا۔" دفتری کارروائی ہوئی۔ اور وہ مستقل قیام کا پروانہ لے کر جہنم میں پہنچ گئے۔ اب کے پھر انہیں حیرت ہوئی کہ جہنم کا جو نقشہ وہ پچھلی مرتبہ دیکھ کر گئے تھے یہ جہنم اس سے بہت مختلف تھا۔ یہاں آگ کے الاؤ تھے۔ جہنمی لوگ پسینے میں شرابور مشقت کر رہے تھے۔ اور گرز بڑے بڑے گرز لیے ان کے نگہبان پھر رہے تھے۔ جونہی کوئی دم لینے کو رکتا۔ دھم سے اس پر گرز کی ایک چوٹ پڑتی۔ اور وہ پھر سے آگ کے الاؤ میں جلنے لگتا۔ ان سابق جنتی صاحب نے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا تو وہی فرشتہ نظر پڑا۔ جس نے ان کے یہاں آنے کا انتظام کیا تھا۔ اس سے پوچھا۔ "میاں فرشتے یہ جہنم وہ تو نہیں جو میں نے پچھلی مرتبہ دیکھا تھا۔" فرشتہ بولا "محترم جگہ وہی ہے صرف فرق یہ آ پڑا ہے کہ پہلے آپ چھٹی منانے والے ٹورسٹ تھے اور اب امیگرنٹ ہیں۔"

برطانیہ میں ہم اب امیگرنٹ ہیں اور ہم چاہیں یا نہ چاہیں۔
مانیں یا نہ مانیں ہمارا جنم مرن اب یہیں ہے۔

اور وقت کا تقاضا ہے کہ جب ہمیں یہیں رہنا ہے تو اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کے ساتھ ساتھ ان حقوق کو بھی پہچانیں جو اس ملک میں رہتے ہوئے ہمیں حاصل ہیں اور ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔

# آئینۂ بادِ بہاری

## اقبال بھٹی

مکرمی ہاشمی صاحب.... آداب عرض

شاہین کہہ گئے ہیں کہ آپ کو خط اپنی طرف سے لکھوں۔بات یہ ہے کہ وہ آج کل بے انتہا مصروف رہتے ہیں کالج اور پھر.... ایک ماہ پہلے انہوں نے انگریزی کتابوں کی دکان Thames and Thames بھی خرید لی ہے۔اس سلسلے میں اور مصروفیت ہو گئی ہے۔اکثر تو رات کے دس بجے گھر لوٹتے ہیں۔بالکل تھکے تھکائے۔اور پھر آپ جانتے ہیں خطوں کے معاملے میں تو وہ ذرا ویسے ہی ہیں۔آپ سے زیادہ ہی' لیکن ویسے وہ آپ کو ہر وقت یاد کرتے رہتے ہیں۔

"فسادات نمبر" نے الگ پریشان کر رکھا ہے۔ہوتے ہوتے تقریباً ۵۰۰ صفحے تک چلا گیا اور اس پر بھی سارے مضامین کھپ نہ سکے۔مجبوراً چند بہت اچھے افسانے جو دیر سے ملے تھے اس سے نکال دینے پڑے۔مثلاً افسانہ "دھرتی خون کی پیاسی ہے" بھی نہ آ سکا اور دو تین اور بہت اچھے افسانے۔اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس کے بعد دوسرے نمبر میں فسادات نمبر کا ایک Suppliment کے طور پر دیا جائے کیونکہ بہت اچھی چیزیں رہ گئی ہیں۔اس لیے آپ اپنا رپورتاژ ضرور بہ ضرور اور جتنا جلد ہو سکے مکمل کر کے بھیج سکیں تو بے حد عنایت ہوگی۔اس میں غلام عباس' ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور خود وغیرہ بھی شریک ہیں۔آپ اپنا رپورتاژ ضرور بالضرور بھجوائیں۔

"فسادات نمبر" کے لیے مزید بہت سی چیزیں آ گئی تھیں۔آپ نے شاید پوری تفصیل "ساقی" میں دیکھی ہو۔خاص طور پر اس کے لیے ایک بنگالی افسانہ حاصل کیا ہے جو فسادات پر لکھے گئے بنگالی افسانوں میں بہترین قرار دیا گیا ہے۔اس نے نیا دور کے کوئی ۸۰ صفحات گھیر رکھے ہیں۔بہر حال یہ نمبر ہو گا بڑا شاندار۔اس ماہ کے آخر تک یا دسمبر کے شروع میں نکل آئے گا۔چھپائی بھی آدھی ہو چکی ہے۔

آج کل آپ کہاں ہیں اور کیسے گزر رہی ہے۔شاہین کی تو اس کی بڑی تمنا ہے کہ آپ کسی نہ کسی طرح کراچی پھر آ سکیں۔شہاب جب کبھی یہاں آتے ہیں تو ہمارے ہاں ضرور آتے ہیں اور وہاں کی کافی باتیں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔

شاہین کی طرف سے بہت پیار اور سلام

مخلص ممتاز شیریں

مائی ڈیئر ہاشمی صاحب۔آداب عرض

میں آج دفتر نہیں گیا ناسازیٔ مزاج کی وجہ سے گھر ہی پر رہنا پڑا۔آپ کو خط لکھنے کے روز جو منصوبے بندھتے تھے بارے آج ان پر عمل پیرائی ہو رہی ہے لیکن خط لکھنے کی فوری تحریک راولپنڈی سے دو صاحبوں کے خطوط سے ہوئی۔لکھا تھا کہ "کشمیر اداس ہے" بہ سر بازار ہے لیکن بندۂ خدا آپ ایک نسخہ ادھر بھی بھجوا دیتے۔

میں ڈر رہا تھا کہ یہ کتاب بہت دنوں تک شائع نہ ہو گی۔اب ہو گئی ہے تو بہت اچھا ہوا۔بات یہ تھی کہ عزیز احمد صاحب کے اصرار پر ایک صاحب نے "پاکستان کوارٹرلی" کے لیے جدید اردو ناول نگاروں پر ایک مضمون لکھا تھا۔فل سکیپ کے چھ صفحوں کا مضمون تھا جس میں پہلے تین صفحے پس منظر کے طور پر دیے گئے تھے اور بقیہ تین صفحوں میں عصمت چغتائی کی "ٹیڑھی لکیر" کرشن چندر کی "شکست" اور "قرۃ العین" کے "میرے بھی صنم خانے" ایک صفحے میں سمیٹ لیے گئے تھے۔باقی دو ناول نگار عزیز احمد کی شکست کے لیے وقف تھے۔پاکستان کوارٹرلی کے ایڈیٹر مسٹر قطب نے یہ مضمون نظر ثانی کے لیے مجھے دیا۔پہلے تین صفحے تو میں نے جوں کے توں رکھے۔اور بقیہ مضمون سرے سے نیا لکھا۔اب کے کوئی گیارہ صفحے ہوئے ہیں۔اس میں "کشمیر اداس ہے" پر بھی کافی کچھ فشانی کی ہے۔عزیز احمد سے متعلق مضمون میں بھی تنقیدی توازن برتا ہے۔یہ مضمون strictly in confidence میں آپ کے دیکھنے اور رائے لینے کے لیے ساتھ بھیج رہا ہوں۔تو ہاں ذرا ایک بات کا تھا کہ اس مضمون کے نکلنے تک آپ کی کتاب "کشمیر اداس ہے" شائع نہ ہوتی تو معاملہ ایڈیٹر کے لیے ٹیڑھا تھا۔اب بالکل ٹھیک کے اس پار ہے۔

عزیز احمد کشمیر منسٹری میں ڈپٹی ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز ہو گئے ہیں۔ان کے پچھلے محکمے کے سارے لوگ کاتب سے لے کر بڑے افسر تک بھی خوش ہیں۔ایک صاحب فرما رہے تھے کہ وہ گورنر جنرل ہو کے جائیں' ہمیں بڑی خوشی ہو گی لیکن جائیں ضرور۔اب آپ کے حصے میں آئے ہیں۔راولپنڈی روانہ ہونے سے دو تین دن پہلے مجھ سے ملنے آئے تھے' کہہ رہے تھے کہ وہاں Hostile Atmosphare میں کام سنبھالنا ہو گا۔بس ایک محمود ہاشمی ہی ہیں جن سے اپنے کام میں مدد لی جا سکتی ہے۔اب آپ کے کشمیر سے متعلق رپورتاژ سے بھی خاصے متاثر نظر آ رہے ہیں' وہ کیا شعر ہے:

ہوئے یہ دوست جن کے

اس کے بعد یاد نہیں' اب آپ کسی نہ کسی طرح کراچی آ ہی جایئے۔عسکری "ماہ نو" کی ایڈیٹری سے مستعفی ہو گئے ہیں۔آپ کو اگر آئے تو میری رائے میں ضرور قبول کر لیجیے۔جواب جلد اور تفصیلی ناول والا مضمون کل کی ڈاک سے بھیجوں گا۔دفتر چھوڑ آیا ہوں۔

آپ کا صمد شاہین

۱۲/۴/۳ بانڈی پور

معلوم ہوتا ہے آپ کا حسنِ ادارت و اشاعت دیکھ کر ہی آپ پر
کچھ زیادہ ہی مرتے ہیں اردو شاعروں کی پرانی خوش فہمی بلکہ کمزوری۔

۳ مارچ کو جو خط آپ نے لکھا ہے اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ سنجیدہ
اور سچی خبر مضامین کا معاوضہ تو "مشرق" سے نہیں مل سکتا البتہ فلمی "شخصیتوں"
سے انٹرویو [مع تصاویر] کے فی صفحہ ۳۰ روپے مل سکتے ہیں! صاحب! میں کہاں
اور یہ جال کہاں! "جنہیں آپ کے پڑھنے والے فلمی "شخصیت" سمجھتے ہوں
گے اُن میں سے اکثر اس قابل نہیں ہیں کہ میر تقی میر تو کیا اُن کے ہم جیسے نیاز
مند بھی دلی سے لکھنو جانے والی گاڑی میں دیر تک گفتگو کرنا پسند کریں۔ زبان
خراب ہوتی ہے جناب!

میرا تعلق اس شہر سے، اُس سڑک سے جس سے یہ شخصیات صبح و
شام گزرتی ہیں اور اس حلقے سے جس میں اُن شخصیات کا شب و روز (شب
زیادہ) اٹھنا بیٹھنا رہتا ہے اور اُن کوچوں سے جہاں اُن حضرات کی
"مصروفیات" کا سلسلہ ہے تقریباً ۱۸ سال پرانا ہے میرے اکثر ذی شعور
اور اہلِ قلم احباب بھی ان ہی لوگوں سے وابستہ ہیں لیکن خدا گواہ آج تک زندگی کا
کوئی ۲۴ گھنٹے میں نے اس آرزو میں بسر نہیں کیے کہ ان پُر پیچ پگڈنڈیوں، اُلجھی زلفوں
اور خالی کھوپڑیوں، چمکتی ہوئی لمبی لمبی کاروں اور کجلائی آنکھوں کی اس دنیا میں
قربت کی منزلیں طے کرلوں۔

آپ مجھے پابندی سے پرچہ بھیج رہے ہیں، اس کا دل و جان سے
شکریہ کوئی غیر فلمی سی چیز (یعنی جس کا تعلق واقعی فلمی زندگی سے ہو) بھیج کر کبھی
نہ کبھی میں اس نوازش کا حقیر سا معاوضہ پیش کردوں گا لیکن ایسے صاحبان زن و
زر و زمین سے انٹرویو لینے نہ جاؤں گا۔ سو میں کوئی دو آدمی اس قابل ہوں گے کہ
ان سے دس منٹ معقول گفتگو ہوسکے اور وہ تمیز سے نچلے بیٹھ سکیں آپ کے
سامنے شوربہ کو ٹھنڈا کریں گے اور کوئی نکلی پھوہڑپن کی حرکت کریں گے۔

جو ایسے نہیں ہیں، وہ ویسے ہیں کہ اپنے سے کمتر اور اہلِ ہنر
صاحبانِ اقتدار کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں۔ اب میں کیا عرض کروں، حال ہی
میں ہمارے تین ذمہ دار حضرات (فلمی دنیا سے باہر واقعی وہ ذمہ دار لوگ ہیں)
اہلِ قلم [کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور سردار جعفری] کے مضامین شائع ہوئے
ہیں اخبارات میں۔ اُن کو دیکھ کر مجھے تاریخِ ادب کے بعض گھناؤنے واقعات یاد آ
گئے۔

آپ نے کوئی امر و تھوڑی سی کیا تھا، جو میں اتنی لمبی بات کہتا،
لیکن دیکھیے اپنی جھنجھلاہٹ کو چھپا نہ سکا اور آپ کے دس منٹ چھین لیے، معاف کیجیے گا،
مگر "مشرق" میرے نام جاری رکھیے گا۔ اس کے آنے سے بچوں کا بھلا ہوتا
ہے۔

ظ۔ انصاری

کراچی، ۵ اگست

محترمی... السلام علیکم

کوئی ایک مہینہ قبل آپ کا خط ملا تھا۔ خیریت کی تحریر دور ہوگئی۔ میں تو امید
چھوڑ بیٹھا تھا لیکن اب داستان امیر حمزہ پڑھ کر علم میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔ مجھے
والا خط رجسٹری کر کے کوہاٹ روانہ کردیا ہے۔ خط کی طوالت ذرا بھی محسوس نہیں
ہوئی۔ جو ہوا تو اور کا ذبیحہ لطف آیا۔ اگر آپ ایسے ہی دو چار خط اور لکھ دیں تو
ایک شمارہ پورا تیار ہوسکتا ہے جس کا عنوان یہ ہونا چاہیے "انگلستان اداس
ہے"

ولایت میں آزاد کشمیریوں کی زندگی ایک عجیب و غریب موضوع
ہے کسی اور لکھنے والے کا قلم وہاں تک نہیں پہنچ سکا۔ کسی وقت بیٹھ کے اس پر
کچھ لکھ ڈالیے۔ بڑی یادگار چیز ہوگی۔

مجھے کے خط میں آپ نے مستقبل کا جو پروگرام کھینچا ہے وہ ویسا ہی
ہے جیسا کہ ہونا چاہیے۔ ذہنی سکون کی تلاش بے معنی ہے جب تک ذہن
سلامت ہے سکون نہیں ملے گا۔ آپ کو اپنے موجودہ کام میں لطف آرہا ہے یہی
سب سے بڑی نعمت ہے۔ آزاد کشمیر سے قرضے کی کوشش کرتے جایئے لیکن
محض یہ کہہ کر دل کو خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔

"نیا دور" شاہین اور شیریں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ان کی اجازت
کے بغیر اب کوئی اور صاحب اسی نام کا رسالہ نکال رہے ہیں۔ خبر ہے کہ
ابوالفضل صدیقی اس نئے رسالے کی ادارت سرپرستی کر رہے ہیں۔

زوبی کو کراچی کی ایک دولت مند آرٹسٹ لڑکی نے گھر ڈال لیا
ہے ایک شاندار پریس بھی لگوا دیا ہے۔ اب زوبی کی پانچوں پریس میں اور سر
لڑکی میں ہے۔ ٹھاٹھ سے بسر ہو رہی ہے۔ اعجاز چار مہینے کے لیے لیڈرشپ
پروگرام کے تحت امریکہ گیا ہوا ہے۔ قمر نظر امریکہ سے ہو آیا ہے۔ مختار منتی کو
راولپنڈی میں ضیاء الاسلام نے تنگ کر رکھا ہے۔ تابش نوکری چھوڑنے کو ہے۔ بچے
کی مجھے کوئی خبر نہیں۔ ن۔م۔ راشد امریکہ سے چھٹی پر آیا تھا۔ اس کی زبانی
معلوم ہوا کہ بڑے مزے میں ہے اور جنسی تقاضوں سے خاطر خواہ عہدہ برآ ہو رہا
ہے۔ ایک لڑکی سے تابش مجید عاشقی بھی چل رہی ہے۔ تمکین بدستور خالی ہے۔
اشفاق احمد نے لاہور میں ایک استانی سے شادی کرلی۔ مجید لاہوری مر گیا۔
اب اگلے سال سے اس کا دن بھی منایا جائے گا۔ فیض نے امریکن Time کی
طرز پر ایک ہفتہ وار رسالہ "لیل و نہار" جاری کر رکھا ہے۔ خوب چل رہا ہے۔
نقوش نے اپنا پریس لگا لیا ہے۔ مکتبہ جدید والے اور چوہدری نذیر بھی عیش میں
ہیں لیکن کتابوں کی کساد بازاری کا رونا بدستور روتے ہیں۔

میں نے ایک مسودہ "ڈپٹی کمشنر کی ڈائری" مکمل کیا ہے۔ شائع
کرنے سے فی الحال ڈرتا ہوں۔ ایک اور مسودہ قسم سفرنامہ بھی ہاتھ میں ہے

ایک چیز بطرز اسرار دبا دبا ہوا ذہن میں ہے لیکن جان کی امان پاؤں تو لکھوں۔

خدا کا شکر ہے کہ مجھے بیوی کے ساتھ اردو بولنے کا حادثہ پیش نہیں آیا۔ اس لیے ٹی۔ وی کی اردو سمجھ نہیں ہو گی۔ مئی کے مہینے میں ایک ننھے میاں تشریف لا رہے تھے لیکن زندہ نہ رہ سکے۔ عفت تعلیم کے حساب سے تو ایم بی بی ایس ہے لیکن درحقیقت بالکل گھر والی ہے اور خالص پنجابن ہے۔ چنانچہ شادی کی زندگی بھی اچھی خوشگوار ہے۔ جو جو خطرات اور وہم شادی سے باز رکھتے تھے وہ حقیقت میں بے بنیاد ثابت ہوئے۔ آپ بھی فرصت کے لمحات میں ان خطوط (Lines) پر سوچا کریں۔ شادی کرنے سے بچوں کا بھلا ہوتا ہے۔ ہاں انتخاب اگر وطن کے خمیر ہی سے ہو تو بہتر ہے۔ جواب کا منتظر رہوں گا۔

آپ کا قدرت اللہ شہاب

لاہور ۱۵ اپریل

پیارے محمود ہاشمی

رپورتاژ کا لفظ مجھے اس لیے یاد آیا ہے ایک زمانہ میں تم نے ایک کتاب لکھی تھی "کشمیر اداس ہے" اس کے نیچے چھوٹا عنوان تھا "ایک رپورتاژ" وہ زمانہ رپورتاژوں کا زمانہ تھا۔ سب مشہور سمجھے ہوئے اور جوان لکھنے والے بھی اپنی اپنی رپورتاژ لکھنے میں مصروف تھے۔ ان لوگوں کو یہ تحریک شاید تمہاری تحریروں سے ہوئی تھی لیکن مجھے یاد ہے بعد کے کاغذ سے لے کر "بیچو کی ملیاں" تک بیشتر لوگوں نے رپورتاژ ہی لکھیں۔

بیس سال پہلے میں نے بھی اپنے کہانیاں لکھنی شروع کی تھیں اور جب میرا ایک افسانہ مولانا صلاح الدین نے اپنے پرچے میں چھاپا اور اداریہ میں کچھ تعریفی جملے بھی لکھے [ہونہار مصنف.....] تو میں ساتویں آسمان پر تھا۔ اس کے بعد بھی میں نے کافی کہانیاں لکھیں، کچھ چھپیں کچھ آدھی لکھی رہ گئیں (ایک ناول بھی تقریباً آدھا لکھا) جو رومانوی پوچ پن کا عمدہ نمونہ تھیں۔ آج خیال کرتا ہوں تو وہ گئے گزرے ہوتے ہیں (عمر کے بڑھنے سے تنقیدی حس تیز ہو گئی ہے فنی حس ختم۔ (الٹا حساب ہوتا تو شاید بہتر تھا) یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ افسانہ بیس سال پہلے افسانہ نویس اگر پورا افسانہ نہیں تو کم از کم تین چوتھائی حصے کی اٹھان مثلاً لفظ "اور" سے کرتے "اور پھر جیلہ نے انگڑائی لیتے ہوئے سوچا..." [یہ کسی مستورہ مسرور ورچیتا رخواتین اور پنجاب کے انچھو کہانی باز] "اور گھوڑا چابک پڑتے ہی سائیں فضل دین کے اڈے پر سے ایسی بے خبری سے گزر گیا جیسے اس کی پہچان ہی نہ ہو..." [از منٹو اور حقیقت پسند مصنفین لیکن دماغ کا اچھا پن غائب] "اور اس کے تحت الشعور میں پھر سے چیونٹیاں سی رینگنے لگیں..." [از عصمت چغتائی لیکن تحریک کی گہرائی بہت کم]

یہ جملے میں نے یونہی گھڑے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ بیس سال بعد بھی اور بیس سال میں ایک نسل ابھر آتی ہے اردو کے بیشتر افسانہ نویس اسی طرح کی چال چل رہے ہیں۔ شاید لکھنے کا ڈھب اور اسٹائل اس صورت میں بدلے کہ موضوعات بدلے جائیں، افسانوں کا تعلق اب تک "سماج" سے ہوتا ہے یا پھر "نفسیاتی" کہانیاں ہوتی ہیں۔ خدا ان دونوں موضوعات سے بچائے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہم لوگ اپنے ادب کے بارے میں ڈینگیں مارنے کی بجائے مرزا فرحت اللہ بیگ اور غالب کے خطوط ہی پڑھنے پر وقت صرف کریں تو ہمارے حق میں زیادہ اچھا ہوگا۔ عصمت چغتائی کو ایک طرف رکھ دو اور پھر ایمان سے بتاؤ کہ ابھی تک ہماری اردو نثر میں سرشار کی نوعیت کا انشا لکھنے کون پیدا ہوا ہے؟

اتنی تمہید کا مقصد یہ نہیں کہ اب میں کوئی کتاب لکھنے والا ہوں [رپورتاژ والی کتاب!!] مگر صرف کہنا یہ ہے کہ لکھنا بہت ہی مشکل چیز ہے اور اچھا لکھنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ ایسی چیز جو میں خود لکھوں تو مجھے بہت ہی سستی سطحی اکہری معمولی اور بے جان نظر آتی ہے۔

بہت دنوں کے بعد کئی برس بعد [کم از کم پندرہ] اردو میں لکھنے کو جی چاہا۔ بریڈفورڈ کے سفر سے یہ تحریک ہوئی۔ انگریزی میں لکھنے کا بھی ارادہ ہوا ہے۔ پچھلے دس پندرہ برس میں انگریزی میں کئی چیزیں لکھی ہیں۔ لیکن انگریزی میں لکھوں تو جو سوال (اپنے ہی سے) کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں کر سکتا۔ ان کا جواب ہی دے سکتا ہوں۔ ہاں اگر پاکستان کے لوگوں کے لیے انگریزی میں لکھوں تو اور بات ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں کے لیے انگریزی میں کیوں لکھوں۔ جس طرح کی چیز لکھنے کو جی چاہتا ہے وہ نہ رپورتاژ ہے نہ مضمون۔ کیفیت کہہ لو۔ تاثرات اس لیے نہیں کہتا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا میں انڈونیشیا کا نائب صدر ہوں یا کوئی دوسرا بسمہ عالم ہوں کہ "اپنے تاثرات بیان" کر رہا ہوں۔ کیفیت کے لفظ سے بھی ڈرتا ہوں کہ لفظ بڑا شاعرانہ اور روایت کے حق لیے ہوئے ہے۔ روایت سے مجھے کوئی چڑ نہیں لیکن ادب میں اور خاص طور پر "فکشن" میں روایت لوگوں کے دماغ کا نتیجہ ہوتی ہے اور لوگوں کے مزاج ہی کو پسند آتی ہے۔ اس کا کیا علاج کہ ہمارے معاشرے کے بیشتر لکھنے والے اور پڑھنے والے بھی اسی ذہنی دور میں سے گزر رہے ہیں۔

اب یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد کیا لکھوں؟

تم چھاپ تو دو گے لیکن محض چھپوانے کے لیے لکھنا نہیں چاہتا۔ اس خیال سے بھی کتراتا ہوں کہ حب الوطنی اور اس طرح کے کسی متعلق جذبے کو مذاق کے پہلو میں دیکھا اور بوسیدہ پاکیزگی کا غلاف اٹھانے کی کوشش کی تو "کمیس پاس" ہوگی۔ چیچے کے طور پر ادب ہوتا تو ٹھیک تھا بلکہ ایسی چیز بہت اچھی ہوتی ہے ادیبوں کے لیے۔ خیر فرصتی ناما کما ہی کر لکھ سکتا ہوں۔ طویل ٹیلیفون پر اس خط کا جواب دو۔

تمہارا ضیائی الدین

۲۱ جولائی ۲۰۰۳ء

برادر مکرم جناب محمود ہاشمی! السلام علیکم

آپ کی بے حد دلچسپ کتاب "یہ شاعر و افسانہ نویس" بہت شکریہ۔ آپ نے تبصرے کی فرمائش کی ہے۔ میں شرمندہ ہوں کہ تبصرہ نگاری مدت ہوئی چھوڑ چکا ہوں۔ دوسروں کے لکھے ہوئے تبصرے مجھے پسند نہیں آتے ورنہ میں کسی سے لکھوا بھی لیتا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ "شب خون" میں تبصرے بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ اور جو چھپتے ہیں وہ بھی میں بہت کاٹ چھانٹ کر اپنے مطلب کا بنا لیتا ہوں۔

آپ کی کتاب پڑھ کر مجھے بہت مزا آیا۔ ظاہر ہے کہ کتاب کا عطر وہ مضامین ہیں جو آپ نے سن چالیس کی دہائی میں لکھے تھے۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا اور مجھے نئے ادب کے معاملات اور ترقی پسند ادب کے آغاز کے عہد کا حال کئی سال بعد کتابیں پڑھ کر معلوم ہوا۔ اس وقت تک فضا تھوڑی بہت بدل چکی تھی اور دریافت اور تفہیم جوئی کا وہ ماحول نہ رہا تھا جس کا انعکاس آپ کے مضامین میں نظر آتا ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر وہ ساری عہد ذہن میں زندہ ہو جاتا ہے۔ مجھے تو ایک عجیب سا احساس ہوا کہ راشد، میرا جی، محمد حسن عسکری وغیرہ جن کا پیکر میرے ذہن میں دیوقامت ادیبوں کا ہے آپ کے مضامین میں نوآمدہ اور تجربہ کوش تھوڑے بہت لڑکھڑاتے ہوئے لکھنے والوں کی طرح چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ جہاں تک سوال آپ کے فیصلوں کا ہے تو آپ کی بیشتر باتیں (خاص کر محمد حسن عسکری کے افسانوں کے بارے میں) آج بھی صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرے چھوٹے بڑے معاصروں مثلاً اختر الایمان وغیرہ کے بارے میں آپ کے تاثرات اور فیصلے مستقبل بینی کا حکم رکھتے ہیں۔

چونکہ آپ نے یہ مضامین مجموعی صورت حال پر تبصرے کی شکل میں لکھے تھے اس لیے ان میں فیصلے اور دوٹوک رائے کا عنصر نمایاں ہے۔ تجزیہ کی لے دھیمی ہے اور یہ ایک طرح سے مناسب بھی ہے۔ لیکن اکیسویں صدی کے ادب کے بارے میں آپ کی رایوں میں کچھ ایسی عمومیت ہے جو فیصلے کی کاٹ کو کند کر دیتی ہے۔ یہ بات بہت دلچسپی کی مظہر ہے کہ اس مضمون میں بھی آپ کی نثر کا اسلوب پہلے ہی کی طرح شگفتہ اور اس کا آہنگ پہلے ہی کی طرح رواں ہے۔ فرق یہ ہے کہ ساٹھ سال پہلے کے لکھے ہوئے مضامین میں آپ کے مطالعے کی وسعت قدم قدم پر نمایاں ہے لیکن زیر بحث مضمون میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ آپ نے چند ہی تحریروں اور کتابوں کے مطالعے کو اپنے فیصلے کی بنیاد بنایا ہے۔ بہر حال یہ تو پھر بھی ممکن ہے کہ آپ کی پیشین گوئیاں صحیح ثابت ہوں۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ کل ہی آپ کا زر سالانہ وصول ہو گیا ہے۔ میں آپ کا ممنون ہوں۔

شمس الرحمٰن فاروقی

برادرم ہاشمی صاحب..... السلام علیکم

حسب ارشاد (اور حسب وعدہ) خط ارسال ہے۔ گو دو حرفی ہے۔ عرض ہے کہ میں آپ کے لیے اٹلی (روم) ہالینڈ، لندن اور نیویارک ان چار مقامات پر ("یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان" کے مصداق) صحیح قسم کے تعارفی اور سفارشی خط لکھ سکتا ہوں۔ اٹلی میں اشفاق احمد جو آزاد ریڈیو میں تھے اور ایک کتاب "ایک محبت سو افسانے" کے مصنف ہیں اردو ریڈیو کا کام کرتے ہیں۔ ہالینڈ میں (ہیگ) اردو کا پروگرام بھی نشر ہوتا ہے اور انہیں اردو داں حضرات کی سخت ضرورت رہتی ہے لیکن ان دونوں مقامات پر دام قدرے کم ملتے ہیں۔ (مجھے کچھ نہیں ملا تھا لیکن مطلب یہ نہیں کہ آپ کو بھی نہ ملے) رہا لندن وہاں اعجاز اگر کام کر سکتا ہے تو آپ کیوں نہ کریں۔ میں وہاں اکثر و بیشتر افراد کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ خدا رواداری سے قبل بھی لکھوں گا بعد میں بھی اور پھر لکھتا رہوں گا۔ پہلے تو یار لوگ وہاں ہزار بارہ سو (روپیہ پاؤنڈ نہیں) ماہوار دیتے تھے لیکن اب ذرا مشکل ہے۔ پھر بھی آپ ایسے صاحب فن اور صاحب کمال کے لیے مہینے میں دو صد روپیہ بنا لینا مشکل نہ ہونا چاہیے۔ اگر آپ نیویارک کا رخ کریں تو وہاں وائس آف امریکہ میں اردو سیکشن میں آپ دو صد ڈالر ماہوار ضرور بنا سکتے ہیں۔ مجھے آپ کی دعا سے وہاں کچھ لوگ خوب جانتے ہیں اور میری سفارش کو قبول کرنے میں انہیں باک نہ ہوگا۔

اچھا اب یہ لکھیں کہ آپ جانا کہاں چاہتے ہیں اور کتنے عرصے کے لیے۔ کس ضمن میں اور اپنی پونجی کتنی ہے۔ آئندہ کے ارادے کیا ہیں۔

تفصیل بھجوایئے۔ تفصیلی جواب لیجیے۔ وعدہ ہے پورا ہوگا۔

کوئی مضمون انگریزی میں آزاد کشمیر کے بارے میں تصویروں کے ساتھ تیار کر لیں گے؟

محمود نظامی

۱۷ دسمبر ۱۹۵۲ء لاہور

جان آذر

یقین کرنا تمہیں خط تو ولایت کے پتے پر ہی لکھ رہا ہوں مگر جانے کیوں رہ رہ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ تم پردیس میں نہیں ہو۔ کنار کی بستی میں نہیں گئے ہو بلکہ وہی اپنی سوہنوں کی بستی پونچھ ہٹس میں ہو۔ جہاں سے تم نے مجھے اکثر خط لکھے ہیں۔ اور جس جگہ کے بارے میں تمہارا اپنا عقیدہ یہ ہے کہ یہ چھٹیاں گزارنے کے لیے سارا جہاں تفریح طبع کے سامان کی خاطر کسی ایسی جگہ جائے جہاں یہ سب کچھ مہیا ہو تو جائے مگر تمہارے لیے بس اگر کوئی گوشہ ہے تو پونچھ ہٹس ہی ہے اور بس۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پونچھ ہٹس ایبٹ آباد سے بھی بازی لے گیا ہے۔ جو جگہ کبھی تمہارا ایمان اور دل و جان ہوا کرتی تھی۔ بہر حال تم ابھی پونچھ ہٹس میں ہو۔

تو کہو..... کیا حال ہے؟ کیسے گزر رہی ہے؟ تو کیا واقعی قدم بقدم

پر ہوش و ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ اور ہر جگہ تمہیں بٹنا پڑتا ہے؟ تم نے لکھا ہے کہ تمہیں وہاں "سونا سونا" کہ محسوس ہوا ہے کہ میرے لیے وہاں بڑے میدان ہیں۔ کیا واقعی؟ اگر ہیں تو وہ میدان کس نوعیت کے ہیں؟ کچھ اپنی بھی دلچسپی کرڈالو۔ اور کچھ ہماری بھی ڈھارس بندھوا ڈالو کیونکہ جیسا کہ تم جانتے ہو کہ باعث میاں سب یار بیٹھے ہیں۔

ہاں میں نے تمہارا سلام پہنچا دیا ہے۔ باقی تمہاری ہاتھ کی لکیروں کے بارے میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ یہ ضروری امر ہے کہ لکیروں کا رُخ بالکل دوسری طرف ہو چکا ہو۔ جان من.... میں اس معاملے میں بالکل "پرنسی" ہوں۔ کیونکہ اس قصے میں آپ جائیں جن کی لکیریں ہیں یا وہ جائیں۔ جو رُخ بدلنا جانتے ہیں.... میں تو یہی کر سکتا ہوں کہ آپ کا سلام اُن کو اور اُن کا سلام آپ کو پہنچا دوں۔ تو لو اُن کا سلام بھی لے لو۔ اور کہو

یار.... تمہارے اس قسم کے مختصر سے خط مجھے مزا نہیں دیتے میں جہاں تک افسانہ یا کہانی کا تعلق ہے مختصری پسند کرتا ہوں مگر خطوں کے معاملے میں بالکل دگر پسند رکھتا ہوں۔ یعنی طویل۔ کو میں خود اس وقت تمہیں مختصری لکھ رہا ہوں لیکن "خفا" شاید ہے وہ اس لیے کہ ہو سکتا ہے تمہیں طویل مختصر خطوط ناپسند ہوں۔ پھر وہی پسند اور ناپسند والا قصہ۔ یقین کرنا یہاں بے حد مشکل گزر رہی ہے میرے لیے کچھ ضرور کر ڈالو۔ تمہیں ساری عمر دعائیں دیا کروں گا۔ اور ہاں تمہارے "بچوں" کو بھی۔ سناؤ تمہارے بڑی بیٹی والے قصے کا کیا ہوا؟ بھئی بڑی بیٹی کی ہوا نہیں۔ اپنے متعلق مفصل لکھو تا کہ مجھے تسلی ہو۔ ورنہ مجھ کو تمہاری فکر کھائے جا رہی ہے۔ بچ ہو سکے تو اپنی تازہ ترین فوٹو بھیج دینا۔

اور ہاں۔ اگر کسی رسالے یا کتاب یا کسی دیگر شے کی ضرورت ہو تو بلا جھجک لکھو۔ میری "حیثیت" ہوئی تو ضرور بھیج دوں گا۔ شہاب کبھی کبھی ملتا ہے یار بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ اور کیا لکھوں۔ بس اب تم لکھو۔ اور اس کے بعد تم دیکھنا میں تمہیں کس مزے لے کے ساتھ لکھتا ہوں۔

تمہارا اپنا آذر زوبی

دارلکی لاہور

محترم! سلام مسنون

آپ کا مفصل گرامی نامہ ملا تھا۔ شکر گزار ہوں۔ آپ کو اپنے اس خط کی اشاعت پر شکوہ اور شکایت ہے لیکن مجھے تو مسرت اور خوشی ہی ہوئی تھی۔ ہے نا عجیب بات!

لہٰذا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہم دونوں مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے ایک ہی بات کو جانچتے ہیں۔ اب بھی دل چٹکیاں لے رہا ہے آپ کا یہ خط بھی چھاپ دوں جس میں لکھا ہے کہ "کہیں میرا خط بھی نہ چھاپ دینا" ۔ پلٹے جانے دیا۔ آپ کو ستانے میں بھلا مجھے کیا ملے گا۔ اور پھر اتنے اچھے اور پیارے سے دوست کو.... استغفراللہ

گر آپ نے مجھے ابھی دونوں افسانہ بھیج دیا تو مجھ پر کرم ہو گا۔ احسان ہو گا۔ ورنہ خفا ہو جاؤں گا۔ لڑوں گا۔ ان دونوں صورتوں میں کونسی بات دل کو بھائی؟ ذرا مجھے اطلاع بھیج دیجئے گا تا کہ اسی نوعیت کی تیاری شروع کر دوں۔ اشفاق صاحب کا افسانہ اس لیے پچھلی مرتبہ شامل نہ ہوا تھا۔ انہوں نے ذرا نخرے کیے تھے۔ اور مجھے ان کے اس رویے سے دوری کی بو آئی۔ اس لیے میں ان سے ذرا سا خفا ہو گیا تھا۔ یہ میں نے بہت ہی بُرا کیا تھا۔

آپ کا محمد طفیل

محترمی و مشفقی محمود ہاشمی صاحب!

تقریباً پچاس سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا' جب میں نے ایس۔ پی کالج سری نگر میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا اور اسی زمانے میں کالج میگزین اور دوسرے رسائل کے ذریعے آپ سے متعارف ہوا۔ کنول نین پرواز کو بھی اسی زمانے سے جانتا ہوں۔ یقین جانیے آپ کی نگارشات سے میں متاثر ہوا اور مجھے اردو میں لکھنے کی تحریک ملی۔ اس کے بعد میں برابر لکھتا رہا مگر آپ سے کوئی رابطہ قائم نہ کر سکا۔ برصغیر کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے اتھل پتھل پیدا کی' اور کتنے خواب بکھر گئے' اتنے عرصے کے بعد آپ کا خط پا کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ میں صحت کی خرابی کے باوجود جواب لکھ رہا ہوں۔

جہات میری اور میری بیوی مصرہ مریم کی نگرانی میں چار سال تک باقاعدگی سے نکلتا رہا لیکن اب تاخیر کی زد میں آ رہا ہے' حالات کی خرابی' بیماری' زوالِ عمر اور علالت وغیرہ اس کی تاخیر کے اسباب ہیں پھر بھی شوق فرماوں اسے زندہ رکھنے پر مصر ہے۔ اس کے دو شمارے بھجوا رہا ہوں۔ نیا شمارہ کمپیوٹر ٹائپنگ کے لیے دیا ہے۔

کنول نین پرواز کو میں نے اپنی تازہ تصانیف کے علاوہ کتاب نما (دہلی) کا "حامدی کاشمیری نمبر" بھی بھیجا تھا۔ انہوں نے آپ کو صرف "اکتشافی تنقید کی شعریات" دی ہے۔ ادھر میرا چھٹا مجموعہ کلام "خواب رواں" چھپ کر آ گیا ہے اور "غالب' جہان دیگر" غالب پر میری تیسری کتاب ہے' یہ دونوں کتابیں آپ کو بھجوا رہا ہوں۔ عطیہ خان کے لیے خط اور مجموعۂ شعر بھی حاضر ہے۔ انہیں پہنچانے کی زحمت کیجئے گا شکریہ

ایک گزارش: جس زمانے میں آپ سری نگر میں تھے' اس وقت کی ادبی فضا اور ادبی شخصیات کے بارے میں اپنے تاثرات لکھ کر بھیجئے گا' اگر آپ اسے مضمون کی شکل میں لکھیں گے تو اسے جہات میں شامل کیا جا سکتا ہے' آپ چاہیں تو اسے مختصراً بھی لکھ سکتے ہیں' میں اپنی خود نوشت میں اس سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔

حامدی کاشمیری

# ثنائے سرورِ کائنات

عبدالعزیز خالد(مرحوم)

اے کہ تُو "احمد" انجیل و "وَحید" تورات
کس قلم کار کو یارا کہ لکھے تیری صفات؟

بسکہ اُمّت کو کرے آتشِ دوزخ سے تو دُور
تجھے "حاشِد" بھی پکاریں مرے مدّاحِ ثقات

جعفل و جامع و جواد و حلیم و حمّاد
راشد و صاحبِ ارشاد وَلیِ حُسنات

حاتمِؔ، ہاشمی و حرزو حبیب و حرمی
مُحَمّا و مسیحا و رفیع الدرجات

صاحبِ معظَرِ مشہود و مقامِ محمود
صادق و اصدق و مصدوق و مصدّق تری ذات

تیرا ہر قول و عمل تابعِ مرضاتِ اللہ
کرے حال میں تو ذاتِ احد کا اثبات

بُت پرستوں کو کرے قائلِ یکتائیِ رب
مثلِ "معمارِ حرم" سرشکنِ لات و منات

بخش کر معرفتِ نفس بشر کو توڑے
سحرِ سالوس و اساطیر و طلسمِ طامات

اور اوہام پرستی کو اکھیڑے جڑ سے
کہ ہے ادراکِ حقائق ہی سروبرگِ حیات

تیری صحبت سے ہوئے بہرہ ور ذوقِ جہاد
زندگی کو جو سمجھتے تھے کتابُ الغزلات

تُو ہے کہسار تجھے کون ہلا سکتا ہے؟
زندگانی ہے تری سلسلۂ صبر و ثبات

روح کے سوت کھلیں فیضِ نظر سے تیرے
اور سینوں سے دُھلے گردِ شکوک و شبہات

کون ہے تیرے سوا کاشفِ سرِ مکتوم؟
مہرباں تیری طرح کس پہ مجیب الدعوات؟

مثلِ آوازِ جرس وحی کا ہوتا ہے نزول
نکلیں بے ساختہ جب منہ سے الوہی کلمات

ایک اُمّی کو کیا مُصحفِ ناطق کس نے؟
بولِ اس کے بنے کس خفیہ عمل سے آیات؟

مثلِ یزداں تُو بھی ہر آن نئی شان میں ہے
روز افزوں ہیں مراتب ترے، تیرے درجات

ہے تری مِلکِ ہمیں مملکتِ دانش ودیں
سرورِ ہر دوسرا، تاجورِ موجودات

روز افزوں ہیں بہ اقصائے جہاں آپ سے آپ
تیرے آثار معارف ترے، تیرے اثرات

تجھ سے اجرامِ فلک کسبِ ضیا کرتے ہیں
اے کہ تو مرکزِ لمحاتِ سراجِ مشکات!

تُو ہے پیغمبرِ کُل ..... کافۃً للناس
حال و مستقبل و ماضی پہ تیرے احسانات

تُو تلاوت کرے جس وقت بآوازِ بلند
جوق در جوق تجھے سننے کو آئیں جنّات

صاحبِ بُردِ یمانی ہے تُو اے مُزّمّل!
مجھ سے ملھم میں کہی رکنِ یمانی نے یہ بات

جس کو روضے کی ملی خدمتِ جاروب کشی
راکبِ مرکبِ ایّام ہے وہ خوش اوقات

بول آہستہ کہ آرام میں آئے نہ خلل
اس ادب گاہ میں مطلوب ہے غضِ اصوات

ارتعاش اس کا کیا میں نے بھی محسوس اب تک
مُرتعش ہے ترے خطبے سے فضائے عرفات

یا حبیبی! تری اُمّت کا ہر اک فرد تجھے
مُتّصل بھیجے تحیات و سلام و صلوات

باندھے رکھتا ہوں میں احرامِ محبت ہر دم
نہیں معلوم مجھے کیا ہیں حدودِ میقات!

تپشِ دل کو کروں کیسے بیاں؟ قاصر ہیں
مرے جذبات کے اظہار سے میرے ابیات!

## نعت

حصیر نوری(کراچی)

کیا اور کیجئے شرح و وضاحت حضور کی
اللہ کی کتاب ہے سیرت حضور کی

ان بندگانِ حق کے مراتب نہ پوچھئے
جو لوگ کر رہے ہیں اطاعت حضور کی

ان کی نظر میں کچھ نہیں دنیا کی راحتیں
جس دل میں بس گئی ہو محبت حضور کی

دنیا ہے بے شمار خلائے بسیط میں
کس پر نہیں ہے دوستو رحمت حضور کی

اے کم نظر بغیر محمد خدا نہ ڈھونڈ
اس راہ میں ہے شرط قیادت حضور کی

پڑھئے کتاب سیرتِ طیب کو غور سے
فکر و نظر تمام ہے ثبت حضور کی

مقبول کاش ہو یہ دعا میری اے حصیرؔ
محشر میں ہو نصیب شفاعت حضور کی

O

## نعت

رعنا پروین(اسلام آباد)

ہاتھ میں پھول نگاہوں میں ستارے ہوں گے
وہ جو آقا کے درِ پاک پہ آئے ہوں گے

ہر گھڑی چوم کے گزرے گی ہوائے طیبہ
کتنے پر کیف وہ لمحات ہی سارے ہوں گے

سبز گنبد پہ کھڑے ہوں گے جھکائے سر وہ
دل نے صد اشکِ ندامت کے بہائے ہوں گے

حوضِ کوثر پہ کھڑے ہوں گے شفاعت کرنے
اپنی امت کے فقط آپ سہارے ہوں گے

لاج رکھ لینا خدایا میری روزِ محشر
اپنے آقا بھی وہاں شان سے آئے ہوں گے

O

"چہارسُو"

# سخنِ معترٰی

## سید مشکور حسین یاؔد (لاہور)

ہم نے معمول کو دیکھا ہے خلافِ معمول
کیا بتائیں یہاں کیا کیا ہے خلافِ معمول

اپنے معمول کے کشکول میں کس کو ڈالیں
اور تو اور یہ دُنیا ہے خلافِ معمول

یارو معمول کا دیدار کریں تو کیسے
جس کو دیکھو وہی لگتا ہے خلافِ معمول

کوئی معمول کی تصویر اُتارے تو ہے بات
صرف تصویر میں آتا ہے خلافِ معمول

خود کو ہم کس جگہ رکھیں یہ بہت مشکل ہے
جتنا معمول ہے اُتنا ہے خلافِ معمول

بیش و کم کا یہاں اندازہ لگانا ہے محال
ذرّہ معمول ہے صحرا ہے خلافِ معمول

اس حقیقت پہ کبھی غور کیا ہے مشکوؔر
صرف معمول ہی ہوتا ہے خلافِ معمول

O

## محسن احسان (پشاور)

ہر ایک شخص ہے مایوس و آبدیدہ بہت
کہ ہے دیارِ دل آرا کماں کشیدہ بہت

دکانِ عشق میں ہر مال تھا مگر ہم نے
بس ایک جنسِ ہوس تھی جسے خریدا بہت

ہم ایک گنبدِ بے در کی خواب گر مخلوق
سارا علم و عمل کم، مگر عقیدہ بہت

عجب نشاطِ اذیت میں مبتلا ہیں کہ ہم
کرم رسیدہ بہت آشنا گزیدہ بہت

جہاں میں کچھ بھی نہیں ہے بجز محبت و مہر
یہی سمیٹ کر دیتا ہے غم رسیدہ بہت

قفسِ قیام نے شہ زور کر دیا اتنا
پہنچ گئے سرِ افلاک پَر بریدہ بہت

مرزا مزاج غزل آشنا مگر محسنؔ
پسند ہے مرے احباب کو قصیدہ بہت

O

## مظفر حنفی (دہلی بھارت)

وہ مہرباں مرے دل کی خبر نہیں رکھتا
پرائی چیز پہ میں بھی نظر نہیں رکھتا

عجب نہیں ہے کہ رحمت برس پڑے مجھ پر
گناہگار ہوں دامانِ تر نہیں رکھتا

مرا مزاج ہے منزل سے خوف کھاتا ہوں
مسافرت میں قدم پھونک کر نہیں رکھتا

چھڑی ہوئی ہے وہاں جنگِ شبنم و خورشید
گلاب اتنی متاعِ شرر نہیں رکھتا

اٹھائے پھرتے ہو نیزے پہ تم یہ کس کا سر
دلیر وہ ہے جو شانے پہ سر نہیں رکھتا

تمام شہر میں مشہور ہے ہمارا گھر
کہ سر پہ تہمتِ دیوار و در نہیں رکھتا

غزل تو میں بھی مظفرؔ نفیس کہتا ہوں
مگر دماغ کبھی عرش پر نہیں رکھتا

## شبنم شکیل (اسلام آباد)

چلتی رہتی ہے تسلسل سے جنوں خیز ہوا
جلتا رہتا ہے مگر پھر بھی کہیں ایک دیا

یاد آتا ہے بہت ایک پرانا آنگن
جس میں پیپل کا گھنا پیڑ ہوا کرتا تھا

اشک بہتے ہیں تو بہتے ہی چلے جاتے ہیں
روک سکتا ہے بہاؤ بھی کوئی دریا کا

رات ہم ایک غزل لکھتے ہوئے روتے رہے
بعض لفظوں کو تو اشکوں نے مٹا ہی ڈالا

پھر سے ٹکرا گیا مجھ سے ہی مرے دل کا مفاد
پھر سے برپا ہوا اک معرکۂ کرب و بلا

کسی محفل میں کوئی شخص بہت کھل کے ہنسا
واقعہ یہ تو عجب آج یہاں پیش آیا

**انور سدید (لاہور)**

اس کی صورت جو دھیان میں آئی
زندگی . . . . . امتحان میں آئی

چیخنے لگ گئے کواڑ تمام
کیا بلا ہے مکان میں آئی؟

جتنی نفرت تھی اس کے باطن میں
وہ ہزل کی زبان میں آئی

کل نہ میں اس طرف سے گزروں گا
پیش گوئی یہ کان میں آئی

صبحدم پھول جو کھلے ہیں سدیدؔ
کیسی رونق ہے لان میں آئی

**جلیل عالی (راولپنڈی)**

ذہن و دل کے بیچ اب کے اک عجب دیوار ٹھہری
دوستی کا ذکر ہی کیا بات بھی دشوار ٹھہری

وقت کی اک ضرب سے سب کھل گئے اپنے پرائے
ہر کسی دل کی سیاہی سرخیٔ اخبار ٹھہری

اب تو نقشہ ہی جدا ہے وہ زمانہ بھی رہا ہے
زندگی کی ہر گھڑی جب عید کا تہوار ٹھہری

تیری خاموشی سے اس کے اور افسانے بنیں گے
بے سبب لوگوں کے دل میں بات جو اک بار ٹھہری

مدتوں کے ہم نشیں بھی کٹ گئے اک دوسرے سے
کس قدر بے رحم عالیؔ سوچ کی تلوار ٹھہری

**پروفیسر حامدی کاشمیری (سری نگر)**

معدن لعل و جواہر رہ گئے
کالے پانی میں جزائر رہ گئے

کون دے گم گشتہ ساحل کا پتہ
بحر اخضر میں وہ طائر رہ گئے

بے خطر پانی میں اترے تہہ شناس
ساحلوں پر اہل ظاہر رہ گئے

سب عقیدت مند رخصت ہو گئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے

راہب خورشید رو ہے منتظر
کن سیہ راہوں میں زائر رہ گئے

وہ محافل، وہ ملاقاتیں کہاں
ملنے کی جا گہ مقابر رہ گئے

O

**جاوید شاہین (لاہور)**

بسایا تھا کہیں اک شہرِ خواب آہستہ آہستہ
مگر وہ ہو رہا ہے اب خراب آہستہ آہستہ

بتاتی ہے بس اتنا ہی طوالت زندگانی کی
کہ جیسے پڑھ رہا ہوں اک کتاب آہستہ آہستہ

اُسی سے اس کے بارے میں کوئی بات پوچھی تھی
دیا تفصیل سے اس نے جواب آہستہ آہستہ

محبت کے زمانے ہی کا کوئی جرم ہے جس کا
چکاتا رہتا ہے یہ دل حساب آہستہ آہستہ

سمجھ سے بالا منظر ہے دعا کی باریابی کا
کہ کھلتا جا رہا ہو کوئی باب آہستہ آہستہ

خرامِ موج بھی کم ہے ہوا کا زور بھی کم ہے
مچلتا ہے سرِ دریا حباب آہستہ آہستہ

نواحِ شہرِ دل میں کچھ نشیبی بستیاں بھی ہیں
جو آتی جا رہی ہیں زیرِ آب آہستہ آہستہ

قریبِ آخرِ شب اک بڑے ہموار زینے سے
اترتا آ رہا ہے ماہتاب آہستہ آہستہ

بتا صیدِ جہانِ خواب! پھر تیرا بنے گا کیا؟
حقیقت بن گیا گر یہ سراب آہستہ آہستہ

مسلسل نیند کی حالت میں جو ہیں ان دنوں شاہیںؔ
انہیں قریوں پہ اترے گا عتاب آہستہ آہستہ

**ڈاکٹر صابر آفاقی (مظفرآباد)**

زمیں روتی رہی پر آسمانوں سے نہیں اُترے
فرشتے کہکشاں کی زرد بانوں سے نہیں اُترے

تمہارے نام کے کتبے اتارے ایک اک کر کے!
تمہارے حسن کے چرچے زبانوں سے نہیں اترے

فریبِ صبحِ کاذب تم نہ کھانا قافلے والو
ابھی تک دیکھ لو پنچھی ٹھکانوں سے نہیں اُترے

رسالے نفرتوں کے اب سرِ بازار بکتے ہیں
صحیفے عشق کے لیکن زمانوں سے نہیں اُترے

ہزاروں بارشیں آئیں ہزاروں آندھیاں اٹھیں
ہمارے نام کے کتبے چٹانوں سے نہیں اترے

گلی کوچوں میں وہ محشر بپا تھا زہد والوں کا
مکیں فاقوں نے مارے پر مکانوں سے نہیں اُترے

یہ تیری بھول تھی جو اسلحہ تن سے اتارا ہے
ابھی تک ترے دشمن تو مچانوں سے نہیں اُترے

جو تھا بارِ گراں اک زندگی کا سر سے اترا ہے
جنوں کے بوجھ لیکن میرے شانوں سے نہیں اُترے

وہ دھرتی کے مسائل جان ہی سکتے نہیں صابرؔ
جو دھرتی پر کبھی آئینہ خانوں سے نہیں اُترے

## ڈاکٹر خالد حمید شیدؔا (لاہور)

ہے نہ معلوم کسی کو کہاں رہتا ہے
اس کی قربت کا مگر دل کو گماں رہتا ہے

پردہ داری کا اسے شوق ہے ایسا دیکھو
دل میں رہ کر بھی وہ آنکھوں سے نہاں رہتا ہے

یوں تو رہتے ہیں جواں سب ہی جواں سالی میں
اس کو دیکھو کہ وہ پیری میں جواں رہتا ہے

ہو کے رہتا ہے مکیں کون و مکاں ہی میں نہیں
لامکاں میں بھی بنا کر وہ مکاں رہتا ہے

دل سے ہوتا نہ جدا ہے کبھی عشاق کے وہ
جائے بھی چھوڑ کے تو بن کے نشاں رہتا ہے

دل کو روشن کبھی کرتا ہے تجلی سے اگر
بن کے وہ داغ بھی شعلہ بھی وہاں رہتا ہے

عقل کی چشم سے گرچہ وہ نہاں ہے شیدؔا
آنکھ کے سامنے دل کی وہ عیاں رہتا ہے

O

## ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہؔ (دہلی بھارت)

اے دلِ ناداں، تجھے ہر عہد میں دھوکا رہا
چمکے پلکوں پر ستارے، تُو کہیں کھویا رہا

دفعتاً آگیا، جب کبھی ماضی کا خیال
بے سبب، اے یار مرے، دیر تک روتا رہا

اوؤ اب میرا جانا، بھی نہیں ہوتا کہیں
اتفاقاً جانا پڑا، جب بھی وہاں تنہا رہا

کس کو فرصت ہوتی ہے، میری جانب دیکھے کوئی
میں جہاں، جس بزم میں، جب تک رہا، تنہا رہا

گم ہوئیں وہ ہنستی آنکھیں، جن سے نسبت تھی کبھی
دستکیں دیتا رہا میں، بند دروازہ رہا

دل کی رنجوری کا عالم، اے میرے تشنہؔ نہ پوچھ
رات بھر میرا گذشتہ، مجھ کو تڑپاتا رہا

O

### غالب عرفان (کراچی)

اُس کو بھی خوش گمان رکھنا ہے
مجھ کو بھی اپنا مان رکھنا ہے

دشتِ گمنام میں سفر کے لئے
خود ہتھیلی پہ جان رکھنا ہے

اُس کی نظروں میں عشق کا مطلب
حسن کو حکمران رکھنا ہے

سانس اکھڑی ہوئی سہی لیکن
لحن میں لمبی تان رکھنا ہے

سچ کی تکلیف وہ گواہی میں
خود کو ہی درمیان رکھنا ہے

ساتھ میرا، زمین دے یا نہ دے
ہم سفر آسمان رکھنا ہے

اُس کے لہجے میں اشتعال سہی
اپنے بس میں زبان رکھنا ہے

راہِ عرفاں کی دھوپ کے نیچے
وقت کا سائبان رکھنا ہے

O

### عشرت ظفر (کانپور، بھارت)

عجب ادا سے وہ تیغ ادا نکلتی ہے
گلوئے عشق کے لب سے دعا نکلتی ہے

وہ میرے قتل کو شمشیر جب اٹھاتا ہے
لہو کی موج سے موج حنا نکلتی ہے

پھر اس کے بعد زمیں پر قدم نہیں رکھتی
صبا جو پھول کی خلوت میں جا نکلتی ہے

وہ کائنات کہ جس میں ہے بود و باش مری
وہ کائنات تہہ نقش پا نکلتی ہے

دیارِ خاک میں ہر رات جانے کون سی شے
دریدہ پیرہن و بے قبا نکلتی ہے

وہ چشم ناز غزالی گریز پا ہی سہی
کبھی کبھی مری جانب بھی آ نکلتی ہے

افق پہ عشرت ابھرتا ہے یوں بھی وصل کا چاند
پری سی شے کوئی شہر کشا نکلتی ہے

O

**پروفیسر خیال آفاقی (کراچی)**

جب آ رہی ہے دما دم صدا کہ میں ہوں نا
تو پھر یہ کیسی چلی ہے وبا کہ میں ہوں نا

پکارتی ہے اُدھر دشت کی ہوا مجھ کو
اِدھر یہ کہتی ہے بادِ صبا کہ میں ہوں نا

بُلا بُلا کے پلاتا رہا وہ غیروں کو
میں اس کے پاس ہی کہتا رہا کہ میں ہوں نا

"ہے کوئی شہر میں بے گھر؟" پکار کر دیکھا
ہر اک مکان سے آئی صدا کہ میں ہوں نا

نہیں تھا کوئی بھی رنگِ خونِ دل لیکن
چہک کے بولا یہ رنگِ حنا کہ میں ہوں نا

ابھی لُٹاتے ہیں ہم کسی طرح سے اپنی جاں
کہے تو کوئی ذرا دلربا کہ "میں ہوں نا"

ہزار راستے روشن سہی مگر مجھ کو
پکارتا ہے ترا نقشِ پا کہ میں ہوں نا

کوئی بھی کام نہ آیا مرے کسی صورت
کہے نہ کوئی بھی بہرِ خدا کہ میں ہوں نا

میں تیرے شہر میں گمنام ہوں زمانے سے
کسے بتاؤں میں اپنا پتا کہ میں ہوں نا

خیالؔ کفر نہیں ہے تو اور کیا ہے پھر
ہر ایک بات میں کہنا ترا کہ میں ہوں نا

**ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بہار، بھارت)**

دہکتے گل سلگتی وادیوں کو کون دیکھے گا
چمن والو چمن کے وارثوں کو کون دیکھے گا

بڑی مشکل سے ہوتا ہے مقامِ شخصیت پیدا
پہاڑوں کے مقابل رائیوں کو کون دیکھے گا

مری ہر شام شامِ غم مری ہر صبح ویراں ہے
سرِ ماتم کدہ شہنائیوں کو کون دیکھے گا

بہت رنگین ہے یہ داستاں ایواں نشینوں کی
بھٹکتے دربدر صحرائیوں کو کون دیکھے گا

کوئی ٹوٹے ہوئے احساس کا ماتم نہیں کرتا
شکستِ دل تری تنہائیوں کو کون دیکھے گا

یہ اندازِ خود آرائی یہ رعنائی یہ بھولا پن
ہمارے بعد ان لالہ رخوں کو کون دیکھے گا

بہت بحرِ ادب کے آج بھی غواص ہیں عاشق
ترے فن کی مگر گہرائیوں کو کون دیکھے گا

O

**پروفیسر صدیق شاہد (شکوہر)**

مدتیں گزریں نہ اس سے کبھی دوچار ہوئے
ہے غلط یہ بھی کہ اک دوجے سے بیزار ہوئے

حال تو پوچھا کئے' پاس سے گو کچھ نہ دیا
اب مگر یہ بھی نہیں جب سے زردار ہوئے

غمِ ہجراں میں کبھی بات نہیں پوچھتے تھے
جشن میں وصل کے شامل درودیوار ہوئے

دلِ بے رحم میں کیا فصلِ محبت اُگتی
بیج ویرانے میں بوئے تھے' سو بے کار ہوئے

لاش تنہا ہی مروّت کی پڑی گلتی تھی'
ایک ہم تھے کہ وہاں جا کے عزادار ہوئے

ان کو کب تاب تھی' سرتابی کسی کی دیکھیں'
ہم نے شہ دی تو کہیں جا کے وہ ہموار ہوئے

تیرے وحشی کسی ہنگامے پہ آمادہ تھے
جسم پر زخم لئے رونقِ بازار ہوئے

وہ تو وہ ہیں' نہیں آرام سے میں بھی شاہدؔ
پیڑ جب سے مرے آنگن کے ثمردار ہوئے

O

**سید معراج جامی (کراچی)**

لوگ آتے ہیں مجھ کو سمجھانے
کس نے کیا کہہ دیا خدا جانے

ان سے واقف ہیں خوب دیوانے
لوگ کہتے ہیں جن کو فرزانے

اب سنبھلنا محال ہے ان کا
دار تک آ گئے ہیں پروانے

اپنے دل ہی کی جو نہیں سنتا
وہ بھلا میری بات کیا مانے

رات بھر شمع راہ تکتی رہی
جانے کس حال میں تھے پروانے

کھل کے کچھ لوگ سامنے آئے
آج ہم دوستوں کو پہچانے

کیسے ان سے نباہ کرتا ہوں
میرا دل جانے یا خدا جانے

آج انساں کی عظمتوں کے طفیل
کتنے آباد ہیں یہ ویرانے

کون بتلائے قاتلوں کا پتہ
اپنے چہروں کو کون پہچانے

لطف ملتا ہے کیا اجل کے ساتھ
زندگی اس ادا کو کیا جانے

نقش کعبہ نظر نہیں آتا
شہر میں اس قدر ہیں بت خانے

تم حقیقت شناس تھے جامیؔ
تم نے بھی گھڑ لیے ہیں افسانے

# درد

جتیندر بلو (لندن)

جہاں میں رہتا ہوں، اُس سڑک کے موڑ پر "جارج اینڈ ڈریگن" نام کا ایک کشادہ سا پب (Pub) واقع ہے جو گذشتہ سو برسوں سے زندہ وہاں کھڑا ہر راہ گیر کو اپنی تاریخی اہمیت کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ صدی کے سفر کے دوران زمانے بدلے، معاشرے بدلے، مالکان بدلے، پینے پلانے والے بدلے لیکن پب کا اندرونی ماحول اور بیرونی ساخت جوں کی توں قائم رہی۔ وہ گزرے زمانوں کی تہذیب، ثقافت اور طرزِ زندگی کا نمونہ بنا رہا۔ آگ کا بھاٹا وکٹورین عہد کا فرنیچر۔ شکار کھیلتے گھڑسواروں اور اُمرا کی تصویریں، جن میں اُن کے شکاری کتے (ہاؤنڈ ڈاگز) لومڑی (فاکس) کے تعاقب میں دوڑتے نظر آتے۔ ایک سنہری فریم کی تصویر میں کنگ جارج پنجم اور ملکہ میری کے روبرو ۱۹۱۱ء کے دلّی دربار میں ہندوستانی نوابین اور راجے مہاراجے سر جھکائے کھڑے تھے۔ چھت سے لٹکے ٹیوڈر عہد کے رنگدار لیمپ اور کونے کھدروں میں مصری، ہندوستانی اور افریقی نوادرات کے اعلیٰ نمونے سجے تھے۔ پب کی ہر دیوار نے سلطنتِ برطانیہ کا عروج اور زوال بھی دیکھ رکھا تھا۔ لیکن پب میں ہیجان زدہ موسیقی پیدا کرنے کا کوئی سامان موجود تھا اور نہ ہی وہاں جوان نسل کے چھوٹے بڑے گروپ کبھی دکھائی دیتے۔ ورنہ وہ اس قدر شور مچاتے ہیں کہ پب کی دیواریں بھی لرز اٹھیں۔ اور عمر رسیدہ لوگ کانوں پر ہاتھ دھرے کہیں اور جانے کی سوچیں لیکن "جارج اینڈ ڈریگن" پب کا سلسلہ ہی الگ تھا۔ شام ڈھلتے ہی وہاں بوڑھے بوڑھیاں، ادھیڑ اور ڈھلتی عمر کے لوگ اکثریت میں جمع ہو جاتے۔ کبھی کبھار ایسے بزرگ بھی دیکھنے میں آتے جن کی ٹانگیں قبر میں لٹکی ہوتیں اور وہ ویل چیئر (Wheelchair) پر بیٹھے بیئر کی ہلکی ہلکی چسکیاں بھرتے دبے دبے لہجے میں گفتگو کیا کرتے۔ میں نے سنا تھا اُس پب کے متعلق جوان طبقے کو کہتے سنا تھا کہ وہاں جا کر آدمی ایک ہی شام میں بوڑھا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا؟ بلکہ قبرستان میں اپنی قبر کے واسطے زمین تلاش کرتا پھرتا ہے۔

میں اُن دنوں نیا نیا مانچسٹر شہر سے لندن میں وارد ہوا تھا۔ یک و تنہا۔ میرے آگے پیچھے وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ کام سے فارغ ہو کر اکثر سوچتا کہ اب کہاں جاؤں؟ کہاں نہ جاؤں؟ کیا کروں اور کیا نہ کروں؟ شیطان کی آنت کی طرح پھیلے ہوئے شہر میں چند ہفتے گزار کر مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ بے گانگی، لاتعلقی، اکیلاپن اور تنہائی دولتمند معاشرے کی دین ہیں جو وقت رفتہ بوڑھی ہوش کو لا علاج امراض کی طرف دھکیلا کرتی ہیں اور وہ جلد یا بدیر اُن کا شکار بھی ہو کر رہ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ فیکٹری سے نکلنے پر آکاش کا رنگ بھی مجھے بدلا بدلا سا لگتا۔ شام کو رات میں تبدیل کرنا کٹھن مسئلہ بن جاتا۔ ایسے میں کئی بار میرے پاؤں اپنے بیڈ سٹر میں داخل ہونے سے پہلے "جارج اینڈ ڈریگن" سے ہو کر گزرا کرتے۔ میں پہلی بار وہاں گیا تھا تو چاروں طرف بوڑھے ضعیف اور قریب المرگ مرد اور عورتوں کو دیکھ کر بڑی الجھن ہوئی تھی۔ جی چاہا کہ اُلٹے پاؤں لوٹ جاؤں اور ادھر کا رُخ دوبارہ ہرگز نہ کروں۔ مگر اُن بوڑھی آنکھوں میں ہمدردی تھی، پیار تھا، اَن کہی کہانیاں تھیں۔ رویوں میں خلوص تھا۔ گرد وپیش نگاہ دوڑانے پر پتہ چلا کہ میں سفید فام طبقے کے درمیان واحد رنگدار شخص نہیں ہوں، بلکہ وہاں کوئی دوسرا شخص بھی موجود ہے جو ایک کونے میں اکیلا بیٹھا بیئر سے دل بہلا رہا ہے۔ اُس سے آنکھیں چار ہوئیں تو وہ مرجھایا پھول بن گیا۔ لیکن میں نے منہ پھیر لیا اور کاؤنٹر سے چھوٹی بیئر خرید کر اُسے مکمل نظر انداز کئے کچھ فاصلے پر اخبار کھول کر بیٹھ گیا۔ وہ شخص تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کھانستا رہا۔ لگا کہ وہ دانستہ کھانس کر مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے لیکن میں نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا۔ آدھی دنیا قانونی اور غیر قانونی طور پر دیکھ کر انگلینڈ پہنچا تھا۔ میری نظریں اخبار پر ہی جمی رہیں۔ لیکن دل میں کھد بد برابر جاری رہی کہ وہ شخص مسلسل مجھے گھورے جا رہا ہے اور وہ میری محبت کا خواہشمند بھی ہے۔ میں نے نظر بچا کر اُسے دیکھا تو وہ خود میں کھویا ہوا سگریٹ کے کش بے فکری سے لے رہا تھا اور دھواں چھت کی طرف چھوڑ رہا تھا۔ وہ عمر بہتر برس کا دبلا پتلا سا شخص تھا۔ گہرا گندمی مائل رنگ اپنی طرف کو کھینچا ہوا، پچکے ہوئے گال اور بڑی بڑی آنکھیں مگر اندر کو دھنسی ہوئیں۔ سالم سفید بال اور چہرے پر وقت کی جھریاں جو اپنی نا آسودگی کی داستان بیان کر رہی تھیں۔ اُس کا مکمل جائزہ لے کر گمان گزرا کہ ہو نہ ہو وہ شخص انڈیا سے تعلق رکھتا ہے اور ذات کا گجراتی ہے۔

اُس رات بستر پر دراز ہو کر جب میں نے آنکھیں بند کیں تو وہ بزرگ شخص اچانک کہیں سے نمودار ہو کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ میرے ضمیر نے لعنت ملامت کی کہ میں نے اُس بزرگ کی قدر کیوں نہیں کی؟ جبکہ اُس کی مسکراہٹ میں خلوص تھا، دعوت تھی، اپناپن تھا۔ پردیس میں اکثر اپنے لوگ اجنبیوں کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں۔ جیسے اُن کا اپنے بھائی بندوں سے کبھی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ پھر مجھ میں اور اُن لوگوں میں فرق ہی کیا ہوا؟ خیال آیا کہ اُس نے ضرور سوچا ہو گا کہ میں کس قدر مغرور شخص ہوں اور مجھے اپنی جوانی پر کتنا ناز ہے کہ میں کسی بوڑھے شخص کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتا؟ یہی سوچتے سوچتے میں نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔

اگلی شام میں جب میں اس ارادے کے ساتھ داخل ہوا کہ اگر وہ بزرگ وہاں موجود ہو تو میں ڈرنک خرید کر چپکے سے اُس کے قریب جا کر کھڑا ہو جاؤں گا لیکن چاروں طرف نگاہ دوڑانے پر بھی جب وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا تو خیال آیا کہ چلو کوتاہی ہوئی۔ ضمیر بھی صاف ہو گیا۔ نہ کوئی بوجھ نہ کوئی بندش۔ مگر ڈرنک خرید کر جب میں کاؤنٹر سے پلٹا تو میں نے اُس معمر شخص کو کل والی میز پر ہی بیئر پیتے اور سگریٹ پھونکتے ہوئے پایا۔ اُس نے مجھے اپنی میز کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو اُس کا چہرہ کل کی نسبت زیادہ روشن ہو گیا۔ وہ کرسی کے ہتھوں کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور سامنے کی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے بیٹھنے کی دعوت دی۔ تعارف ہونے پر میرا اندازہ درست ہی نکلا کہ وہ ذات کا گجراتی ہے اور پٹیل برادری سے تعلق رکھتا ہے۔ پتہ چلا کہ اُس کی پیدائش ملک یوگینڈا کے شہر کمپالا کی ہے۔ دو سو برس پہلے جب نوآبادیاتی انگریز اُس کے آباؤ اجداد کو ریل کی لائنیں بچھانے افریقہ لے گئے تھے تو اُس کے پرکھوں کو باقاعدہ روزی روٹی نصیب ہونے لگی تھی۔ پھر وہ لوگ وہیں کے ہو کر رہ گئے اور آہستہ آہستہ اُس زمین کا حصہ بن گئے۔ لیکن انہوں نے اپنی سنسکرتی، دھرم کرم، تیج تہوار، بھاشا اور پرمپراؤں کو برقرار رکھا کہ اُن کے بنا جیون گزارنا اُن کے لئے ممکن نہ تھا۔

"افریقہ بہت یاد آتا ہے مگر چھوڑنا پڑا۔"

وجہ میں جانتا تھا لیکن میں رتن بھائی کی زبانی سننا چاہتا تھا۔

"یوگینڈا کو انگریزوں سے آزادی ملی تو ملٹن اوبوٹے (Obote) پرائم منسٹر بنا۔ بعد میں وہ پریذیڈنٹ ہو گیا..... آدمی سیانا تھا۔ اُس کا ہم لوگوں کے ساتھ سلوک ٹھیک ٹھاک تھا۔ جانتا تھا اکانامی (معیشت) پر ایشیائی لوگ چھائے ہیں۔ مگر وہ تو دیش اور اپنے لوگوں کی بھلائی چاہتا تھا۔ بس۔"

"پھر؟"

"آگے کیا بتاؤں.... اُس کے بعد عیدی امین نے Coup کیا اور پریذیڈنٹ بن گیا۔" پھر وہ قدرے رُک کر بولا "سالا پاگل تھا۔ سمجھا پوری دُنیا اُس کے ہاتھ لگ گئی ہے۔"

ہم دونوں ایک ہی وقت پر ہنس دیے لیکن میں جلد ہی اُس سے الگ ہو کر عیدی امین کے بارے میں سوچنے لگا کہ وہ تو پیدائشی مینک (Maniac) تھا۔ زرخیز ملک کو اُس نے تباہ کر ڈالا اور آخر میں سعودی عرب میں پناہ لے کر گمنامی کی موت مرا۔

"آپ کو یہاں آئے تو عرصہ ہو گیا ہوگا؟"

"ہاں ں ں۔" اُس کی ہاں خاصی لمبی تھی۔ پھر وہ کچھ سوچتا ہوا چھت کو دیکھ کر بولا: "پریذیڈنٹ امین نے ہم لوگوں کو بہت تنگ کیا.... پوچھو مت.... تین مہینے کا وقت دے کر ملک چھوڑ دینے کا حکم جاری کر دیا.... ہم ایشیائی بہت پریشان ہوئے۔"

"اور آپ کو اپنے پریوار کے ساتھ یہاں آنا پڑا؟"

"ہاں ں ں.... اِس کے بنا کوئی چارہ نہ تھا.... پہلے سوچا اپنے باپ دادا کے دیش بھارت کو چلے جائیں۔ پر انڈیا کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ اُدھر جا کر ہم تنگ ہوتے.... اِسی کارن ہم انگلینڈ چلے آئے۔ اپنے زیادہ لوگوں کے پاس برٹش پاسپورٹ تھا۔"

ہم دیر تک خاموش رہے۔ اُس کا سگریٹ ختم ہو چکا تھا۔ پیکٹ کھول کر اُس نے مجھے سگریٹ پیش کیا۔ لیکن میں نے انکار کرتے ہوئے اُسے بتایا کہ لگاتار کھانسنے کے کارن ڈاکٹروں نے مجھے سگریٹ نوشی سے منع کر دیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ وہ سنجیدہ اور رنجیدہ ہو گیا۔ انتہائی اپنائیت اور پیار سے مجھ کو دیکھا۔ پھر آخرش چھت کو دیکھ کر بولا:

"کیا بتاؤں.... اِدھر جب ہم لوگ آئے تو میرے بچے چھوٹے تھے.... پر ایک بات ضرور بولوں گا.... میری پتنی بہت ہمت والی عورت تھی۔ وہ نہ ہوتی تو ہم سب برباد ہو جاتے۔ میں پروفیشنل اکاؤنٹنٹ تھا۔ پر میرے کو شروع میں اِدھر فیکٹری میں کام کرنا پڑا۔"

میں اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ میں بھی آپ کی طرح تعلیم یافتہ ڈگری یافتہ ہوں لیکن اِن دنوں فیکٹری میں دن رات کام کر رہا ہوں کہ میری بھی آپ کی طرح چند مجبوریاں ہیں جن کے سبب مجھ کو اپنے جیون کی راہ بدلنی پڑی۔ لیکن میں نے اُسے اپنی کوئی مجبوری بیان نہ کی اور خاموش رہا۔

"پر جلد مجھ کو اِدھر ایک بڑی کمپنی میں نوکری مل گئی.... کیا بتاؤں۔ کمانے والا ایک کھانے والے پانچ.... پر ہم میاں بیوی نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر بچوں کو پرائیویٹ اسکول میں لکھایا پڑھایا.... اب وہ سب اچھی پوزیشن میں ہیں اور اپنے گھروں میں رہتے ہیں۔"

"رتن بھائی۔ یہ آپ نے وہی کیا، جسے ماں باپ اپنا فرض سمجھ کر کیا کرتے ہیں۔ وہ اپنی اولاد کی بہتری کی خاطر خود کو بھی قربان کر ڈالتے ہیں۔"

لیکن وہ اپنی تعریف سن کر ذرا بھی خوش نہ ہوا۔ بلکہ اُس کے چہرے کی جھریاں مزید گہری ہو گئیں۔ خیال آیا کہ وہ اپنے بچوں کو بہت مِس کر رہا ہے جو ہزاروں میل دور قیام پذیر ہیں۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ بیئر کے گلاس کی طرف اُس کی توجہ کم ہے جبکہ سگریٹ کو وہ زیادہ ترجیح دے رہا ہے۔ میں اُس کے متعلق قیاس آرائی کر ہی رہا تھا کہ وہ پوچھ بیٹھا "تمہارے گھر والے سب یہاں ہیں ناں ں ں؟"

یہ سننا تھا کہ میرا ذہن برق رفتاری سے اپنے دیس میں جا پہنچا۔ ماں باپ، بہن بھائی، رشتہ دار اور دوست یار آنکھوں کے سامنے ابھر کر مجھے اُداس کر بیٹھے۔ میں سرد آہ بھر کر رہ گیا: "نہیں رتن بھائی۔ میرا یہاں کوئی نہیں....

میرے سب اپنے پرائے سات سمندر پار رہتے ہیں۔"

"تو تمہاری دھرتی؟"

مجھے ہنسی آ گئی۔ میرا ہنسنا فطری تھا۔ لہٰذا اُس کی وضاحت کرنی بھی ضروری تھی۔

"ابھی میرے پاؤں میں بیڑی نہیں پڑی مگر ایک ڈیڑھ برس میں ضرور پڑ جائے گی جب گھر لوٹوں گا۔"

ہم دونوں ہنس دیے۔ گلاس اُٹھا کر اُس نے ہلکے ہلکے گھونٹ بھرے۔ لیکن میں اپنی ہونے والی بیوی کے تصور میں کھو گیا جو شروع میں میری پریکٹس تھی پھر منگیتر بنی اور اب وہ منگنی کے مضافات میں رہائش پذیر میرا انتظار کر رہی ہے۔ اُس کے والدین ہماری شادی کے لئے رضامند تو تھے مگر اُس کے والد ماجد نے ایک کڑی شرط رکھی تھی کہ جب تک میرے پاس اپنا ذاتی فلیٹ نہیں ہوگا شادی نہیں ہوگی؟ وہ اِس حق میں نہیں تھا کہ اُس کی بیٹی سسرال میں جا کر سارے کنبے کے واسطے روٹیاں سینکتی پھرے اور ساس کی کڑوی کسیلی باتیں بھی سنے۔ میں نے اُسے مشورۃً تجویز پیش کی تھی کہ میں بیاہ سے پہلے کرائے کی جگہ لے لوں گا۔ مگر اُس نے میرا مشورہ یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ ذاتی فلیٹ میٹیریل اسیٹ (Material Asset) ہوتا ہے اور نئے نویلے جوڑے کے واسطے مالی تحفظ بھی۔ لہٰذا میں نے دل پہ پتھر رکھ کر اپنی منگیتر سے دو ڈھائی سال کی مہلت چاہی تھی کہ پردیس جا کر دن رات محنت کر کے اتنی رقم جمع کر لوں کہ واپسی پر ہمارا اپنا فلیٹ ہو۔ وہ روہانسی آنکھوں سے مجھ کو دیکھ کر ہاں کہہ گئی تھی۔

اُس نے نیا سگریٹ سلگایا۔ مجھے خاصا تعجب ہوا کہ وہ اس عمر میں بھی بلا کا سگریٹ نوش ہے۔ ہلکا سا گھونٹ بھر کر بولا: "بیاہ کے بعد لوٹ گئے یا وہاں رُک جاؤ گے؟"

"یہ کہنا تو کافی مشکل ہے۔"

اُس نے کرسی آگے کو کھسکائی۔ میز پر کہنیاں ٹیک کر ٹکٹکی باندھے مجھے تکتا رہا۔ کچھ یوں کہ میں اُس کا کوئی اپنا ہوں جو کبھی اُس سے بچھڑ گیا تھا اور آج مدتوں بعد اُس سے ملا ہوں۔ مجھے سمجھاتے ہوئے بولا: "یہ پردیس جہاں ہم رہتے ہیں زیادہ اچھے نہیں ہیں... یہاں رہ کر جیون دلدل بن جاتا ہے... آدمی اُس میں دھنستا ہی چلا جاتا ہے پھر کبھی نکل نہیں پاتا۔"

میں ہمہ تن گوش تھا۔ اُس نے اپنی سوچ کا ایک اور در کھولا: "اپنے دیس میں آدمی روکھی سوکھی کھا کر بھی خوش رہتا ہے... تم ابھی جوان ہو۔ جب تک یہاں ہو، خوب محنت کرو، خوب پیسہ بناؤ، پھر اس طرف پلٹ کر بھی مت دیکھنا۔"

میں حیرت کا پتلا بنا اُس کے چہرے سے نظر ہی نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ وہاں اپنائیت تھی۔ آنکھوں میں ندامت تھی اور ہونٹوں پر صداقت۔ خیال آیا کہ میرا اس شخص کے ساتھ رشتہ ہی کیا ہے؟ جو پہلی ہی ملاقات میں اپنی زندگی کا تجربہ مجھ پر نچھاور کر رہا ہے اور احساس دلائے جا رہا ہے کہ میں اُس کا کوئی قریبی عزیز ہوں۔

موسم سرما نے دبے پاؤں قدم رکھ دیے تھے۔ دن روز بروز چھوٹے ہونے لگے اور راتیں لمبی۔ سہ پہر کو اندھیرا سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ میں فیکٹری کے احاطے سے باہر قدم رکھتا تو پوری دُنیا اندھیرے میں ڈوبی ہوتی۔ سردی کی شدت الگ سے پریشان کرتی۔ جس روز میرا بدن زیادہ تھکا ہوتا یا مجھے اپنی منگیتر کی یاد زیادہ ستاتی تو میرے پاؤں پب سے ہو کر گزرا کرتے۔ اس دوران میں میری دکن بھائی سے کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ سرسری کم مگر زیادہ عمروں کا فرق سمٹ چکا تھا۔ تعلقات میں قربت بڑھ گئی تھی اور ہم دونا دوستوں کی طرح پیش آیا کرتے۔ جس روز میں پب میں داخل ہوتا تو مجھے سفید فام بزرگوں کی بھیڑ اور اُن کی میزوں کے درمیان سے ہو کر دکن بھائی تک پہنچنا ہوتا لیکن اُن کی کمزور اور دنیا دیکھی آنکھوں میں نسلی امتیاز کا شبہ تک نہ ہوتا۔ بلکہ وہ کھلی مسکراہٹ سے میرا خیر مقدم کرتے۔ دکن بھائی سب سے الگ تھلگ اپنے مخصوص کونے میں اکیلا بیٹھا دکھائی دیتا۔ نیم اندھیرے میں پھیلا ہوا وہ کونہ، وہ میز، وہ کرسی یقیناً اُس کی زندگی کا اہم جزو بن چکے تھے۔ میری جھلک پاتے ہی وہ پھول کی طرح کھِل اُٹھتا۔ شریر کا لہو اُس کے چہرے پر دوڑ آتا اور آنکھیں ہرن کی طرح چمک جاتیں۔ لیکن ہر بار اُسے اکیلا پا کر مجھے اچنبھا بھی سخت ہوتا کہ اس علاقے میں پنجابی برادری کے بے شمار لوگ رہائش پذیر تھے۔ وہ بھی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ اکثر اپنے ہی بھائی بندوں میں گھومتے پھرتے نظر آتے۔ مگر ایک دکن بھائی تھا، جس کی صحبت میں میں نے کبھی کسی شخص کو نہ دیکھا تھا۔ نہ پب میں اور نہ پب سے باہر کوئی دوست، شناسا یا رشتہ دار۔ ایک شام موقع غنیمت پا کر میں نے اُس سے دریافت کر ہی لیا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ اکیلے رہنے کی وجہ کیا ہے؟ اُس کے چہرے کی جھریاں مزید گہری ہو گئیں۔ کچھ دیر تک وہ سگریٹ کو اپنی زرد مائل انگلیوں میں گھماتا رہا۔ پھر دو تین کش لئے اور بیشتر کی طرح سنجیدہ ہو گیا۔ بولا:

"اِن ملکوں میں بڑھاپا گرد کی طرح ہے... لوگ باگ بوڑھے آدمی کو گلا سمجھ کر اُس سے پرے پرے رہتے ہیں... اُس سے ملنا تو دور رہا اُس سے بات کرنا بھی زیادہ پسند نہیں کرتے۔"

اُس کے جواب سے میں زیادہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔ میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ اُس کا دائمی مرض ہی اصل وجہ تھی، جس کے سبب برادری کے لوگ اُس سے دور دور رہا کرتے۔ اُسے دمے کا دیرینہ مرض لاحق تھا اور وہ جان لیوا روگ اُسے گھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔ اُسے اپنی بیماری کا احساس ضرور تھا مگر وہ اُس کے متعلق فکر مند نہ تھا۔ ایک دفعہ اُس پر کھانسی کا اتنا شدید حملہ ہوا تھا کہ اُس کی

آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ سانس اُکھڑتے ہی چہرہ فق ہو کر رہ گیا تھا۔ سانس لینے کی خاطر اُسے جدوجہد کرنی پڑ رہی تھی۔ لگا کہ وہ کھڑے کھڑے ہی میز پر دم توڑ دے گا۔ اُس کی غیر حالت دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ میں نے اُٹھ کر اُسے سنبھالنا چاہا لیکن اُس نے میرا ہاتھ جھٹک کر مجھے خود سے الگ کر دیا۔ پھر پینٹ کی جیبوں کو ٹٹولتا ہوا اُس نے پمپ نکال کر منہ میں سپرے (spray) کیا اور کرسیوں کو تھامتا ہوا ٹائلٹ کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے سخت غصہ آیا کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے جو مصیبت کے وقت بھی کسی کی مدد لینا پسند نہیں کرتا۔ میں نے اُس جیسا ڈھیلا شخص زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کچھ دیر میں جب وہ ٹائلٹ سے لوٹا تو اُلٹی نکلا چکا تھا۔ چہرے مہرے سے ذرا بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ کچھ دیر پہلے اُس پر کھانسی اور دمے کا شدید حملہ ہوا تھا۔ میں نے پوچھے ہی کیا

''رمن بھائی' تم ٹھیک کرا کے علاج کیوں نہیں کرواتے؟ یہ بیماری تو تمہاری جان لے بیٹھے گی؟'' لیکن اُس پر کوئی ردِّ عمل نہ ہوا۔ بلکہ وہ چپکے سے آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہاتھ بڑھا کر اُس نے میز سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھانا چاہا۔ لیکن میں نے اُس کا ہاتھ تھام کر پیکٹ کو ایک طرف سرکا دیا۔ اُسے میری حرکت ذرا بھی بُری نہ لگی بلکہ دردمندی سے مجھ کو دیکھتا ہوا میری آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے لگا۔

''اب علاج کرانے سے کیا فائدہ؟ کیا بتاؤں.... ایک دن جانا بھی تو ہے جتنی جلدی اُتنا اچھا۔ فیونرل (Funeral) کا پورا خرچہ بھر دیا ہے۔''

لیکن میرا اضطراب اپنی جگہ قائم تھا کسی طور بھی کم ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ میں مزید اُکھڑ گیا: ''میں جانتا ہوں' تمہاری دیکھ بھال کرنے کو یہاں کوئی نہیں؟ لیکن تم اپنے بیٹوں کے پاس امریکہ تو جا سکتے ہو.... وہاں تمہاری بہو بیٹیاں ہیں۔ وہ لگ کر تمہاری خدمت کریں گی؟''

اپنے بیٹوں کا ذکر سن کر اُس کا چہرہ وہ نہیں رہا' جو عام حالت میں ہوا کرتا تھا۔ وہ بجھ کر رہ گیا۔ عجب سا دُکھ' عجب سی اُداسی اُس کے وجود پر پھیل گئی۔ خیال آیا کہ وہ دُکھ وہ اُداسی اُس کی زندگی کا چراغ بجھائے چلے جا رہے ہیں اور وہ بیچارہ دمہ کا مارا اِس اُمید پر جی رہا ہے کہ کب چراغ بجھے' دم نکلے اور اُس کی آتما کو شانتی ملے۔ رقت بھری آواز میں کہا: ''ان دُکھوں کی بیماری خطرناک ہے.... آدمی کے تن من پر گہرا اثر کرتی ہے۔ پھر وہ صرف اپنی خاطر ہی زندہ رہتا ہے۔ اپنے بارے میں ہی سوچتا ہے اور کسی سے کوئی سمبندھ رکھنا پسند نہیں کرتا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ تمہارے بیٹے تمہارا خیال نہیں رکھیں گے؟ تمہارا علاج نہیں کروائیں گے؟''

''سنو دیو کشتی۔'' اُس نے کرسی آگے کو کھسکائی اور ٹوٹتی جھجکتی آواز میں بولا: ''تم ابھی جوان ہو.... میری عمر کو پہنچو گے تو وہی محسوس کرو گے جو میں کرتا ہوں.... میرے لڑکے کنوارے تھے تو میرے دل کے ٹکڑے تھے۔ اُن کا بیاہ ہو گیا تو وہ مجھ سے ذرا دور ہو گئے.... پھر اُن کی اپنی اولاد ہوئی تو وہ کچھ اور دور ہو گئے اور جب اُن کی ماں کا پانچ برس پہلے دیہانت ہوا تو کافی دور ہو گئے.... اور اب تو اتنے دور ہو گئے ہیں کہ بس.... کیا بتاؤں؟''

''مگر رمن بھائی وہ تمہارے بیٹے ہیں۔ تمہارا اپنا خون ہیں؟''

''ہاں ں ں... وہ تو ٹھیک ہے پر آخری سمے میں اُن کو پریشان کروں.... جا کر اُن پر بوجھ بنوں... یہ ٹھیک نہ ہوگا۔''

اُس کی آواز اُس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ مزید کچھ کہنے کو اُس کے ہونٹ کپکپائے تھے مگر اُس کا دُکھ اُس کے وجود پر اتنا بھاری تھا کہ وہ آواز میں شامل نہ ہو سکا۔ وہ پتھر کی مورت بنا میرے سامنے بیٹھا تھا۔ گیلی آنکھوں سے رواں آنسو جھریوں میں اٹک رہے تھے۔ اُس روز صحیح معنوں میں مجھے اُس سے ہمدردی ہوئی تھی اور وہ جو کہنا چاہتا تھا براہِ راست مجھ تک پہنچ چکا تھا۔

رُت بدلی تو پھول مسکرائے تھے۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ موسم سہانا تھا اور فضا خوشگوار۔ لیکن سب کا وہ مخصوص کونہ ویران ہو چکا تھا۔ رمن بھائی کی صحت روبہ زوال تھی۔ اُس کا آخری سفر دُور نہ تھا۔ میں اُس کی مزاج پرسی کرنے اُس کے فلیٹ پر جایا کرتا تھا' جہاں وہ پچھلے پینتیس برسوں سے قیام پذیر تھا۔ وہیں اُس کے بیٹے جوان ہو کر ڈاکٹر اور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بنے تھے اور وہیں اُس کی بیوی کا دیہانت بھی ہوا تھا۔ اُس کی مرتیو پر اُس کی سنتان پہلا جہاز پکڑ کر لندن بروقت پہنچ گئی تھی۔ مگر انتم سنسکار کی تمام رسمیں جب پوری ہو چکیں تو وہ بھی ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ رمن بھائی کو اپنی اکلوتی بیٹی سے کوئی شکایت نہ تھی کہ وہ تو پرایا دھن تھی۔ لیکن دونوں بیٹے روانگی سے پہلے گھمبیر سوچ بچار میں ڈوبے رہے کہ آیا ان حالات میں وہ بوڑھے باپ کو اپنے ساتھ امریکہ لے جائیں یا اُسے اپنے ہی رحم و کرم پر اکیلا چھوڑ جائیں؟ بڑا بیٹا جانتا تھا کہ وہ ماں باپ کا پہلوٹھی کا بچہ ہے۔ باپ کے آخری دنوں میں سیوا کرنا اور اُس کی دیکھ بھال کرنا اُس کا اوّلین فرض ہے اور ایسا کرنے سے اُس کی ماں کی آتما کو شانتی بھی ملے گی۔ یہ سنسکار اُسے بچپن اور جوانی میں اپنے ماں باپ سے ملے تھے لیکن وہ بڑا بیٹا خود جدید زمانے کا جدید آدمی تھا۔ میڈیکل اُس کا پروفیشن تھا۔ آتما اور شریر کو وہ دو الگ نہیں مانتا تھا۔ اُس کا ٹھوس یقین تھا کہ آدمی کا بدن ایک مشین کی طرح ہے' جس کے کل پرزے جب جواب دے جاتے ہیں تو مشین کی حرکت بند ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ قدرت کی عطا کردہ واحد زندگی کو بلا کسی ذمہ داری کے آزادانہ طور پر جینا چاہتا تھا۔ اُسے ذاتی آزادی اور اپنی فیملی کی آزادی بہت عزیز تھی۔ البتہ چھوٹے بیٹے کے خیالات الگ تھے۔ وہ باپ کا احترام کرتا

تھا اور جذباتی طور پر اُس سے جڑا ہوا تھا۔ اُس نے باپ کو اپنے ساتھ رکھنے میں اپنا ذہن بنا لیا تھا لیکن جب اُس کی بیوی پر یہ حقیقت آشکار ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ اُس نے اپنے گھر والے پر دباؤ ڈال کر یہ کہہ کر اُس کا ذہن بدل ڈالا: "کاکا کو روگ بہت بڑا (بڑا) ہے۔ سگریٹ کا دن وہ کھانستا رہتا ہے پھر سگریٹ تو اُس کا جیون ٹھہرا.... رات میں تیری، میری اور بچوں کی نیند خراب کرے گا؟ ..... بڑھاپا کاٹنا آسان نہیں ہوتا۔ گھر والوں پر بوجھ بن جاتا ہے.... میری مانو تو کاکا کو کیئر ہوم (Care Home) میں بھرتی کرادو.... خرچہ دونوں بھائی برابر (برابر) اٹھاتے رہنا۔"

اگلے روز دونوں بھائی سو کو در سر جھکائے ہاتھ جوڑے باپ کی شرن میں تھے۔ رمن بھائی سفید کرتا دھوتی پہنے بڑھی ہوئی داڑھی، پریشان بال، گیلی آنکھیں اور اُن کے نیچے سیاہ حلقے لئے چالیس برس کی ازدواجی زندگی کا سوگ منا رہا تھا اور بیوی کے ساتھ دُکھ سُکھ میں بتایا ہر واقعہ یاد کر رہا تھا۔ بڑے بیٹے نے رُک رُک کر کہنا شروع کیا:

"باپو ما (ماں) چلی گئی.... آپ اکیلے رہ گئے ہو.... دیکھ بھال کرنا، کھانا بنانا، وقت کاٹنا اکیلے میں مشکل ہوگا.... روگ بھی پرانا ہے۔ آپ ٹھیک سمجھو تو.... کیئر ہوم میں بات کریں۔" رمن بھائی نے گردن اٹھا کر پہلے بڑے بیٹے کو دیکھا، پھر چھوٹے کو اور اپنی نظریں اُن پر جما دیں۔ چھوٹے نے بڑے بھائی کی بات کو آگے بڑھایا: "باپو جی.... آپ ہم کو غلط مت سمجھو۔ کیئر ہوم میں برابر دیکھ ریکھ، کھانا پینا اور میڈیکل ہوتا ہے۔ اپنے کئی لوگ اب اُدھر رہتے ہیں... دل لگ جائے گا..... سمے بھی بیت جائے گا۔ خرچے کی چنتا ذرا بھی نہ کریں۔"

یہ سب سنتا تھا کہ رمن بھائی کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اُس نے سوچا کہ انگلستان آنے سے پہلے وہ اپنے بیٹوں کو گھر سے نکال دے مگر وہ مجبور تھا کہ وہ اُس کے جگر پارے تھے نور نظر تھے۔ قریب ہی سگریٹ کا پیکٹ دھرا تھا۔ اُس نے سگریٹ سلگا کر کش لئے اور بیٹوں کو تاسف سے دیکھتا رہا۔ پھر دُکھ کے ساتھ بولا: "تم دونوں بھائی میری چنتا مت کرو.... میں اپنی دیکھ بھال کر لوں گا.... دو چار سال میں اور بوڑھا ہو جاؤں گا تو پھر دیکھوں گا مجھ کو کیا کرنا ہے؟.... تب تم دونوں کو بتاؤں گا۔"

بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔ لیکن اُس روز رمن بھائی کو یقین ہو گیا تھا کہ اُس کے بیٹے اُس سے صد درجہ دور ہو گئے ہیں اور اب اُن پر اُس کا اختیار نہیں رہا بلکہ وہ ایک طرح سے اُنہیں کھو بیٹھا ہے۔

ہر دن گزرنے پر رمن بھائی کا شریر کمزور پڑ رہا تھا۔ میری شعوری کوشش رہا کرتی کہ میں اُسے ہسپتال میں داخل کرا دوں مگر وہ بضد تھا۔ اُس کا جواب ایک ہی ہوا کرتا: "اب کس کے واسطے جیوں؟ اور کا ہے کو جیوں؟"

اُس کے ہاں زندہ رہنے کی تڑپ یکسر ختم ہو چکی تھی اور وہ جلد از جلد دنیا کو خیرباد کہنا چاہتا تھا۔ وہ اس گیلی لکڑی کی طرح تھا جو سلگ سلگ کر ختم ہو چکی ہو۔ تاہم دھواں برابر اُٹھ رہا ہو۔ اِس دوران میں میری سگریٹ کا خاتمہ قریب قریب روز ہی آیا کرتا تھا۔ مضمون ایک سا ہوا کرتا: "کب آ رہے ہو؟ کہاں تک پہنچے ہو؟ بس اب چلے آؤ۔ انتظار نہیں ہوتا۔ اپنا خیال رکھنا۔"

میں فلیٹ بُک کر چکا تھا۔ چند آخری قسطیں ادا کرنا باقی تھیں۔ لہٰذا میں زیادہ محنت اور زیادہ وقت کام کر رہا تھا۔ منزل دور نہ تھی۔ میں با آسانی اُسے دیکھ سکتا تھا۔ کبھی کبھار چشم تصور سے یہ بھی دیکھ لیتا کہ میں دولہا بنا گھوڑی پر سوار بارات لئے سسرال کی طرف بڑھ رہا ہوں اور بینڈ باجے کا شور فضا میں گونج رہا ہے۔

ایک روز میں اپنے معمول کے مطابق پب میں اکیلا بیٹھا تھا۔ رمن بھائی سے ملے ہوئے چند روز بیت چکے تھے۔ مخصوص کونہ ویران تھا۔ میں ہی اُسے شاذ و نادر یاد کر لیا کرتا تھا۔ پب کے مستقل گاہک مجھ سے میرے بزرگ دوست کی خیر خیریت دریافت کرتے رہتے تھے۔ باہر شام ڈھل چکی تھی اور اُجالا بلکی ہلکی تاریکی میں تحلیل ہو رہا تھا۔ اچانک پب کا دروازہ کھلا اور رمن بھائی چھڑی تھامے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا، کرسیوں کو تھامتا ہوا میری طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ انتہائی لاغر ہو چکا تھا۔ بدن کا رہا سہا گوشت بھی مرض اور عمر کی نذر ہو چکا تھا۔ لگا کہ کوئی پنجر گور میں سے اُٹھ کر چلا آیا ہے۔ میں نے اُٹھ کر اُس کا سواگت کرتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف دیکھا۔ لیکن اُس نے گردن کے اشارے سے ڈرنک کے لئے منع کر دیا۔ روبرو بیٹھ کر اُس نے رُک رُک کر کمزور آواز میں کہنا شروع کیا: "کیا بتاؤں.... میں کل بھی آیا تھا.... پر تم نہ آئے۔ دیر تک انتظار کیا۔"

"آپ جانتے تو ہو۔ میں روز روز یہاں نہیں آتا۔"

"ہاں ں ں.... پر آج امید تھی کہ تم ضرور آؤ گے۔"

اُس کی غیر حالت دیکھ کر میں تو دہا پہلے سے ہل چکا تھا، وجدان سا ہوا کہ میں آخری بار اُس کو دیکھ رہا ہوں۔ کسی روز بھی اُس کی زندگی کا سفر تمام ہو جائے گا۔ خیال آیا کہ وقت کے ساتھ ساتھ آدمی کیا سے کیا بن جاتا ہے؟ پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا؟ لیکن اِس پر اُس کا کوئی اختیار بھی تو نہیں ہے؟ وہ کٹھ پتلی بنا حالات کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ رمن بھائی نے جیکٹ کی جیب سے چند کاغذات نکالے اور چھانٹ کر ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔

"میرا ایک کام کرنا.... میرا اب کوئی بھروسہ نہیں.... شریر اب ساتھ نہیں دے رہا۔ کسی پل بھی چلا جاؤں گا.... تم کو معلوم ہے میرا بڑا بیٹا نیوآرک میں رہتا ہے اور چھوٹا نیوزی لینڈ میں.... اُن دونوں کے نام اور فون نمبر میں نے اس کاغذ پر لکھ دیے ہیں.... کسی ایک کو فون کر دینا.... اب میں...."

اُس کی آواز بھر آئی تھی اور آنکھیں ڈبڈبا کر رہ گئی تھیں۔ مجھے سخت افسوس ہو رہا تھا کہ اُس کی آخری خواہش بھی پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اُس کی دلی تمنا تھی کہ وہ اپنے بیٹوں کو جی بھر کر دیکھ لے انہیں گلے سے لگائے اور اُس کا اُتم سنسکار اور کریا کرم بھی اُن ہی کے ہاتھوں سے ہو کیونکہ اُس کا اندھا وشواس تھا کہ بیٹوں کا ایسا کرنے سے باپ کی آتما کو شانتی ملتی ہے اور اُسے سورگ کی سیڑھی بھی نصیب ہوتی ہے۔ میں عجب تذبذب میں تھا۔ آخر میں کچھ سوچ کر گویا ہوا:

"کہو تو آج ہی تمہارے بیٹوں کو فون پر بتا دوں کہ تم بہت بیمار ہو اور تمہارے پاس وقت...."

"نا نا نا.... میرے جیتے جی ایسا مت کرنا۔ میں اُن کے آگے جھک جاؤں۔ میری آتما کو دکھ ہوگا۔"

میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ اُس ضدی بالک کی طرح ہے جو اپنی آن بان شان کی خاطر کسی کے آگے جھکنا پسند نہیں کرتا کہ اُس کی انا دیوار بن کر اُس کے سامنے کھڑی ہوتی ہے۔ لیکن وہ تو اُن لڑکوں کا باپ تھا۔ اُن کو دنیا میں لے کر آیا تھا کوشش کے باوجود میں اُس کا یہ روپ سمجھ نہ پایا۔

"رمن بھائی۔ تمہاری پہچان کے کئی لوگ یہاں رہتے ہیں اور کچھ نزدیکی رشتہ دار بھی.... یہ کاغذ تم کسی ایک کو دے دو؟"

اُس نے اپنا بے جان سا ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔ دیر تک لمبے لمبے سانس بھرتا رہا اور جب بحال ہو گیا تو بولا: "وہ سب لوگ دھن دولت بنانے میں مست ہیں.... اُن کے پاس سمے نہیں ہے.... تم کو اس دیش میں آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی.... تم کو ان لوگوں کی ہوا ابھی پر نہیں لگی۔"

میں ایک بار پھر تذبذب کے بھنور میں تھا۔ عقل ساتھ نہیں دے رہی تھی کیا قدم اٹھاؤں مگر اُس نے وہ کاغذ میرے ہاتھ پر رکھ کر میری مٹھی بند کر دی۔ پھر چھڑی کے سہارے مشکل سے اٹھا۔ شفقت سے مجھ کو دیکھا۔ خلوص سے اپنا لرزاں ہاتھ میرے سر پر پھیرا اور صدق دل سے آشیرواد دیا "بھگوان تم کو سدا خوش رکھے۔ میں آخری پل تک تمہارے لئے دعا کروں گا۔"

وہ بے تکے قدم اٹھاتا مریضوں کے درمیان سے گزرتا اور سب کو "چلو چلو" کہتا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اُسے اُس کے فلیٹ تک چھوڑ آنے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن اُس نے بتلایا کہ وہ منی کیپ (ٹیکسی) سے آیا ہے اور اسی سے لوٹ جائے گا۔ دروازے پر پہنچ کر وہ رک گیا اور مڑ کر اُس نے سب کے ماحول کو حسرت سے دیکھا۔ پھر سب کے چاروں کونوں پر نگاہ ڈالی اور مجھے اپنے مخصوص کونے میں بیٹھا ہوا پا کر مسکرا دیا۔ دور سے ہاتھ اٹھا کر ہلایا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

اُسی رات رمن بھائی نے اپنے پران چھوڑ دیئے تھے۔

## غزل

دوستو اب نیا زمانہ ہے
آپ کا آئنہ پرانا ہے

آدمی سے جو آدمی تک ہو
ہم کو وہ راستہ بنانا ہے

کہکشائیں تو سج رہی ہیں مگر
اب تری مانگ کو سجانا ہے

دُکھ کی راتیں اُجالتا ہے جو
میرا دل وہ چراغ خانہ ہے

یونہی بہلا رہا ہوں دل ورنہ
کسی کو جانا ہے کسی کو آنا ہے

ایسا رشتہ ہے دنیا و دل میں
جیسے تانا ہے اور بانا ہے

جتنا ڈھونڈو گے اتنا پاؤ گے
میرے لفظوں میں وہ خزانہ ہے

میں نے پوچھا ارادہ ہے کہ نہیں
مسکرا کر کہا "کہا نا ہے"

اکبر حمیدی، اسلام آباد

# مجرب نُسخہ

کیدارناتھ شرما (جموں، بھارت)

"ہیلو میڈم" ڈاک خانے کے دروازے کے باہر آ کر ایک بزرگ نے میری طرف اشتیاق سے دیکھا اور کہا۔ مجھے دیکھ کر اُس کا چہرہ جو پہلے سے ہی شگفتہ اور شاداب تھا اور زیادہ کھل اُٹھا۔ وہ بزرگ بڑی بے تکلفی سے دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ میں اُس بزرگ سے ہم کلام ہونے سے جھجک رہی تھی۔ میرے تصور میں جو بات بنی تھی وہ یہ کہ آخر کار وہ ایک مرد تھا چاہے اس کی عمر کتنی ہی ہو۔ اس کے برعکس وہ بزرگ اپنا یقین مجھ پر جتا رہا تھا کہ وہ ایک مرد ہے اور مرد ہونے سے اُسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا دل خوش رکھنے کے لئے کسی عورت کی طرف دیکھے۔ اُس سے باتیں کرے اور اُس کے چہرے کے ہر بدلتے رنگ کا مشاہدہ کرے اور اُس کے احساسات کو شدت سے محسوس کر کے محظوظ ہو۔ وہ اپنے سامنے کھڑی عورت کے اعضا کی ہر نقل و حرکت کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا مگر میں تھی کہ شرمائے جا رہی تھی اور کچھ سکڑتی جا رہی تھی۔ میری یہ ادائیں شاید اُس کے لئے دلکشی کا سامان تھیں۔

وہ اپنے بزرگ ہونے کی بنیاد پر یہ تسلط جتائے ہوئے تھا کہ ایک لمبے عرصے تک انسانی سماج میں جیا ہے اور جانتا ہے کہ انسان کا فرض کیا ہے اور سماج کا دستور کیا ہے اور اُس کی حدیں کہاں تک ہیں۔ ایک بات مجھے اچھی طرح سے واضح ہو گئی ہے کہ وہ شخص ایک وضعدار اور وجیہہ قسم کا انسان ہونے کے ساتھ ایک با اخلاق انسان معلوم ہوتا تھا اس لئے مجھے اُس سے کوئی ڈر نہ لگ رہا تھا۔

"ہاں فرمایئے" میں نے قدرے بے رخی سے کہا تھا۔ میرا جملہ قطعی بے خلوص تھا۔ یہ اُس کی اُمیدوں پر کڑا نشتر تھا۔ یہ بات اُس پر واضح تھی کہ میں دوسروں کی طرح جو وہاں کھڑے تھے ڈاک ایجنٹ تھی۔ ہم بھی ڈاک ایجنٹ ڈاکخانے میں آ کر ڈاک محکمے کی بچت سکیموں کے بارے میں جانکاری دیتے تھے اور بچت سکیموں میں پیسہ لگانے والوں کو خدمات کے عوض میں ڈاک خانے سے کمیشن بھی پاتے تھے۔

میں نے گھریلو حالات سے مجبور ہو کر ڈاک محکمے سے ایجنٹ کا لائسنس لے لیا تھا اور پچھلے کچھ دنوں سے ڈاک خانے کے باہر آ کر کھڑی ہو کر کام کرنے لگی تھی۔ میری تھوڑی کمائی میرے لئے جہیز کا کام دیتی تھی۔ ڈاک محکمے کی بچت سکیموں کے بارے میں بھی جانکاریاں، فارم وغیرہ میری بریف کیس میں رکھے تھے۔ کام میں نئی ہونے کی وجہ سے کاروباری انداز نہیں جانتی تھی۔ گاہکوں سے بات کرنے کا مجھے پیشہ ورانہ سلیقہ بھی ابھی پوری طرح سے نہ آیا تھا۔ میرے کام کی رفتار بڑھانے کے راستے میں ایک رکاوٹ میری جوانی، خوبصورتی اور دلکشی تھی۔ میں بمشکل بتیس سال کی تھی۔ رنگت گوری تھی جسم گداز ہو چلا تھا۔ نقوش تیکھے اور ادائیں پرکشش تھیں۔ میں اپنے پاس آنے والے ہر مرد کے ساتھ آنکھ اُٹھا کر بات نہ کر سکتی تھی۔ مجھے ہر مرد کی آنکھیں گھورتی ہوئی سی محسوس ہوتی تھیں۔ میرے ساتھ کھڑی دوسری خواتین ایجنٹوں نے اپنی اس کمزوری پر قابو پا لیا تھا لیکن میں نے ابھی میدان میں اپنی کاملیت دکھائی تھی۔

وہ بزرگ جس نے میرے ساتھ سلسلہ کلام کا آغاز کیا تھا وہ اکیلا نہ تھا۔ اُس کے ساتھ ایک اور بزرگ بھی تھا جو لگ بھگ اُسی عمر کا تھا۔ وہ مقابلتاً سنجیدہ طبیعت تھا۔ یہ لوگ ڈاکخانے کے دروازے کے پاس لگی کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ آپس میں بیٹھے سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔ بیچ بیچ میں اُن کی نگاہیں میری طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ میرے پاس ایک آدمی آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بچت سکیموں میں کچھ پیسہ لگانا چاہتا تھا اور اُن کے بارے میں پوری جانکاری چاہتا تھا۔ میں نے اُسے جانکاری فراہم کرائی تھی اور اُس کے ضمنی سوالوں کا جواب دیا تھا۔ میری طرح کے دوسرے ایجنٹوں کی نظریں مجھ پر گڑ گئی تھیں۔ بالآخر اُس آدمی سے مجھے کام مل گیا تھا۔ یہ میری پہلی کامیابی تھی۔ مجھے لگا تھا کہ اُس آدمی سے بات چیت کرتے وقت میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا تھا اور مردوں سے بات چیت کرتے وقت آنے والی جھجک پر بھی فتح پا لی تھی۔ مجھ میں خود اعتمادی بتدریج بڑھ گئی تھی۔ میں شاداں تھی۔ اس سے میرے چہرے کی رنگت بدلی تھی۔ وہ بزرگ اس دوران میرے طرز تکلم اور میرے بات کرنے کے سلیقے کا بغور مطالعہ کر رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے۔ میری ہر ادا انہیں بھا رہی تھی۔

شروع شروع کی جھجک کے بعد مجھے اُس بزرگ سے کوئی ڈر محسوس نہ ہو رہا تھا۔ اُس کا مجھے اشتیاق سے دیکھنا اور اُس کا میرے اعضا کی نقل و حرکت کا مشاہدہ کرتے رہنا بُرا نہیں لگا تھا۔ وہ خوشدل اور ظریف الطبع لگتا تھا۔ مجھے اُس کے دل میں کوئی کھوٹ نہ لگا تھا۔

میں محسوس کرنے لگی تھی کہ اُس بزرگ کے جملے کا جو جواب دیا تھا اُس میں روکھا پن تھا۔ یہ گستاخانہ تھا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ کوئی منچلا نوجوان نہ تھا بلکہ ایک عمر رسیدہ بزرگ تھا۔ مجھے اُس کے تئیں احترام جتانا چاہئے تھا نہ کہ بے رخی۔

میں کچھ ہی دنوں سے ڈاک خانے میں بچت ایجنٹ کے طور پر آنے لگی تھی۔ میں نے ایک بار پہلے بھی انہیں یہاں آتے دیکھا تھا۔ یہ تب شاید کارڈ لفافے خریدنے آئے تھے۔ یہ کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے تھے اور دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ اس اثنا میں اُن کے کئی جانکار انہیں سلام کر کے آگے نکل گئے تھے۔ اُس دن بھی انہوں نے میری طرف کچھ دیکھ کر قناعت کر لی تھی۔ وہ میرے حسن و جمال کی طرف متوجہ ضرور ہوئے تھے مگر ہم کلام نہ ہوئے تھے۔

میں وہاں کھڑی سکیموں سے استفادہ کرنے والوں کی منتظر تھی۔ گزشتہ کچھ دنوں سے میں نے دیکھا تھا کہ بچت سکیموں سے فائدہ اُٹھانے والوں میں سرکاری ملازموں کی تعداد زیادہ تھی۔ ڈھلتی عمر کے لوگ بھی ان سکیموں میں پیسہ

لگا رہے تھے۔ یہ لوگ مرد تھے اور میں تھی جوان اور عورت۔ میں نے پایا تھا کہ عورت چاہے کسی عمر کی کیوں نہ ہو مرد کے لئے کشش رکھتی ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں میرے پاس بچت میں دلچسپی لینے والوں کی بڑی تعداد آنے لگی تھی۔ اس سے میری شخصیت میں کافی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ گھر کی اقتصادی حالت کی کمزوری کی وجہ سے مجھے گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر کام پر آنا پڑا تھا تو مجھے یہ حیثیت سے کم ملا تھا۔ یہ میری مجبوری تھی۔ میں کامل طور پر تنہا ہو گئی تھی۔ وقت پر آفس۔ کام کاج نپٹانی اور ڈاک خانے کے کھلنے پر عین وقت پر پہنچ جاتی۔ میں اپنا رکھ رکھاؤ ٹھیک طرح سے کرنے لگی تھی۔ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود گھر کی چار دیواری میں رہ کر میں اپنے آپ میں کھوئی گئی تھی۔ میرا باہر کی دنیا سے گویا کوئی تعلق ہی نہ رہا تھا۔ جب میرے لئے یہ انتہائی لازم ہو گیا تھا کہ اپنی آمدنی کا ذریعہ بڑھاؤں اور گھر کی مشکلوں پر قابو پاؤں تو میں نے ڈاک محکمے سے ایجنٹ کا لائسنس لے کر کام شروع کر دیا تھا۔ مردوں کی مشتاق نظروں نے مجھے شرمیلی نہ بنے دیا تھا۔ میرے کام کی نوعیت نے میری جھجک مٹا دی تھی۔ میری جاذب نظر شخصیت نے میرے کام کو بڑھانے میں ایک اہم رول نبھایا تھا۔ وہاں کھڑے ایجنٹوں میں سے میرے پاس آنے والوں کی تعداد کافی زیادہ تھی جبکہ کافی وقت سے کام کر رہے ایجنٹوں کے پاس آنے والے گاہکوں کی تعداد کم ہو گئی تھی۔

وہ بزرگ جو کرسیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے شاید چائے پینے کی بابت سوچ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں بار بار چائے والے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ وہ شاید پہلے سے جانتے تھے کہ برآمدے کے پاس ایک چائے والا چائے بناتا ہے۔ ڈاک خانے کے بابو لوگ اسی چائے والے سے چائے منگواتے تھے۔ ڈاک خانے میں کسی کام کے لئے آنے والے لوگ بھی اسی چائے والے سے چائے لے کر برآمدے میں کھڑے چائے پیتے رہتے تھے۔ یہ بزرگ لوگ چائے کی دکان کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ ان کی نگاہیں میری طرف بھی اٹھ جاتی تھیں۔ یہ لوگ کافی دیر سے بے مقصد وہاں بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ کچھ شاپ لینے مڑ گیا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد لوٹ آیا تھا۔ انہوں نے اپنا زیادہ وقت باتیں کرنے اور قہقہہ لگانے میں گزارا تھا۔

مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ انہیں گھر پر کوئی کام نہیں رہا۔ یہ لوگ گھر سے نکالے گئے ہیں۔ میں یہ قیاس آرائی کرنے لگی ہوں کہ انہیں ناشتہ کرانے کے بعد بہوؤں نے انہیں کہہ دیا ہوگا۔ "کالر جی۔ جائیے تھوڑی دیر گھوم کر آئیے۔ اس سے آپ کا وقت بھی اچھی طرح سے کٹ جائے گا اور دوپہر کو بھوک بھی اچھی لگے گی۔" یہ واقعی ایک نیک صلاح تھی۔ ان میں ان کو فائدہ بھی تھا۔ وہ شاید جانتی تھیں کہ بزرگ اگر سارا دن گھر پر رہیں گے تو تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی حکم چلاتے رہیں گے۔ انہیں کوئی نہ کوئی خرافات سوجھتی رہے گی۔ اس سے وہ گھر کا کوئی کام نہ نپٹا سکیں گی۔

میں نے دیکھا تھا کہ یہ بزرگ زندگانی کے اس مرحلے پر پہنچ کر بھی قطعی طور پر اداس نہ تھے۔ یہ آپس میں باتوں میں مشغول رہ کر کھلکھلاتے رہتے تھے۔ ان کے چہروں پر شادابی اور شگفتگی تھی۔ جھنجلاہٹ یا تناؤ ان کے چہروں پر دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ کسی بات پر تنگی یا پریشانی محسوس نہ کر رہے تھے۔ یہ لوگ اپنے خرچ کے لئے کسی پر محتاج نہ تھے۔ یہ خوشحال دکھائی دیتے تھے۔ شاید انہیں اچھی خاصی پنشن مل رہی تھی۔ یہ لوگ زندگی جی رہے تھے اسے بوجھ محسوس نہ کر رہے تھے۔ وہ زندگی کو استحالی چیز نہ سمجھ رہے تھے۔

اس کے برعکس میں جوان عمر ہونے پر بھی دلی طور پر اس قدر خوش نہ تھی حالانکہ میں پچھلے کچھ دنوں سے باقاعدہ طور پر کام پر آنے لگی تھی۔ اس کام سے مجھے اچھی آمدنی بھی ہونے لگی تھی پھر بھی میرے چہرے پر فکر کی لکیریں ابھری تھیں۔ اپنی اقتصادی حالت کے سدھرنے کے باوجود میں روحانی خوشی سے محروم تھی۔ کبھی میں خواہ مخواہ اپنے بچے کی تعلیم اور اس کے مستقبل کے لئے متفکر ہو اٹھتی تھی تو کبھی اس بات کو لے کر ڈری ہوئی تھی کہ ایک ساتھ کئی نگاہیں مجھ پر مرکوز رہتی تھیں۔ جس سے میرے دل میں وحشت محسوس ہوتی رہتی تھی۔ مجھے سمجھ نہ آتا تھا کہ میں ہر آلودہ نظروں کو کیسے بتاؤں کہ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں اور ایک بچے کی ماں ہوں جو سکول میں زیر تعلیم ہے اور میں نے اپنی زندگی اپنے بچے کو ایک اچھا انسان بنانے کے لئے وقف کر دی ہے۔ میں بی اے پاس ہوں مگر مجھے کوئی اچھی نوکری نہیں مل پائی تو کوئی بات نہیں۔ میں یہ کام کر کے اپنا گزر اوقات چلا رہی ہوں۔ میں لاچار اور بے بس نہیں ہوں۔ مردوں کی دنیا میں میں نسوانی حیا کی وجہ سے کھل کر بات نہیں کر سکتی۔ میری نگاہیں جھک جاتی ہیں اور مجھ میں ایک جھجک سی رہتی ہے۔ میں ایک باضمیر ہوں۔ پاکدامن اور عزت دار ہوں۔ مجھے ایسے لوگوں سے ڈر کیوں لگا رہتا ہے۔ میں کھوئی کھوئی کیوں رہتی ہوں۔ میں کچھ نہیں پاتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میرے چہرے پر شگفتگی نہیں آ پاتی۔

"کیوں نہ چائے پی جائے" ایک بزرگ نے دوسرے سے مشورہ کیا۔

"ہاں۔ ہو جائے ایک دور" دوسرے بزرگ نے جواب دیا۔

"تھوڑا رکو۔ میڈم سے پوچھ لیتے ہیں" اس بزرگ نے تجویز پیش کی۔

"چلو۔ پوچھ کر دیکھ لو"

"میڈم ہمارے ساتھ چائے پئیں گی نا۔ ہم چائے منگوا رہے ہیں"

اس کا انکار کئے بغیر اس بزرگ نے اپنے ساتھی کو آواز دینے کا اشارہ کیا اور خوشی سے آنکھ مٹکا دی۔

"دو بٹا تین چائے" اس نے چائے والے سے کہا جو انہیں عرصے سے جانتا تھا۔

چائے بن کر آ گئی۔ پہلا بزرگ میڈم سے گویا ہوا "آج آپ ہمارے ساتھ چائے پیجئے۔ ہم نے آپ کے لئے بھی چائے منگوائی ہے"

"ایک شرط ہے" میڈم نے کہا۔ اس کے چہرے پر رونق تھی۔

"وہ کیا؟"

"آپ مجھے میڈم کہہ کر مخاطب نہ ہوں گے۔ آپ مجھے میرے نام سے پکاریں گے، ٹھیک ہے نا؟"

"منظور ہے، پر آپ کا نام کیا ہے؟"

"رچنا۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔"

چائے کی چسکیاں لینے کے دوران ہم تینوں خاموش رہے۔ جس بزرگ نے مجھے چائے کی دعوت دی تھی۔ وہ بزرگ مجھ سے ہم کلام ہونے کے بہانے ڈھونڈتا رہا تھا۔ وہ اس دوران ٹکٹکی لگائے مجھے دیکھتا رہا تھا۔ وہ میری ہر ادا کو دیکھا کرتا رہا تھا۔ وہ میرے سانولے تیکھے نین، میرے باریک ترشے ہوئے انار کی طرح دہکتے رخساروں کو بڑی توجہ سے دیکھتا رہا تھا۔ اسے میرے قد و قامت کی بانکپن، میری گول گول گردن کی لمبائی اور اس کے نیچے ابھرے جسم کے حصے کے ابھار کو بڑی چاہ سے دیکھ کر اسے سراہتا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے کبھی کسی نوجوان کو بھی اتنی ٹکٹکی سے مجھے دیکھتے نہ دیکھا تھا جتنی ٹکٹکی اس بزرگ میں دکھائی پڑی تھی۔ مجھے اس بزرگ سے کوئی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی ٹکٹکی کو میں اس کی زندہ دلی سمجھ رہی تھی۔ میں حیران تھی کہ اپنی حیات کے اس مرحلے پر پہنچ کر بھی وہ زندہ دلی کو قائم رکھے ہوئے تھے۔ میں دل کے اندر ہی اندر خوش تھی کہ مجھے ایک ایسا شخص چاہنے لگا تھا جس سے مجھے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ تھا۔

مجھے اپنی جوانی کے ان دنوں کی یاد آنے لگی تھی جب میں زینہ زینہ جوانی کی دہلیز پر آگے بڑھنے لگی تھی۔ تب کئی نوجوان میری طرف چاہ و اشتیاق سے دیکھتے تھے۔ میری نظریں جھک جاتی تھیں۔ میں اپنے دوپٹے کو چھاتیوں پر پھیلا دیتی تھی۔ وہ بابا اپنی جگہ سے مسکراتا رہتا تھا اور مجھ سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ جب وہ بزرگ وہاں ڈاک خانے کے برآمدے میں مجھے دیکھنے لگا تھا تو میں نے اپنا کوئی ردعمل نہ دکھایا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ عورت ہمیشہ مرد کی ایک شکار ہے۔ عورت کا یہ کام ہے کہ وہ اس سے اپنا خود بچاؤ کرے۔ میں نے بزرگوں کے بارے میں یہ اندازہ لگایا تھا کہ عمر رسیدہ یہ لوگ بڑھتی عمر کے ساتھ جسمانی طور پر ضعیف تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور ذہنی طور پر بھی یہ کمزور ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان بزرگوں کو دیکھ کر میرے خیالات کی خود بخود تردید ہو گئی تھی۔ وہ لوگ دبلے پتلے تھے۔ وہ جسمانی طور پر توانا تھے اور ذہنی طور پر تندرست تھے۔ ان میں جوانوں جیسی امنگ ترنگ تھی۔ میں نے سوچا تھا جب میں گھر سے نکل کر باہر آگئی ہوں تو یہ تو شاید ان پہ منحصر ہے کہ وہ مجھے کس نظر سے دیکھیں اور میرے بارے میں کیا سوچیں۔

وہ بزرگ اپنے ساتھی کے ساتھ ہنستا گاتا ہوا جھومتا ہوا دور بازار کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس کی شخصیت اور مزاج کا مجھ پر گہرا اثر ہوا تھا۔

جب میں کام پر آئی تو ان بزرگوں کا عکس میرے ذہن میں اتر آتا۔ دو باتیں چائے والی بات کو یاد کر کے مجھے بے اختیار ہنسی آجاتی۔ یوں لگتا کہ انہیں کسی بات کی چنتا ہی نہیں تھی۔ یہ لوگ بے فکر گھومتے رہتے تھے۔ جس طرح سے ان کا دل خوش رہتا تھا اس طرح سے ہی اپنے روز مرہ کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ میں سوچتی رہتی ہوں کہ انسان کتنا خود غرض ہے۔ اسے جہاں اپنا فائدہ نظر آتا ہے وہاں ہی وہ دستور اپنے حق میں مرتب کر لیتا ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر بزرگ لوگ دولہا دولہن کی عمر کی طرف خاص توجہ دیتے ہیں۔ ہونے والی دلہن کی عمر دولہے کی عمر سے دو چار سال کم کو واجب مانا جاتا ہے۔ عمر میں زیادہ فرق کا ہونا غیر مناسب سمجھا جاتا ہے اور سماج غیر موزوں ہونے والے رشتوں کی مخالفت کرتا ہے۔

ان بزرگوں کے شوقِ فراوانی کو دیکھ کر میں حیران تھی۔ اس بزرگ نے اپنی عمر سے آدھی سے کم عمر کی عورت کو اشتیاق سے دیکھتے رہنا اپنی روایت کا حصہ بنایا تھا اور اپنا دل خوش کرنے لگا تھا۔ اسے اپنے اس فعل و عمل میں کوئی برائی نظر نہ آئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھ بیٹھا تھا۔

وہ بزرگ حیات کے ایسے مرحلے پر پہنچ گیا تھا جہاں اس دنیا کی بہت سی باتوں کو بھولنا شروع کر دیتا ہے اور بہت سی باتوں کا تیاگ کر دیتا ہے۔ اس کا دھیان اگلی دنیا کی طرف ہو جاتا ہے۔ وہ اس کا حلیہ پہچاننے کی کوشش کرنے لگتا ہے اور اس کی نشان دہی کرنے لگتا ہے۔ وہ بزرگ اپنا حوصلہ بنائے ہوئے تھا۔ شاید اس نے اپنے تصور میں اس دنیا کا راستہ بنایا تھا۔ اسے وہاں پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ وہ مستعدی سے اس دنیا کو سونگھ کر اس دنیا میں آسانی سے پہنچ جائے گا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بے فکر نظر آ رہا تھا۔

وہ بزرگ زندگی کے دن کاٹ نہیں رہا تھا بلکہ بڑے مزے سے جی رہا تھا اور اس کا لطف اٹھا رہا تھا۔ وہ زندگی کو ڈھو نہیں رہا تھا بلکہ اس پر سواری کر کے ضعف کو اپنے پاؤں تلے روند رہا تھا۔ وہ بے تکلف تھا۔ اس کی باتوں میں اپنا پن تھا۔ اس نے دوریاں کم کر دی تھیں۔ وہ مجھے میرے نام سے بڑے پیار سے پکارنے لگا تھا۔ مجھے اچھا لگتا تھا۔ وہ زندہ دل تھا۔ خوش گفتار تھا اور پُر خلوص تھا۔

وہ بزرگ ڈاک خانہ میں آتا رہتا تھا۔ وہاں آنے پر اس کا پہلا کام میری طرف پیار سے دیکھنا ہوتا تھا۔ اسے مشرق کی گلی میں ہر روز کوئی کام نکل آتا تھا۔ اسے دیکھ کر ہنسی کا فوارہ چھوٹ جاتا تھا۔ وہ برف جیسے کا صلاحی لگتا تھا۔ اسے زندگی کی بے ثباتی بھول گئی تھی۔ وہ عمر جاوداں کی تمنا لیے ہوئے تھا۔ اس کی زندگی کی لغت سے شاید اداسی کا لفظ حذف ہو گیا تھا۔

جب سے وہ بزرگ وہاں آنے لگا تھا میری مایوسیاں... میری اداسیاں... میرے اکلاپے دور ہو گئے تھے۔ میری تنہائیاں مجھے نہ ستاتی تھیں۔ مجھے آدمی کی چاہت سے کہیں زیادہ وقت کے اچھی طرح سے کٹ جانے کی خوشی ہونے لگی تھی۔ گھر کی گھٹن سے باہر کا کھلا پن مجھے زیادہ بھانے لگا تھا۔ اس بزرگ نے مجھے زندگی کی ایک ایسی راہ دکھا دی تھی جہاں میں زندگی کے ہر لمحے کو خوشی کے پل میں بدلا جا سکتا تھا۔ اس نے مجھے ایک ایسا سبق سکھایا تھا۔ میں جس کی کمی تھی اس کی رنج ہوتے ہوئے بھی میں اپنا وقت زندہ دلی سے گزار سکتی تھی۔ خوشی خوشی زندگی کو گزارنے اور بھرپور طور پُرکیف زندگی جینے کا وہ مجرب نسخہ تھا جسے مجھے اس بزرگ نے عطا کیا تھا۔

# کھڑکی سے آنے والا جھونکا

نورالحسنین (اورنگ آباد، بھارت)

وہ ایک دم چپ ہو گئی پھر اُس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوئے اور اُس نے اپنے بگڑے ہوئے لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا "دیکھو جی... وہ لڑکا پھر ہماری طرف دیکھ رہا ہے...!"

میں نے پلٹ کر دیکھا واقعی وہ کھڑا تھا اُس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ جونہی میری نظریں اُس سے ٹکرائیں اُس کا سیدھا ہاتھ خود بخود پیشانی تک اُٹھ گیا اور میں اندر ہی اندر دہشت زدہ ہو کر رہ گیا۔ اور وہ چپ چاپ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

خدا جانے یہ لڑکا کون ہے....؟ کہاں سے آیا ہے....؟ اور کیوں آیا ہے....؟ لیکن جب سے آیا ہے جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ جب بھی دیکھو اُس کی آنکھیں میرے ہی گھر کے اندر ہوتی ہیں۔ کیا اُسے پتہ نہیں ہے کہ تانک جھانک کی عادت اچھی نہیں ہوتی....؟ ٹھیک ہے نوجوانی میں غلطیاں ہوتی ہیں لیکن اس طرح....؟ یہ تو چوبیس گھنٹے میرے ہی گھر کے اندر گڑا رہنا چاہتا ہے....!

جب وہ میری نظروں سے کافی دور ہو گیا تو میں اپنی بیوی کی طرف پلٹا تا کہ اُس جھگڑے کو مکمل کر لوں جو ہم دونوں کے درمیان جاری تھا لیکن شاید وہ لڑنا بھول گئی تھی۔ اُس کے چہرے پر گہری فکرمندی کی لکیریں ابھر آئیں اور اُس کی زبان سے نکلا "آخر وہ ہمارے گھر میں اس طرح کیوں جھانکتا رہتا ہے"

"یہ تو اُس سے پوچھنے کے بعد ہی پتہ چلے گا.....!" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"اُس سے آپ پوچھیں گے پاپا.....؟" میرا بیٹا چائے کی پیالی ٹیبل پر رکھتا ہوا بولا "کوئی ضرورت نہیں..... اُس کا بُرا وقت اب آ گیا ہے..... اسے اُس کی آنکھیں نہ پھوڑ دوں تو میرا نام شوکت خان نہیں.....!"

"بیٹے شوکت خان.....!" میں اُس کی طرف پلٹا "کبھی کبھی سمجھداری کا بھی ثبوت دیا کرو..... ورنہ اپنا نام مجھے بھی اُس اخبار میں بھی دکھاؤ جو امتحانوں کے نتائج چھاپتا ہے..... ورنہ..... بات کو خواہ مخواہ بڑھا جائیں گے دادا گیری کریں گے..... اب دو سال سے مسلسل فیل ہو رہے ہو تم..... اس کا احساس ہے تمہیں.....؟"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا اور غصے سے اُٹھ کر چلا گیا۔

"دیکھا تم نے اس لڑکے کے تیور.....!" میں بیوی کی طرف پلٹا تو وہ بولی "اصل قصہ تو ایک طرف رہ گیا اور یہاں آپس میں جھک جھک ہو رہی ہے.....!"

"اصل قصہ.....!" میں دل ہی دل میں بڑبڑایا اور پھر میرے قدم زینے کی طرف اُٹھ گئے.... اس قصے کا خاتمہ کیسے کروں....؟ کم بخت ایک عذاب کی صورت پورے گھر پر مسلط ہو گیا۔ جب دیکھو گلی میں کھڑا ہے۔ بدتمیز کہیں کا.... بد اخلاق.... نہیں شاید اخلاق اچھے ہیں اُس کے کیونکہ جب بھی اُس سے نظریں ملتی ہیں وہ سلام ضرور کرتا ہے.... سلام کرتا ہے یا مذاق اُڑاتا ہے....؟ ہاں.... مذاق ہی اُڑاتا ہوگا.... اُس کے چہرے پر ہمیشہ کس قدر تمسخر آمیز مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے.... کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو....؟ ارے تنگ جین پینٹ اور لال دھاری بنیان پہننے سے کوئی ہیرو ہو جاتا ہے....؟ ہونہہ.... کمبخت.... پتہ نہیں کیا چاہتا ہے۔

سیڑھیاں چڑھ کر جونہی میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اپنی بڑی لڑکی کو کھڑکی سے لگی ہوئی پایا۔ ایک لمحہ یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اُس مچھلی کی آنکھ کو کھوج لیا ہے جس پر ارجن کے بان نے ایک نئی جیون کتھا لکھی تھی۔ میں تیزی سے اُس کے قریب پہنچا اور جونہی میں نے باہر دیکھا میرا سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ سڑک سنسان تھی اور اُس کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ میں کس قدر کھسیانہ ہو گیا "کیا دیکھ رہی ہو بیٹی شبانہ.....؟"

"آں....؟" میرے اس اچانک سوال پر وہ چونکی اور پھر وہ اسی طرح نیچے جھانکتی ہوئی بولی "پاپا.... آسمان میں پتنگ تو اُڑ رہی ہے لیکن اُڑانے والا نظر نہیں آ رہا ہے.....!"

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ سرخ رنگ کی ایک پتنگ کسی دلہن کی طرح کانپ رہی تھی "بیٹی.....! تم اُڑانے والے کی تلاش مت کرو.... بس اتنا سمجھ لو کہ جب تک پتنگ کا رشتہ ڈور سے بندھا ہوا ہے وہ اسی طرح بے خوف آسمان میں اُڑتی رہے گی مگر جونہی.....!"

"پاپا.....!" اُس نے میری بات کاٹی اور پھر میری طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی "یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں....؟ کیا ہو گیا آپ کو....؟"

"نہیں.... کچھ نہیں.....!" میں لاجواب ہوتے ہوئے بولا "شبانہ اب تم بڑی ہو گئی ہو اور اب تمہیں.....!"

"پاپا.... مجھے رشتوں کی اہمیت سمجھانے کی ضرورت نہیں.... وہ پتنگ ہی کیا جو صرف ڈور کے بھروسے آسمان میں اترائے.... مجھے اپنے آپ پر پورا بھروسہ ہے.....!"

میں اُسے دیکھتا رہ گیا اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی زینے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے باہر جھانکا تو پتنگ آسمان سے زمین کی طرف غوطہ لگا رہی تھی۔

وہ سوچنے لگا کہ اب مجھے بھی اپنی پتنگ کو اُڑا دینا چاہئے۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈور کی اہمیت سے انکار کر دے اچانک ہوا میں تیزی آ گئی اور میں نے جلدی سے کھڑکی کے پٹ بند کر دیے اور سوچنے لگا میرے تصور میں وہی لڑکا آ دھمکا اور میں نے پوری قوت کے ساتھ اُسے جھٹک دیا۔ اُس کے چہرے

پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ گویا وہ مجھے چیلنج کر رہا تھا.... اچھا پھر کوئی اور سوچ....؟ اور میں جوں جوں اپنی سوچ کو کسی نقطے پر مرکوز کرتا عقل اُسی لڑکے کی بن جاتی تنگ آ کر میں گھر سے باہر نکل گیا۔

میں بے مقصد اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا کہ میری ملاقات مدھوسدن سے ہو گئی۔ وہ مجھے گھر پر چلنے کے لیے مجبور کرنے لگا۔ ٹھیک اُسی وقت وہ لڑکا مجھے نظر آ گیا۔ اُس نے دور سے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اگلا موڑ کاٹے گا اور پھر تنگ گلی سے ہوتا ہوا سید حامد کے گھر کی طرف بڑھ جائے گا۔

''کیا سوچ رہے ہو یار....؟'' مدھوسدن نے مجھے ٹہوکا دیا۔

''میرا خیال ہے مجھے فی الحال اپنے ہی گھر جانا چاہیے....!'' میں اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولا لیکن وہ مانا نہیں اور مجھے اپنے گھر کی طرف گھسیٹتا ہوا بولا ''آج تو میں تجھے اپنے گھر لے جا کر ہی رہوں گا....!''

اور پھر ہم دونوں اُس کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ پوچھتا رہا کچھ کہتا رہا لیکن میرا دماغ تو کہیں اور تھا۔ اور پھر جیسے ہی ہم دونوں اُس کے دروازے پر پہنچے۔ شیلا بھابھی کی آواز کانوں سے ٹکرائی ''اکیلے ہی آئے ہو....؟ تم ادیب لوگ بڑے خود پسند ہوتے ہو، اپنے سوا کسی کو اہمیت نہیں دیتے....!''

''بھابھی.... اب آپ کسے اہمیت دلوانا چاہتی ہیں....؟''

''میں پوچھتی ہوں کیا فرق پڑتا اگر تم سلمیٰ کو بھی اپنے ساتھ لے آتے....؟''

''اس عمر میں....؟ ہوائے.... بھابھی!....'' میں نے ہاتھ جوڑے تو وہ بولی ''شرم تو اُسے آنا چاہیے تمہارے ساتھ چلتے ہوئے سارے بال سفید ہو گئے ہیں تمہارے.... اور وہ.... وہ تو اب بھی لڑکی لگتی ہے جیسے اپنی بیٹیوں کی بڑی بہن....!''

اچانک سلمیٰ کا چہرہ میری آنکھوں میں آ گیا اور میرے چہرے پر ایک خوش نصیب شوہر کی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آپ لوگ باتیں کیجیے میں ابھی ناشتہ لگواتی ہوں....!'' شیلا بھابھی باورچی خانے کی طرف بڑھی اور ہم دونوں ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ جہاں ہم نے مختلف موضوعات پر گفتگو کی لیکن وہ لڑکا پھر بھی میرے دماغ سے نکلا نہیں.... مجھے عجیب سی بے چینی ہونے لگی اور میں کچھ دیر کے بعد وہاں سے اُٹھ گیا۔

میں تیزی سے اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا لیکن کوئی نہ کوئی مجھ سے ٹکراتا رہا۔ کبھی میں کچھ دیر کسی ہوٹل میں رُک گیا، کبھی کسی کے گھر اور کبھی سڑک کے کنارے کھڑا گپ شپ لڑاتا رہا اور وہ لڑکا بار بار کسی گدھ کے مانند میرے دماغ پر اپنی چونچیں مارتا رہا۔ یہاں تک کہ دن پورا تمام ہو گیا۔ پھر رات کی زلفیں کالی ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ سڑکوں پر بھی سناٹا ہونے لگا۔ میں تھکا ماندہ اپنے گھر لوٹا۔ گھر کے تمام افراد سو چکے تھے۔ سوائے میری چھوٹی بیٹی رخسانہ کے جس کے کمرے کا بلب روشن تھا۔ میں سمجھ گیا وہ اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گی۔ آخر اُسے ڈاکٹر بننا ہے نا.... میں دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھتا ہوا بالائی منزل پر پہنچا۔ اور جونہی اپنے کمرے میں داخل ہوا سرخ رنگ کے زیرو بلب کی روشنی میں سلمیٰ کا چہرہ بڑا ہی دلکش محسوس ہوا۔ میں دل ہی دل میں پھر ایک بار مسرور ہو گیا۔ کپڑے تبدیل کرتے وقت معاً ایک خیال سرعت کے ساتھ میرے دماغ میں داخل ہوا اور میں نے فوراً کھڑکی کھول دی اور جیسے ہی باہر جھانکا مجھے جھٹکا سا لگا۔ جیسے کسی نے بجلی کے ننگے تار میرے بدن میں چبھو دیے ہوں۔ میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ مرزا صاحب کے مکان کے ایک کمرے کا بلب اُسی طرح روشن تھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ لڑکا مجھے سلام کر رہا ہے اور اُس کے چہرے پر کسی فاتح کی مسکراہٹ بکھری ہوئی ہے۔ یہ رخسانہ کی بچی میری ناک کٹوا کر ہی دم لے گی شاید.... ایک تو غصہ اور پھر بے بسی میری حالت عجیب سی ہو گئی۔ میری آنکھوں میں اندھیری سی چھا گئی اور میں خاموش پلنگ کی پٹی پر ٹک گیا۔ لیکن پھر بھی میری بیوی جاگ گئی۔ اُس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر بولی ''سنتے ہو جی.... وہ لڑکا آج تمام دن اپنے ہی گھر کے اطراف چکر لگاتا رہا.... کیا سمجھتا ہے خود کو....؟''

میں نے فوراً خود پر قابو پا لیا۔ دراصل میں شور کیے بنا ہی اس مسئلے کو سلجھانا چاہتا تھا۔ میں نے لاپروائی سے جواب دیا ''سمجھا کرے.... ہمیں اس سے کیا....؟''

''سمجھا کرے....؟'' وہ غصے سے اُٹھ بیٹھی ''یہ لڑکیوں کا گھر ہے خدانخواستہ بدنامی ہو گئی تو اُن کی شادیاں ایک مسئلہ بن جائیں گی....!''

''تم ٹھیک کہتی ہو....!'' میں نے آہستہ سے کہا ''کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا ہی پڑے گا!''

''لیکن کب....؟'' اُس نے اپنا سیدھا ہاتھ ہوا میں نچایا ''میں نے تو اُسی وقت کہا تھا جب تم مجھے اپنی نئی کہانی سنا رہے تھے اور وہ بے خوف اِدھر گھورے جا رہا تھا۔ میں پوچھتی ہوں اُس وقت بھی کیا کیا تھا تم نے....؟ بس اُٹھ کر اپنی کھڑکی بند کر دی تھی اور اپنی کہانی میں مصروف ہو گئے تھے....!''

''اور میں اب بھی یہی کہوں گا.... اپنی کھڑکیاں بند رکھا کرو اگر تمہیں اپنی عزت پیاری ہے تو....!'' میں نے فیصلہ کن آواز میں کہا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اُس نے حیرت اور غصے سے میری طرف دیکھا۔ اور پھر اپنے آپ میں بڑبڑانے لگی.... دیکھتی ہوں اب اُسے.... ذرا کل تو آنے دو.... اُس کا چہرہ نہ نوچ ڈالوں تو میرا نام دوسرا رکھ دینا....!'' اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور پھر اُسی غصے سے پلنگ سے نیچے اُتر گئی اور کھڑکی کا پٹ بند کر کے وہیں فرش پر لیٹ گئی اور پتہ نہیں کب تک بڑبڑاتی رہی۔

دوسرے دن جیسے ہی میں گھر سے باہر نکلا مرزا صاحب کو اپنے چبوترے پر اخبار پڑھتے ہوئے پایا۔ میں اُن کے قریب پہنچا "مرزا صاحب.... وہ شرقی سمت والا کمرہ آپ نے کرائے پر اُٹھا دیا کیا....؟"

اُنھوں نے اخبار سے سر باہر نکالا "وہ....ہاں.... اُس میں میرے مرحوم دوست کا لڑکا رہتا ہے.... کیوں....؟" مرزا صاحب نے مجھے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"نہیں.... کچھ نہیں....وہ....!" میں کہتا تو کچھ اور چاہ رہا تھا لیکن منہ سے نکلا کچھ اور۔

"اوہ سمجھا....!" اُنھوں نے میری آنکھوں میں جھانکا "تمہاری دو لڑکیاں ہیں نا....؟ لیکن بھائی ابھی تو وہ پڑھ رہا ہے....!"

مجھ پر تو جیسے گھڑوں پانی گر گیا۔ میں اُن کے پاس سے چپ چاپ نکل گیا۔ ایک سوچ میرے سر پر سوار ہو گئی کہ آخر میں یہاں آیا ہی کیوں تھا؟ کیا لڑکیوں کا باپ ہر ایرے غیرے لڑکے کو صرف للچائی ہوئی نظروں ہی سے دیکھتا ہے....؟ یہی سوچتے ہوئے میں اپنے گھر چلا آیا۔ پتہ نہیں کیوں اب مجھے اپنی لڑکیوں کی صورتیں زہر معلوم ہونے لگی تھیں۔ میری طبیعت خواہ مخواہ چڑچڑی ہو رہی تھی۔ میں ڈانٹ ڈپٹ کے بہانے تلاش کرنے لگا۔ مجھے ہر چیز میں نقص نظر آنے لگا۔ اتنے میں شبانہ نے اطلاع دی "ممی....ابو پھر آیا ہے اور بے تحاشہ اِدھر ہی دیکھ رہا ہے....!"

لیکن سلمٰی کے جواب دینے سے پہلے ہی میں غصے سے دھاڑا "تم کیوں جاتی ہو کھڑکی کے قریب....؟ ہاں.... کیا میری عزت خاک میں ملا کر ہی دم لوگی....؟"

"میں....؟" اُس نے میری طرف بے بسی سے دیکھا۔ لیکن میری آنکھوں میں دُور دُور تک رحم نہ تھا "ارے تم اگر شرافت سے رہو تو کیا مجال کسی کی آنکھ اُٹھائے....؟"

وہ بپھرتی ہوئی روتی ہوئی میرے سامنے سے چلی گئی۔

"گھر میں بیٹھے بیٹھے اُسے کیا ڈانٹ رہے ہو....؟" معمول کے مطابق سلمٰی بیٹی کی طرف داری پر اُتر آئی "جاؤنا باہر.... اور اُس لونڈے کی خبر لو....وہ تو نہیں ہوگا تم سے....!"

"اچھا...! تو اب میں لونڈوں کے منہ لگوں....؟ ہاتھا پائی کروں....؟"

"ہاتھا پائی کرنے کو کون کہتا ہے....؟ پولیس میں اُس کی شکایت تو درج کرواسکتے ہیں....؟"

"اور جب کیا لکھواؤں....؟" میری آنکھیں غصے سے اُبل پڑیں "لکھواؤں کہ یہ لڑکا ہماری موجودگی میں ہماری لڑکیوں سے عاشقی کرتا ہے....؟ اور ہماری لڑکیاں....!"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں....؟" سلمٰی کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ پھر وہ سمجھانے والے انداز میں کہنے لگی "یہ تو میں نے بھی نہیں سوچا تھا واقعی ہم پولیس میں اُس کی شکایت درج نہیں کرواسکتے، بیٹی والے جو ٹھہرے.... ہر حالت میں رسوائی ہماری ہی ہوگی....!"

اُسے اس طرح ٹوٹا ہوا دیکھ کر میں بھی ٹوٹ گیا۔ میرا دل بھی اندر سے بھر آیا۔ جی چاہتا تھا خوب روؤں لیکن میں رو بھی نہیں سکتا تھا۔ سلمٰی نے میری طرف دیکھا وہ چاہتی تھی کہ میں اُسے دلاسہ دوں.... لیکن میں خاموش رہا۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اُس کی زبان ساتھ نہ دے سکی۔ اُس کی عجیب سی حالت ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور وہ تیزی سے میرے سامنے سے نکل گئی۔

ایک باپ کی حیثیت سے جو کچھ احتیاط کر سکتا تھا میں نے وہ سب کچھ کیا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر دبیز پردے ڈال دیئے لڑکیوں کا بے جا گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ جب بھی اُسے موقع ملتا وہ جھانکتا رہتا.... اُسے کسی موسم کی شدت بھی نہ روک سکی۔ آخر مجھے اُس پر ترس آ گیا اور ایک روز میں نے سلمٰی سے کہا "سلمٰی ہماری کوئی پابندی بھی اس لڑکے کو توڑ نہ سکی....!"

"پھر آپ کیا چاہتے ہیں....!" اُس نے میری طرف دیکھا۔

"پتہ نہیں کیوں وہ مجھے سچا لگا.... میرا خیال ہے اُسے قریب کر لیا جائے....!" میری باتیں سُن کر سلمٰی خوش ہو گئی "لیکن وہ ہماری کس بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے....؟"

میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا "یہ بات تمہیں اب تک معلوم نہیں....؟" اُس نے انکار میں گردن ہلائی۔

"لیکن یہ بات ہم لڑکیوں سے کیسے پوچھیں گے....؟" میرے اس سوال پر کچھ لمحے تک وہ بھی پریشان رہی اور پھر بولی "ایک ترکیب ہے....!"

"کونسی....؟" میں نے بیتابی سے پوچھا تو وہ بولی "وہ جب بھی ہماری کھڑکی کے سامنے آئے گا ہم کسی نہ کسی بہانے اپنی ایک لڑکی کو کھڑکی تک بھیج دیں گے اور اُن دونوں کے تاثرات کا مشاہدہ کریں گے چور پکڑا جائے گا....!"

ہم دونوں ہی ہنس پڑے۔

دوسرے دن گھر کا سارا ماحول ہی بدلا ہوا تھا۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹ چکے تھے۔ ہم دونوں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باہر کا منظر دریافت کر رہے تھے لیکن آج اُس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ کئی بار میں کھڑکی تک ہو آیا اور کئی بار میری بیوی گئی لیکن وہ غائب تھا۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ بڑی مشکل سے گزر رہا تھا۔ وقت کاٹنے کی خاطر میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

اور پلنگ پر لوٹ پوٹ کرنے لگا۔ سلمیٰ کسی اور کام میں مصروف ہو گئی مجھے عجیب سی بے چینی محسوس ہونے لگی۔ میں پھر ایک بار اُٹھ بیٹھا اور کھڑکی تک جیسے ہی پہنچا وہ مجھے نظر آ گیا۔ وہ کالی جین پینٹ اور سرخ رنگ کی ٹی شرٹ پہنے سر سے گھر کی طرف ہی آ رہا تھا۔ میں تیزی سے نیچے پہنچا اور سلمیٰ کو اشارہ کیا۔ سلمیٰ نے شبانہ کو حکم دیا "بیٹی ذرا کھڑکی کا پٹ تو سیدھا کرنا، ہوا اندر نہیں آ رہی ہے....!"

وہ جیسے ہی کھڑکی کی طرف بڑھی ہم دونوں کھڑے ہو گئے اور اُسے نظر نہ آتے ہوئے اُس کا مشاہدہ کرنے لگے۔ شبانہ نے کھڑکی کا پٹ پوری طرح کھول دیا۔ باہر جھانکا، اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی بیزارگی عود کر آئی اور وہ تیزی سے پلٹ گئی لیکن میں نے دیکھا، اُس کے پلٹنے سے پہلے ہی وہ لڑکا بھی پلٹ چکا تھا۔ سلمیٰ نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا گویا اعلان کر رہی ہو کہ چور پکڑا گیا۔ ہم دونوں کے چہروں پر بھی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

شام کو میں نے سلمیٰ سے کہا "اُس کا رجحان شبانہ کی طرف نہیں ہے...!"

"ہاں....!" اُس نے میری تائید کی "وہ شاید رُخسانہ کو چاہتا ہے...!"

"وہ تو واضح ہو گیا، لیکن خود رخسانہ.....؟"

"ہاں....! کل اُس کا بھی مشاہدہ کر لیں گے....!"

ہم دونوں پھر ایک بار ہنس پڑے۔

وہ رات ہم دونوں کو ایسی نیند آئی کہ ساری زندگی اس طرح کی نیند کبھی نہیں آئی تھی۔ یہاں تک کہ صبح ہم دونوں اُس وقت اُٹھے جب بچوں نے ہمیں آوازیں دیں۔ معمولات سے فراغت پانے کے بعد پھر وہی انتظار تھا۔ میری عجیب سی کیفیت تھی۔ میں سوچنے لگا۔ ایک وہ بھی وقت تھا کہ اُس کی آمد غصے کا سبب ہوا کرتی تھی۔ اور آج......!

اچانک سلمیٰ نے آنکھوں سے اشارہ کیا میں سمجھ گیا کہ وہ باہر سڑک پر کھڑا ہے۔ میرا دل خوشی کے مارے بلیوں اُچھلنے لگا۔ میں نے بڑی محبت کے ساتھ رخسانہ سے کہا "بیٹی ذرا کھڑکی سے جھانک کر تو دیکھو، مرزا چاچا اپنے چبوترے پر بیٹھے ہیں یا نہیں.....؟"

رخسانہ کھڑکی کی طرف بڑھی اور ہم دونوں نے وہی محفوظ مورچے سنبھالے۔ دونوں کی سانسیں رُکی ہوئی تھیں۔ رخسانہ نے باہر جھانکا، وہ اوپر ہی دیکھ رہا تھا لیکن نہ تو اُس نے رخسانہ سے آنکھیں ملائیں اور نہ ہی رخسانہ نے اُسے لفٹ دی۔ وہ سیدھے مرزا صاحب کے مکان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "پاپا.....وہ ابھی تک گھر سے باہر نہیں نکلے ہیں....!"

ہم دونوں کے چہرے فق ہو گئے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اور پھر ہماری نظریں جھک گئیں۔ ہمارے کانوں میں شہنائیاں گونجتے گونجتے رہ گئیں۔ میں چپ چاپ وہاں سے اُٹھ گیا اور زینے کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک ایک سیڑھی مجھے پہاڑ سی محسوس ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں کب میں اُن ساری سیڑھیوں پر سے ہوتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا، اور کب پلنگ پر ڈھیر ہو گیا۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ صدمے سے میری آنکھیں بند ہو گئیں اور پھر شاید میں سو گیا تھا.... بہت گہری نیند سو گیا تھا۔

"میں نے کہا اُٹھو جی.... آج یہ بے وقت کیسی نیند....؟" سلمیٰ نے مجھے بیدار کیا تو میں اُٹھ بیٹھا اور اُسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بری طرح جھینپ گئی اور بولی "ایسے کیا دیکھ رہے ہو جی....؟"

"سلمیٰ...! میں نے بڑا عجیب ایک خواب دیکھا ہے....!"

"خواب....؟" سلمیٰ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری "صبح جو خواب ٹوٹا اُس سے بھیانک تو کوئی اور خواب نہیں ہو سکتا....؟" اُس نے میری طرف اُداس نظروں سے دیکھا "تعجب ہے اُسے نہ تو شبانہ پسند ہے اور نہ ہی رخسانہ.... تو پھر وہ اس گھر میں کسے دیکھتا ہے....؟"

"وہ تمہیں دیکھتا ہے....!" ایک دم میری زبان سے نکل گیا۔

"کیا....؟؟؟" سلمیٰ کی تقریباً چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی "ایسی ذلیل بات تمہاری زبان پر....؟ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی....!" وہ دونوں ہاتھوں میں اپنے چہرے کو چھپا کر رونے لگی۔

"سلمیٰ مجھے غلط نہ سمجھو....!" میں اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے بولا "میں نے پڑھا ہے کہ بعض نوجوانوں کی جنسی نفسیات بھی عجیب ہوتی ہے انہیں اپنی ہم عمر لڑکیوں سے زیادہ بڑی عمر کی عورتیں پسند آتی ہیں۔ اور شاید اُس لڑکے کی بھی یہی نفسیات ہے....!"

"میں نہیں مانتی یہ سب کچھ....!"

"مانتا تو میں بھی نہیں ہوں، لیکن اب یہ تجربہ بھی کر کے دیکھ لیں گے....!"

"کیا....؟؟؟"

میں سلمیٰ سے آنکھیں چار نہ کر سکا۔

"چھی.... تو تمہیں بھی مجھ پر اس عمر میں شک ہونے لگا ہے آنے دو اُسے.... ارے تم کیا تجربہ کرو گے.... وہ آیا تو میں خود اُسے دیکھوں گی۔ تم کیا سمجھتے ہو....؟" وہ بڑبڑاتی ہوئی غصے سے اُٹھی اور کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ جیسے جیسے قدم اُٹھا رہی تھی۔ میں ویسے ویسے لرز رہا تھا میرے کانوں میں شہلا بھابھی کے الفاظ گونجنے لگے۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تو جانے کیوں آج مجھے وہ اپنی دونوں بیٹیوں کی چھوٹی بہن محسوس ہونے لگی۔ پھر میں نے اپنے آپ کا جائزہ لیا..... یہ کیا مجھ پر تو پورا بڑھاپا چھا چکا تھا۔ وہ کھڑکی سے قریب اور قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میں اپنی ہڈیوں کو کڑکڑاتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کھڑکی تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے سڑک پر اُس لڑکے کو موجود پایا۔ جونہی اُس نے سلمیٰ کو دیکھا اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ پھر اُس کا

سیدھا ہاتھ خود بخود اس کی پیشانی کی طرف اٹھا۔ وہ اُسے دیوانوں کی طرح تکے جا رہا تھا۔ مجھے چکر سے آنے لگے میرے کان سُن سے ہو گئے۔ یہاں تک کہ میری سماعت بالکل ختم ہو گئی اور میں دیوار پکڑ کر دھم سے نیچے بیٹھ گیا اور پھر میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔

جب میں نے آنکھیں کھولیں تو ڈاکٹر مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ میرا سر سلمٰی کی گود میں تھا اور میرے اطراف میرے تینوں بچے کھڑے تھے۔ میں نے سلمٰی کی طرف دیکھا اُس کی آنکھوں میں محبت کے سارے ہی سمندر موجزن تھے۔ مجھے عجیب سا اطمینان ہوا اور پھر میں نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

سلمٰی کی دن رات خدمت اور بچوں کی محبت نے مجھے دوبارہ کھڑا کر دیا تھا میں نے دیکھا کھڑکیوں اور دروازوں پر پھر ایک بار دبیز پردے جھول رہے تھے اور اب کسی کو بھی یہ فکر نہیں رہا تھا کہ باہر بھی کوئی کھڑا ہے۔

میں رفتہ رفتہ پھر زندگی کے معمولات کی طرف لوٹ آیا۔ گھر میں ایک بار پھر خوشیاں رقصاں تھیں۔ شبانہ اور رخسانہ اپنی پڑھائی میں مگن تھیں۔ میرا بیٹا ہوسٹل میں شفٹ ہو گیا تھا۔ اور وہ.... وہ لڑکا خدا جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اُس روز کے بعد سے پھر وہ مجھے کبھی کالونی میں نظر نہ آیا۔ میں دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتا کہ طوفان آیا بھی اور بنا گزند پہنچائے گزر بھی گیا۔ ایک روز میں اپنی سائیکل پر گھومنے نکل گیا۔ مختلف دوستوں سے ملاقاتیں کرتا ہوا جب میں واپسی کے لئے پلٹا تو کافی تھک چکا تھا۔ میں کسی طرح سائیکل چلا رہا تھا کہ چڑھاؤ شروع ہو گیا۔ میری سانس پھولنے لگی تھی۔ مجبوراً میں سائیکل سے نیچے اُتر گیا اور پیدل چلنے لگا۔

"انکل آپ....؟" اچانک پیچھے سے ایک آواز سنائی دی۔ میں پلٹا 'وہی لڑکا تھا۔ جو بڑی تیزی سے میرے قریب آ رہا تھا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے اُس کی طرف گھور کر دیکھا تو وہ بولا "لایئے انکل.... سائیکل میرے حوالے کر دیجئے میں اُسے لے کر چلتا ہوں.....!"

"کوئی ضرورت نہیں.....!" میرا لہجہ نہایت روکھا تھا۔

"کمال ہے انکل.....! اگر آپ کی جگہ میرے والد ہوتے تو کیا میں ایسا نہیں کرتا....؟"

"لیکن میں تمہارا باپ نہیں ہوں.....!" میں آگے بڑھ گیا۔ تو اُس نے میری سائیکل کو پیچھے سے پکڑ لیا "والد نہ سہی آپ میرے انکل تو ہو سکتے ہیں.... لایئے سائیکل.....!" اور پھر اُس نے اُسے میرے ہاتھوں میں سے چھین لیا اور تیز تیز چلنے لگا۔ میں بھی تیز تیز اُس کے پیچھے قدم اُٹھانے لگا۔ طبیعت چاہتی تھی کہ اُسے اس قدر باتیں سناؤں کہ اُس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔ لیکن پتہ نہیں کیوں زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور پھر بولا "انکل.... واقعی آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں...!"

"اچھا....؟" میں نے حقارت سے اُس کی طرف دیکھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اُس کے قریب پہنچ گیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "برخوردار اس گمان میں مت رہنا کہ میں کمزور ہو گیا ہوں....!"

وہ زور سے ہنسا "انکل آپ واقعی بہت اچھے انسان ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ صحت مند رکھے.....!"

"وہ تو رکھے ہی والا ہے۔ تم اطمینان رکھو! اور ساجتر اوے اب میری سائیکل میرے حوالے کر دو۔ میرا مکان قریب آ چکا ہے اور اب راستہ بھی ہموار ہے.....!" میں نے سائیکل کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ بولا "انکل آپ کی سانس تو ٹھیک ہو جانے دو.... ایسی حالت میں سائیکل چلانا ٹھیک نہیں ہوتا.... نہیں نہیں.... میں ابھی آپ کے ہاتھوں میں سائیکل نہیں تھما سکتا.... چلیے آپ.....!" اور وہ پھر ایک بار مجھ سے آگے ہو گیا۔

میرے تن بدن میں آگ سی دہکنے لگی... تو اب یہ مجھ سے ہمدردی جتا کر میرے گھر کے اندر رسائی چاہتا ہے میں بیوقوف نہیں ہوں۔ جو اپنے ہی ہاتھوں اپنے گھر کا سکون برباد کر دوں....؟ بہت ہوشیار سمجھتا ہے خود کو! میں چپ چاپ قدم اُٹھا رہا تھا۔ میرے دل و دماغ میں ایک جنگ سی چھڑی تھی۔ سوچ کے دھارے کبھی کچھ منظر دکھاتے اور کبھی کچھ.... مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب میرے گھر کے دروازے تک پہنچ گیا تھا اور کب سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں جونہی اُس کے قریب پہنچا اُس نے سائیکل میرے حوالے کر دی اور پھر نہایت ادب سے مجھے سلام کیا اور تیزی سے پلٹ گیا۔ میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پتہ نہیں کیوں میرے دل نے خواہش کی کہ مجھے اُس کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ میں نے اُسے آواز دی تو وہ بے تحاشہ دوڑتا ہوا میرے پاس چلا آیا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولا "انکل شکریہ کیسا....؟ البتہ آپ اجازت دیں تو میں ایک بات کہوں....؟"

میرا ماتھا ٹھنکا۔ خدا جانے یہ اب کون سی بات کہنے والا ہے لیکن میری اجازت سے پہلے ہی وہ بول پڑا "انکل.....! میں جب جب بھی آنٹی کو دیکھتا ہوں مجھے اپنی مرحومہ ماں کی یاد آ جاتی ہے۔ دونوں کے چہروں میں بڑی مماثلت ہے.... لیکن انکل.....!"

میں حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ کہے جا رہا تھا "اُس روز پتہ نہیں آنٹی کو کیا ہو گیا تھا۔ انہوں نے میری اس قدر بے عزتی کی تھی کہ میں نے یہ کالونی ہی چھوڑ دی۔ اب میں یہاں سے بہت دور رہتا ہوں لیکن انکل.....!"

وہ پتہ نہیں کیا کچھ کہتا رہا لیکن میرے کان سماعت کھو چکے تھے۔ میرا پورا بدن خوشی سے جھوم اُٹھا تھا۔ میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی فرحت محسوس کر رہا تھا۔ وہ پتہ نہیں کب تک مجھ سے باتیں کرتا رہا اور مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں اُس روز کب اپنے گھر میں داخل ہوا۔

# معصوم علی

دیپک بُدکی (دہلی، بھارت)

نام علی اسماعیل عباس، عمر بارہ سال۔ ماں باپ کے بارے میں نہ تو ٹیلی ویژن نے کوئی اطلاع دی اور نہ ہی اخبارات نے صرف اتنا بتایا کہ شمالی بغداد کے ضلع دیالہ بریج میں اس کا گھر امریکی بمباری کی زد میں آ کر تباہ ہو گیا۔ باپ، بھائی اور حاملہ ماں..... کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ ایک خالہ ساتھ میں رہتی تھیں۔ اس کا بھی سارا خاندان ختم ہو گیا۔

یہ تھی اس دن کی تازہ خبر۔ ٹیلی ویژن پر بار بار علی کی تصویر دکھائی جا رہی تھی۔ ننھا سا گول مٹول معصوم چہرہ، جس پر درد کی شدت کا کسا ؤ عیاں تھا۔ دو بازو جسم کے پتلے کی مانند کہنیوں سے کٹے ہوئے جن پر مرہم پٹی کی گئی تھی۔ سر کے ارد گرد بھی بینڈیج بندھا ہوا تھا۔ سارا بدن میزائل کے شراروں سے جھلس چکا تھا۔ الکندی اسپتال کے ڈاکٹروں نے اس پر مرہم لگا دیا تھا اور گرد سے بچانے کے لئے اُسے خصوصی چوبی کٹہرے میں رکھا تھا۔

اُسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے مصلوب یسوع مسیح کی یاد آ گئی۔ کسی نے اس کو صلیب سے اتار کر یہاں اسپتال کے بستر پر لٹا دیا تھا۔ ایک معصوم بچپن داغدار ہو چکا تھا۔ ایک غنچہ بن کھلے مرجھا گیا تھا۔ کون جانے اس بے مقصد جنگ کے دوران کتنے گھروں کے چراغ بجھ چکے تھے۔

انسانی فطرت کی گھناؤنی تصویر..... چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑی بڑی سلطنتیں ٹکرا رہی ہیں۔ سلطنتِ دارِ حرف است و بیر ہے تیں۔ پھر بھی آدمی حرص و ہوس سے باز نہیں آتا۔ میرے اور تیرے کے چکر میں عمر گنواتا ہے اور پھر خالی ہاتھ لوٹ جاتا ہے۔ اسی چکر میں کئی قومیں لٹ چکی ہیں۔ تہذیبیں نیست و نابود ہو چکی ہیں۔

میں پاس ہی بیٹھے اپنے بچوں کی جانب بار بار دیکھ رہا تھا اور ان کے سراپے کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ ان کے ہاتھ پاؤں صحیح سلامت ہیں یا نہیں؟ خدا جانے یہ وہم کیونکر میرے دل میں گھر کر گیا تھا۔

"پاپا..... یہ لڑکا تو اپاہج ہو گیا۔ اب یہ پہاڑ سی زندگی کیسے گزارے گا؟" میری بیٹی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر تشویش کی بے شمار شکنیں ابھر آئی تھیں۔ میری بیوی کی سوالیہ نگاہیں بھی میری طرف اٹھیں۔ وہ بھی اس سوال کا جواب مانگ رہی تھیں گویا یہ سب میرا ہی کیا کرایا ہے۔ انہوں نے مجھے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔

"ڈیڈی میرے خیال میں یہ لڑکا مر گیا ہوتا تو بہتر تھا۔ بے وقوف۔ اب کیسے جی سکے گا بے چارہ۔ میرے بیٹے کے چہرے سے اس کے اندر کا تذبذب صاف جھلک رہا تھا۔

مجھے چنتا ہو رہی تھی کہ اگلے روز میری کلاس کے طالب علم بھی مجھ سے ایسے ہی بے شمار سوالات پوچھیں گے اور میں لاجواب ہو جاؤں گا۔ انسانی حقوق، یو این او کا رول، امریکہ کی ہٹ دھرمی، باقی دنیا کی بے حسی، بے بسی اور لاچاری۔ دوسرے روز مجھے ایک سیمینار میں بھی شرکت کرنی تھی۔ وہاں تہذیب یافتہ سوسائٹی اور انسانی حقوق پر لیکچر دینا تھا۔ ابھی تک کچھ بھی نہیں لکھ پایا۔ ٹیلی ویژن نے یوں باندھ کر رکھ دیا ہے کہ اور کوئی بھی کام کرنے کو جی نہیں کرتا۔

ممکن تھا اگر الجزیرہ ٹیلی ویژن نہ ہوتا تو شاید مغربی چینلز یہ دل دہلانے والے مناظر نہ دکھاتے۔

علی اسپتال کی چھت کی کڑیاں گن رہا تھا۔ وہ گزری ہوئی رات کا منظر یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ ایک زوردار دھماکہ۔ ہر طرف افراتفری کا عالم۔ آناً فاناً چھت اور دیواریں تاش کے پتوں کی مانند گرنے لگیں۔ سیمنٹ کنکریٹ کے سلیب، لوہے کے ستون، اینٹیں، گارا، پلستر۔ سب کچھ گرنے لگا۔ عجیب اندھیروں میں کسی کو کچھ بھی نہیں سوجھا۔ اجل نے دلیل کی فرصت ہی کہاں دی۔ ہر طرف سے رونے، چیخنے اور چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگ ایک دوسرے کو بلا رہے تھے مگر کوئی کسی کی آواز نہیں سن پا رہا تھا۔

بابل کا جنازہ صدیوں بعد پھر اسی دھرتی پر اٹھے جا رہا تھا۔

علی خوف و دہشت کے مارے ایک کونے میں دبک کر بیٹھا رہا۔ ستون ٹوٹتے رہے، دیواریں گرتی رہیں۔ سارا مکان ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا۔ آوازیں ایک ایک کر کے اسی ملبے میں دب کر رہ گئیں۔

صبح جب نور کی کرنوں نے رات کی ظلمتوں پر غلبہ پایا تو بچے کھچے لوگ حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے ملبے کا جائزہ لیا۔ ملبے کے نیچے سے کسی زخمی روح کے کراہنے کی مسلسل آوازیں آ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک جٹ ہو کر ملبہ ہٹایا اور زخمی علی کو برآمد کیا۔ پھر چیختی چلاتی ایمبولینس اس کو الکندی اسپتال لے کر آ گئی۔

میں نے سی این این چینل بدل کر پی بی سی لگا دی۔ چینل کا نمائندہ علی سے سوال کر رہا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں علی نے کہا۔

"مجھے فوجی افسر بننے کا بڑا شوق تھا مگر اب نہیں ہے۔ اب چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر بن جاؤں۔"

اتنی بڑی قربانی دے کر اُسے تخریب اور تعمیر کا فرق معلوم ہو چکا تھا مگر اب وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ نہ وہ تخریب کے لائق تھا نہ تعمیر کے۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر کچھ سوچ کر دوبارہ بولنے لگا۔

"مگر میں اب ڈاکٹر بھی تو نہیں بن سکتا۔ میرے تو دونوں بازو کٹ گئے ہیں۔" اس کے چہرے پر مایوسی اور بے بسی تھی۔ وہ ٹی وی میں کھڑے ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔

"ڈاکٹر انکل! میں نے سنا ہے کہ آج کل مصنوعی بازو بھی لگائے جاتے ہیں۔ کیا آپ مجھے مصنوعی بازو لگا دیں گے؟ اگر میرے بازو نہیں ہوں گے تو میں کام کیسے کروں گا؟" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ شاید اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کچھ وقفے کے بعد وہ امالی بی بی سی کے نمائندے سے پوچھنے لگا۔

"انکل! آپ ہم لوگوں پر بمباری کیوں کرتے ہیں؟"

انگریز نمائندے کے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ ہسپتال کے ڈاکٹروں اور نرسوں کے پاس بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ سوال ہوا میں تحلیل ہو کر مستقبل کے لئے محفوظ ہو گیا۔

انٹرویو ختم ہو چکا تھا۔ میں نے پھر سے سی این این چینل لگا دی۔ امریکہ کا صدر لیکچر دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ عراق کی آزادی میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ البتہ آزادی حاصل کرنے کے لئے کچھ تو قربانیاں دینی ہی پڑتی ہیں۔

میرے بچے لیکچر سن کر مشتعل ہو گئے۔ "ظالم کہیں کا! اپنے بچوں پر گزری ہوتی تو سمجھ میں آتا کہ قربانی کیا ہوتی ہے؟" وہ صدر بش کو کوسنے لگے۔

"پاپا! ایسی آزادی کس کام کی جس میں ہزاروں بے گناہوں کی جانیں تلف ہوں۔ کتنے سارے معصوم بچے اپاہج ہو گئے۔ اس آزادی سے تو غلامی ہی بہتر ہے۔" میرے بیٹے نے اپنی رائے دی۔

"ہاں پاپا۔ پھر بھی کون سی گارنٹی ہے کہ وہاں کی غریب عوام کو آزادی سے جینے کا حق حاصل ہوگا۔" بیٹی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

میں ٹیلی ویژن دیکھنے میں مصروف تھا۔ کوئی جواب نہیں دے پایا۔ اُدھر صدر بش کی آواز گونج رہی تھی۔ "ہم نے ڈکٹیٹر صدام حسین کا خاتمہ کر دیا اور اب عراق میں جمہوریت بحال کرنا چاہتے ہیں۔"

"دنیا میں صدام حسین ہی ایک ڈکٹیٹر تو نہیں ہے۔ کتنے سارے ممالک ہیں جہاں جمہوری نظام نہیں ہے۔ امریکہ ان ممالک پر حملہ کیوں نہیں کرتا؟" میرے بیٹے نے سوال کیا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور انہماک سے ٹی وی دیکھتا رہا۔ خود کو آپ ڈیٹ کرنا میرے روز کا معمول بن چکا ہے۔ میں نے پھر سے چینل بدل دی۔

اس وقت بھی علی کی لائیو تصویریں دکھائی جا رہی تھیں۔ وہ ہسپتال کی چھت کو بڑے ستوں گھور کر دیکھ رہا تھا۔ وہ خلاؤں میں اپنے ماضی، حال اور مستقبل کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وارڈ میں ہر آنے جانے والے کی آنکھوں میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اس کی بے بس نگاہیں ہر ایک سے التجا کر رہی تھیں۔ "ذرا ملبے میں غور سے ڈھونڈو۔ شاید میرے ماں باپ ابھی زندہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہوں گے۔ وہ مجھے اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔"

چند روز بعد صدام حسین کا بت گرا دیا گیا۔ ابھی صدام حسین ملا نہیں تھا اس لیے اس کے بت سے ہی انتقام کی آگ بجھائی جا رہی تھی۔ امریکی فوجی بہت خوش نظر آ رہے تھے اور وہ لوگ بھی جو کبھی صدام حسین کے مظالم کا شکار ہوئے تھے۔ وہ صدام کے بت پر جوتے مار رہے تھے۔ انتقام کا جذبہ بھی کتنا سنگین ہوتا ہے۔ اس وقت کسی کو گمان بھی نہ گذر رہا تھا کہ امریکہ صدام حسین کو زندہ پکڑ پائے گا۔

اُدھر نجف اور کربلا سے ابھی بھی چھٹ پٹ گھناؤں کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ قوم سادات کا لہو آج بھی بہہ رہا تھا۔

نہ نیوکلیئر بم ملے اور نہ نیوکلیائی ری ایکٹر۔ نہ کیمیائی ہتھیار ملا اور نہ ہی جنگ کا جواز۔ جواز کا تو خیر کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ آدمی انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے کیے کا جواز ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ خواہ اس کا عمل صحیح رہا ہو یا غلط۔ انسانیت فنا ہو یا انسانیت کش۔ جواز ڈھونڈنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ صدر بش بھی اپنی اس کارروائی کا جواز ڈھونڈ ہی لیں گے۔

میری بیوی مجھے پلٹ پلٹ کر دیکھ رہی ہے۔ شاید کہنا چاہتی ہے کہ تم بھی صدر بش سے کچھ کم نہیں ہو۔ تم بھی اپنے نزدیک سے کاموں پر پردہ ڈالنے کے لئے لمبی لمبی تقریریں جھاڑتے ہو۔ میں تو مجبور ہوں۔ یقین نہ ہوتے ہوئے بھی یقین کر لیتی ہوں۔

چند ہی روز میں لوٹ کھسوٹ کا بازار بھی گرم ہو چکا تھا۔ لوگ کتنی جلدی اپنی مصیبتیں بھول جاتے ہیں۔ اوہاں! کتنی بڑی بڑی عالیشان عمارتیں ڈھ گئیں۔ مضبوط ترین مجسمے مسمار ہو گئے۔ جو کل تھا وہ آج نہیں ہے۔ لوگ مُردوں کی چھوڑی ہوئی جائیدادیں لوٹ لوٹ کر اپنے گھر بسانے لگے تھے۔ لوہے کی الماریاں، لکڑی کا فرنیچر، فریج، واشنگ مشینیں، پنکھے اور بھی بہت کچھ پرانی قبروں پر سے آج کل کھڑے ہو رہے تھے۔

رفتہ رفتہ سبھی لوگ علی کو بھول گئے۔ ٹیلی ویژن چینل بھی اور اخبارات بھی۔ وہ بے چارہ بدستور اسپتال میں اپنی زندگی کی لڑائی لڑ رہا تھا۔ اکیلا بالکل اکیلا۔ اس کو یاد آرہا تھا کہ پچھلے سال اس کے جنم دن پر جشن منایا گیا تھا۔ اس کے والدین، رشتے دار اور دوست احباب سبھی جمع ہو چکے تھے۔ اس کے والدین نے بڑے کمرے کو خوب سجایا تھا۔ قمقمے، غبارے، جھنڈیاں، کیک اور موم بتیاں۔ اس نے پانچ موم بتیاں بجھا دی تھیں۔ پھر کیک کاٹ کر اپنے ہاتھ سے ماں باپ کو کھلایا تھا۔

غیر ارادی طور پر علی نے اپنے داہنے بازو کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ وہ چند ساعتوں کے لئے یہ بھول گیا کہ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ محض وہ ٹھنٹھ۔ اور کچھ بھی نہیں۔ اس خیال سے شاید وہ رو لیتا لیکن آنسوؤں کے سوتے بھی خشک ہو چکے تھے گو جسم میں ابھی بھی درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

اُسے یاد آیا کہ ہر صبح اس کے ابا وضو کر کے نماز ادا کرتے اور وہ خود بھی ان کے سامنے قرآن پڑھنے کے لئے بیٹھ جاتا۔ رحل پر رکھے قرآن کے اوراق اپنے داہنے ہاتھ سے پلٹا رہتا۔ انہی یادوں میں کھو کر اس نے ایک بار پھر اپنے داہنے بازو کو جنبش دینے کی کوشش کی۔ اس کے حلق سے زوردار چیخ نکل پڑی۔

ڈاکٹر اور نرسیں اس کے اردگرد جمع ہو گئیں۔

"بیٹے کوئی برا خواب دیکھا کیا؟" ڈاکٹر نے پیار سے علی کے سر پر ہاتھ پھیر کر پوچھا۔

"انکل! خواب تھا یا حقیقت، مجھے نہیں معلوم۔ البتہ درد بہت لگ رہا تھا۔" علی نے عاجزی سے جواب دیا۔

ڈاکٹر نے سامنے کھڑی نرس کو ہدایت دی کہ مریض کو جلدی سے پین کلر انجکشن لگا دے۔ علی نے اس کی ہدایت سن لی اور ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔

"انکل! کل صبح تو پھر آنکھ کھلے گی۔ درد تو دور نہیں ہو گا نا۔"

"بیٹے! ہم بازو تو نہیں لا سکتے ہیں مگر کچھ دیر کے لئے درد کی شدت تو کم کر سکتے ہیں۔"

آج پھر ٹیلی ویژن پر اس پایۂ ستون کی تصویر دکھائی جا رہی تھی جس پر کبھی صدام حسین کا آہنی مجسمہ کھڑا ہوا کرتا تھا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ بغداد کے اس اسپتال پہنچ جاؤں اور علی کو گود میں اٹھا کر اس پایۂ ستون پر اسی حالت میں کھڑا کر دوں اور اس کے نیچے جلی حروف میں لکھ دوں۔"

"کیا میں آزاد ہوں.....؟"

☆

## ادبی سفر کے پچاس برس

○ کیول دھیر کے افسانوں میں نہ صرف افسانے کا عنصر موجود ہے بلکہ ان میں مکمل افسانویت بھی پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے نہ صرف متاثر کرتے ہیں اور قاری کے ذہن و دل میں گہرائی تک نقش چھوڑ جاتے ہیں...... احمد ندیم قاسمی

○ کیول دھیر کی کہانیوں میں شروع سے آخر تک جتنی اور کرداروں کی دھار جیسی تیزی ہے اس کا علم ہوتا ہے کہ وہ تخلیقی بے خوف ہے۔ آج کی زندگی میں انسان کو درپیش جو مختلف مسائل ہیں اسے ڈاکٹر کیول دھیر نے بعض نئے انداز میں دیا ہے...... جوگندر پال

○ ڈاکٹر کیول دھیر کے افسانے ایسے حساس دل کی آواز ہیں جو علاقے، فرقے جیسی حد بندیوں اور تعصبات سے بے نیاز ہے۔ وہ ان مسائل کو لیتے ہیں جو انسان اور انسانی رشتوں سے پیدا ہوتے ہیں اور جو آج انسانیت سے متعلق ہیں...... پروفیسر گوپی چند نارنگ

○ ڈاکٹر کیول دھیر کی فعال ادبی شخصیت نے اردو زبان اور ادب کے فروغ کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف ان سب کو ہے جو اس زبان سے محبت کرتے ہیں۔ اس سے بھی بڑا کارنامہ ڈاکٹر کیول دھیر کا وہ تخلیقی اثاثہ ہے جو انہوں نے اردو افسانوں کی شکل میں دیا ہے...... ڈاکٹر وزیر آغا

○ کیول دھیر نے زندگی کے بہت سے رنگ دیکھے ہیں اور تجربے کی ایک وسیع دنیا ان کے ذہن میں آباد ہے۔ وہ اس تجربے سے کام لیتا اور افسانے کو اپنے تخیل کی گہرائیوں سے نکال کر نکھارنا چاہتا اور اسے فنی دروبست سے آراستہ کرنا بھی خوب جانتے ہیں...... شمس الرحمن فاروقی

○ ڈاکٹر کیول دھیر کی کہانیاں ثابت کرتی ہیں کہ انہیں ملنے والے تمام اعزازات اور انعامات ان کے فن کی اساس پر ملے ہیں۔ انہوں نے نصف صدی کی تخلیقی زندگی میں جتنی شہرت، عزت اور نیک نامی حاصل کی ہے یہ ان کا حق تھا یا حرف آخر ہے... ڈاکٹر انور سدید

○ کیول دھیر نے ہندوستان میں فرقہ پرستی اور فرقہ وارانہ فسادات کو اپنی کہانیوں اور ناول کا موضوع بنایا ہے جس میں انتہائی غیر جانب داری سے کام لیتے ہوئے مظلوم کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار بھی بھرپور طریقے سے کیا ہے...... ڈاکٹر خلیق انجم

○ کیول دھیر کے کہانی کہنے کا اسلوب سیدھا سادا ہے جو عام فہم ہے۔ کہیں کوئی پیچیدگی نہیں۔ کوئی بات پہیلی نہیں بنتی۔ بالکل بہتے چلے جانے کی مثال پڑھتے جائیے...... عطاء

○ کیول دھیر کے افسانے زندگی سے قریب تر اور زندگی کی مہک میں گندھے ہوئے ہیں۔ وہ جو کہنا چاہتے ہیں وہ اپنے چبھتے ہوئے انداز میں سے کہانیاں اور کردار چنتے اور سادگی و پرکاری سے اپنے قاری تک پہنچا دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کئی رنگ اور کئی ذائقے ہیں مگر چاشنی کا رنگ ہمیشہ ان پر غالب رہتا ہے...... بشریٰ رحمن

○ اردو زبان اور ادب کے لئے ڈاکٹر کیول دھیر کی خدمات قابل تحسین ہیں۔ انہوں نے بھارت اور پاکستان کے درمیان باہمی رشتوں کو استوار کرنے کے لئے ایک پل کی طرح کام کیا ہے ...... اندر کمار گجرال

اگر آپ ہند و پاک کے دانشور، ادیب، نثر نگار، ناقد، کالم نویس، افسانہ نگار اور عاشق اردو ڈاکٹر کیول دھیر کی شخصیت اور فن کی بابت درج بالا اقتباسات سے بھی کہیں بہت کچھ جاننے کے آرزومند ہیں تو جلد اور ذاتی فرصت میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی، بھارت سے رابطہ کیجئے جہاں چار سو پچاس صفحات مجلد کی حیران کر دینے والی ادبی کائنات فقط تین سو ہندوستانی روپے کے عوض آپ کی منتظر ہے۔

# جُھورا منیاری والا

گلزار جاوید

طبیعت میں اچانک بے کلی اور بیزاری در آئی ہے۔ جس طرح میٹھی نیند میں مچھر کے کاٹنے کیڑے دال میں کنکر پتھر نکل آنے یا آپ کی جیب کٹنے کے باعث ہوا کرتی ہے۔ بات بظاہر اتنی بڑی بھی نہیں نہ اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ اُس کی بابت سوچ کر وقت اور توانائی برباد کی جائے یا خود کو ناحق مشکل میں گرفتار رکھا جائے۔ جس برق رفتاری سے دنیا کے کونے کونے میں ہر روز نت نئے انقلاب اور تبدیلیاں ہو رہی ہیں، جس طرح بھیس بدلے اور سوانگ رچائے جا رہے ہیں اُس کے مقابلے میں زیرِ بحث واقعے کی اہمیت اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر بھی نہیں۔

ذکر شرط ہارنے کا بھی نہیں، ملال اس بات پر ہے کہ تمام عمر روشن آنکھوں، حساس کانوں اور تیز دماغ کی داد پانے، حلقۂ احباب میں، دوراندیشی، دوربینی اور معاملہ فہمی کا حامل سمجھا جانے والا شخص اتنی چھوٹی سی بات پر مات کھا گیا۔ ہمارے پاس اپنی صفائی میں ایک معقول عذر یا جواز وطن سے دوری کا ضرور موجود ہے۔ اپنی مٹی، اپنے لوگ اور اپنے ماحول سے طویل غیر حاضری نے ہماری حسوں کو شاید کند کر دیا ہے۔ مگر ہم اتنے کوڑھ مغز نہ تھے۔

آہ..... کس قدر سہانا تصور ہے..... اپنی مٹی، اپنے کھیت، اپنے باغات، اپنے ندی نالے، اپنے گلی کوچے، اپنے بوہے چوبارے اور اپنے لوگ..... آج کا مشہور اور ریلوں پر پھیلا ہوا قصبہ ہمارے بچپن میں گاؤں کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ پکی سڑک سے نزدیک ہونے کے باعث شہر کی بہت سی سہولتیں ہماری دسترس میں تھیں۔ مشرق کی اوٹ سے ابھرنے والا سورج اور اُس کے پیچھے پیچھے الھڑ دوشیزہ کی مانند انگڑائی لیتی زندگی کس قدر برق رفتاری سے لوگوں کو مصروفِ کار ہونے پر مجبور کر دیا کرتی۔ جب اسی سورج پر مغرب کے سائے منڈلانے لگتے تو یہی الھڑ دوشیزہ بھی ملاری بوڑھی کا روپ دھار کر خاموشی کی سیاہ چادر اوڑھ لیتی۔

گاؤں کے چھوٹے بڑے، مرد عورت، کمزور توانا سب کے کانوں میں پہلی آواز مسجد کے بھونپوں کی گونجتی جہاں سے مسجد کا موذن نہایت سریلے سروں میں گاؤں والوں کو نیکی اور بھلائی کے لئے پکارا کرتا۔ تھوڑی دیر بعد بیلوں کی گھنٹیوں اور گھبروؤں کے وزنی قدموں کی تھاپ دھرتی کو گرمانے کے ساتھ سوئے ہوئے لوگوں کے دلوں کو برمانے لگتی۔ آہستہ آہستہ پاس پڑوس کے مویشی گھروں سے مختلف آوازیں نکال کر اپنی بھوک کا اعلان کرنے لگتے۔ اُس کے بعد گھروں کے تنوروں سے اُٹھنے والا دھواں، چکی چولہا اور مدھانی کی آوازیں زندگی کی چہل پہل کا اعلان کرنے لگتیں۔ اِدھر سے اُدھر سے گلیوں اور چوباروں سے ہو کر لوگ باگ گاؤں کی گلیوں میں چلتے پھرتے نظر آتے۔ دور دراز کی ملازمتوں پر جانے والے اپنی اپنی سائیکل، موٹر سائیکل، تانگہ وغیرہ کو آمد و سفر کرنے کے لئے دعا، پانی، ہوا اور پٹرول کی درستگی و چیکنگ میں مصروف ہو جاتے۔ مسجد، مدرسے، سکول، کالج جانے والے بچے، بچیاں اپنی اپنی کتابیں اور بستے درست کرتے ہوئے گذشتہ دن کی چھٹی یا ہوم ورک نہ کرنے کی بابت نت نئے بہانے اور جواز تراشتے، کپڑوں کی شکنیں اور بکھری لٹوں کو درست کرتے ہوئے ٹولیوں کی شکل میں ایک دوسرے سے ہنسی ٹھٹھول، چھیڑ چھاڑ اور خوش گپیاں کرتے ہوئے اپنی اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو جاتے۔

سورج کی اوٹ سے جونہی ہلکی ہلکی دھوپ کھیتوں، کھلیانوں، ویہڑوں اور دالانوں تک پہنچتی پورے گاؤں پر عورتوں کا راج ہو جاتا۔ کوئی چولہا چوکا سنبھالنے، کوئی شیر خواروں کو جگانے، کوئی ڈھور ڈنگروں کا ٹوکا، چارا، ونڈا کرنے، کوئی کھیتوں پر گئے محنت کشوں کے کھانا پانی کا انتظام کرنے، کوئی بوڑھے ماں باپ، ساس سسر کے حقہ پانی اور کوئی دودھ لسی یا چاٹی کا پیڑا تھامے شکم سیری میں مصروف ہوتی۔

گاؤں کی گلیوں اور پگڈنڈیوں پر دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ پھیری والوں کا راج ہو جاتا۔ سب سے پہلے بابا فیکا اپنی مریل گھوڑی کی پشت پر کسی طرح کی سبزی بھاجی لادے گھروں اور صحنوں کے دروازے سے جھانکتے ہوئے "سبزی لے لو سبزی" کی ہانک لگاتا ہوا برآمد ہوتا۔ بابا فیکا کی ہانک کے جواب میں کسی گھر کے اندر سے جواب نہ آتا تو بابا فیکا اونچی آواز میں پہلے کھانستا یا کھنکھارتا پھر کہتا "سب کہاں سو گئے ہیں" گھر کے اندر سے بھی کوئی لڑکا بالا شرارت سے کہہ دیتا "آہو تے پئے آں" "توبہ توبہ اللہ توبہ اے وی کوئی ٹیم اے سون دا" بابا فیکا کسی قدر ناراضگی کا اظہار کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔

آگے بڑھ کر پھر کسی گھر کے اندر جھانکی مارتے ہوئے بابا فیکا ہانک لگاتا "سبزی لے لو سبزی" اندر سے آواز آتی "تنڈے کدو ہی لائے نیں" "جیویں پتر مرضی نے لوئیں کدی ودھ منگے نے تہاڈے کولوں" دوسری گلی کے کسی گھر کے دروازے پر جا کر بابا فیکا ہانک لگاتا تو گھر کے اندر سے آواز آتی "رہن دے بابا اماں نی لئی تیری سبزی، کل تیرے کولوں بھنڈی لئی سی، ساری دیہاڑ اُن ماڑ ساڑ کے تنگ پے گئی پر تیری بھنڈی پھر وی نہ گلی۔" "خفا کیوں پئی ہونی ایں دھی رانی! لے آج تیرے واسطے ہو گر سے لے کے آیا واں اپنے کھیت دے نیں۔" "بابا میں نئیں دسیا....." جونہی گھر کے اندر سے کوئی نسوانی آواز بےبسی کا اظہار کرتی بابا فیکا اُس کا جملہ درمیان میں کاٹ کر کہتا "لے..... ! اے وی کوئی گل ہوئی تیرے کولوں مُل تھوڑی منگاواں، اے تاں سوغات اے سوغات بھلا سوغات نوں وی کوئی نا کر دا اے۔"

بابا فیکا کے بعد منگا فروٹ والا آتا۔ تہ در تہ سجے پھلوں والی ریڑھی پر

کچھ ٹوں، کچھ ٹروں کی آوازوں میں بچھتا نہ وہ، کچھ گلے سڑے پھل لے کر "مب لے لو مب، میٹھے مب لے لو سیب، امرود لے لو، میٹھے املوک لے لو" کبھی کوئی ماٹھوں سے بچا ہوا قیمیں کے بچن کھلے، بچہ ہاتھ میں آنہ ٹکہ لے کر برآمد ہوتا تو منگا کھاٹ سڑا آم امرود یا سیب پکڑا دیتا۔ کبھی بچے سے کہتا "جا میرا بہت ہو رہے لے کے آ" اکثر کوئی بزرگ خاتون ویہڑے سے برآمد ہو کر کہتی "وے منگیا مب مٹھے نہیں کر کھٹے" منگے کے جواب سے پہلے بزرگ خاتون ریڑھی سے ایک آم اٹھا کر چوسنے لگتی "تیرا بیڑا غرق جے، اباڑوں کھٹے مب کھوانا ایں اے" منگا جلدی سے سارے آموں میں سے ایک آم چھانٹ کر بڑی بوڑھی کی طرف بڑھاتا "بے جی! اک آدھا کھا کے تکل ای آندا اے، ایہہ تُسی لے کے چوپو" بڑی بی منگے کے ہاتھ سے آم لے کر "ہاں آیا میٹھے مب ویچن والا" کہتی ہوئی گھر کی راہ لیتیں اور منگا جان بخشی پر سر مارتے ہوئے مزید سست میں بڑبڑ کرنے لگتا۔

بابا منگے کی دوسری گلی سے مدہم ہوتی آواز "مب لے لو میٹھے مب" کے ہواؤں میں تحلیل ہونے سے پہلے دھنی رام کا گدھا گاڑی پر ایک ملازم کے ہمراہ ہاتھ میں کھاتہ اور کان میں قلم لگائے برآمد ہوتا۔ دھنی رام کے ساتھ بھی گاؤں کی خواتین کا اکثر جھگڑا رہتا۔ کبھی کوئی عورت زیادہ قیمت کا گلہ کرتی کبھی دوسری ادھار کی رقم میں اضافے کا رونا روتی۔ گاؤں کی اکثر عورتیں دھنی رام سے خریدے گئے کپڑے کے کچی جانے اور رنگ کچا ہونے کی شکایت کیا کرتیں تو دھنی رام ہر کسی کے گلے شکوے کے جواب میں مکر سے گھڑے اور رٹے رٹائے جواب اور شہر والے دکانداروں کی بے ایمانی کے جھوٹے سچے قصے سنا کر اکثر ان سے اپنی لڑائی کی روداد بھی نمک مرچ لگا کر سناتا اور آئندہ کی خریداری میں کسر نکالنے کا وعدہ کر کے بول بچن کے بیچ سے گزر آ کر گاؤں کی بھولی بھالی خواتین کو بیوقوف بنا کر اپنی راہ لیتا۔

دھنی رام کے بعد قاعدے، سپارے، قرآن مجید، جزدان، تسبیح اور جستی زیور والے کی صدا سنائی دیتی۔ اس کے کچھ دیر بعد دری، چادر، کھیس اور رضائی والا آجاتا۔ اس سے بھی خواتین کو کوالٹی اور قیمت کا گلہ ہوتا۔ دری والا دھنی رام کی طرح چرب زبان نہیں تھا۔ چھلی آیا کئی، چھلی، کمن کئی، اچھائی، بے بی کہہ کر کام نکالا کرتا۔ اس کے بعد پرانی سائیکل پر چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر لگائے تیل بیچنے والا برآمد ہو جاتا۔ ہمیشہ کی طرح گاؤں میں داخل ہوتے ہی تیل والا سائیکل پر نصب ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ فٹ کر دیتا جس سے سرسوں دا تیل، جمال دا تیل، ناریل دا تیل، ہیملی دا تیل، آملے دا تیل، خشخاش دا تیل غرض ایک درجن سے زائد اقسام کے تیل ایک کنستر اور چند شیشیوں کی مدد سے دستیاب ہوتے۔

سب سے آخر میں گاؤں کی خواتین میں مقبول اور ہر دلعزیز جھورا منیاری والا برآمد ہوتا۔ جھورا منیاری والا دوسرے پھیری والوں کی طرح آواز لگاتا نہ کسی طرح سے اپنی آمد کی اطلاع کرتا۔ مخصوص جگہ پر بڑ کے پیڑ تلے آ کر ٹھیلا کھڑا کر کے جونہی جھورا منیاری والا ٹھیلے پر پڑے بے ترتیب سرخی، کریم، پاؤڈر، نیل پالش، تیل، سرمہ، مسّی، مہندی، کاجل، خضاب، ہیئر پن، شیشہ، کنگھی، پراندہ، ناڑے، بٹن، سوئیاں، بالیاں، انگوٹھی، چھلا، کوکا، گانی، کنگن، ستارے، قرطیہ، سلائی اور رنگ برنگ اون، دھاگے کے گولے سجانے لگتا آہستہ آہستہ عورتوں، بچیوں اور بڑی بوڑھیوں کی بھیڑ اس کے گرد جمع ہونے لگتی۔

گاؤں کے چھوٹے سے بازار میں کریانہ، بساط خانہ، کپڑے والا، نائی، دھوبی، ترکھان، حلوائی، قصائی، لوہار، سنار، موچی اور درزی کی دکانیں موجود تھیں۔ گاؤں کے مرد اکثر اپنی ضرورت کی چیزیں ان دکانوں سے لیا کرتے البتہ خواتین بہت کم ان دکانوں کا رخ کیا کرتیں۔ خواتین کی ضروریات زیادہ تر بساط خانے سے پوری ہوتیں جبکہ بساط خانے کی دکان کا مالک عبدالعزیز بڑی عمر کا بوڑھا اور مزاج کا چڑچڑا تھا۔ جو قیمت ایک دفعہ بتا دیتا اس میں ایک پیسے کی کمی بیشی پر آمادہ نہ ہوتا۔ ادھار کے نام پر اس طرح بدک جاتا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس کے علاوہ اس کی دکان میں پرانے ڈیزائن کا سامان دستیاب ہوا کرتا۔ جھورا منیاری والا جب بھی پھیری پر آتا اس کے ٹھیلے پر کوئی نہ کوئی کریم، پاؤڈر، پراندہ وغیرہ نئے ڈیزائن اور نئی طرز کی چیز ضرور ہوا کرتی جسے جھورا منیاری والا اپنے ٹھیلے پر نرالے طریقے سے سجا کر رکھا کرتا۔ جھورے منیاری والے کی ایک خوبی مناسب دام بھی تھی۔ جس کے ساتھ ادھار کی سہولت اضافی تھی۔

جھورا منیاری والا ہمیشہ اپنے ساتھ دو کاپیاں رکھا کرتا تھا ایک کاپی ادھار والوں کا حساب لکھنے کے لیے دوسری گاؤں والوں کی چھوٹی چھوٹی ضروریات درج کرنے کے لیے۔ گاؤں کی خواتین اکثر دکھ بیماری، حرج مرض کی بابت جھورے منیاری والے سے تبادلہ خیال کیا کرتیں۔ جھورا منیاری والا ہر کسی کی بات سن کر صرف اچھے الفاظ میں تسلی دیا کرتا بلکہ اگلے پھیرے پر اس کا مناسب حل بھی تلاش کر کے لے آتا۔ جھورے منیاری والے کی کامیابی میں اس کی دلکش شخصیت، مناسب رکھ رکھاؤ، عمدہ بول چال، کاروباری مہارت، ایمانداری اور نت نئے ڈیزائن کی اشیا، مناسب قیمت، عمدہ کوالٹی اور وقت کے ساتھ ادھار کی سہولت کو بڑا دخل تھا۔ بابا فیقا، بابا منگیا، دھنی رام کی طرح گاؤں کی کسی خاتون کو جھورے منیاری والے سے اشیا کی کوالٹی یا دام کی بابت کبھی کوئی گلہ نہ ہوا، کئی بار ایسا بھی ہوا کہ جھورا منیاری والا جس قیمت پر جو شے گاؤں کی خواتین کو بیچ گیا ہے شہر کی دکانوں میں اس کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ جھورے منیاری والے کی انہی خوبیوں نے اسے ہمارے گاؤں کے ساتھ پاس پڑوس کے گاؤں میں بھی ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔

جھورے منیاری والے کی کامیابی کا اہم راز یہ بھی تھا کہ وہ جس قدر

اور گلی سے کاروبار کرتا اسی انہماک سے خدمت خلق پر بھی توجہ دیا کرتا۔ "لے لو لے لو جیہڑے دی مرضی نے لے لو تہاڈے کولوں ودھ کدی نہیں لوں گا" روبرو کھڑی خاتون کو اُس کی مطلوبہ شے کی بابت مطمئن کرتے ہوئے دوسری جانب متوجہ ہو جاتا۔ "خالہ جی تُسی کی لینا ہے جی" بائیں ہاتھ کھڑی بڑی عمر کی خاتون سے دریافت کرتا۔ "وے پتر جھوریا تینوں پہلاں وی دسیا سی منڈے دے سڑھ وچ پیڑ ہوندی اے روٹی کھاندے سار ای کھیتاں ول دوڑ جیندا اے پیشاب واسطے۔ بُکی وار حکیم صاحب دی پھکی دتی اے پر ....." "شی فکر ای نہ کرو خالہ جی پیر ساب کولوں ایہا تعویز لیا کے دیاں گا کہ منڈا اسا رے گھر دیاں روٹیاں کھا کے وی چوکڑی مار کے سوئے گا۔" خالہ جی کا جملہ درمیان میں اُچک کر جھورا غباری والا قلم کتاب پکڑ کے خالہ جی کی بابت معلومات درج کر کے گاہکوں کی جانب پھر سے متوجہ ہو جاتا۔

مائی بتول کی بیٹی حاجراں کو کئی سالوں سے غشی کے دورے پڑتے تھے۔ منہ سے لعاب بہنے لگتا تھا اور ہاتھ پیر اکڑ جاتے تھے۔ گاؤں کے حکیم اور مولوی صاحب نے ہر طرح سے کوشش کر کے دیکھ لیا تھا مگر حاجراں کے دورے کسی طرح کم نہ ہوتے تھے۔ جھورے غباری والے نے حاجراں کے جسم کو دھاگے سے ماپ کر مائی بتول کو یہ کہہ کر دیا کہ اسے کوٹھا دیں۔ دوبارہ جب اسی دھاگے سے جھورے غباری والے نے حاجراں کو ناپا تو دھاگا چھوٹا پڑ چکا تھا۔ جھورے غباری والے نے حکیم صاحب کی پھکی اور پیر صاحب کا تعویذ لا کر دیا تو حاجراں دیکھتے ہی دیکھتے بھلی چنگی ہو گئی۔ جھورے غباری والے نے مائی بتول سے کہا کہ ابھی حاجراں کا علاج جاری رکھے۔ پینے کا پانی 'نہانے کا پانی' سرہانے رکھنے کا تعویز اور گلے میں پہننے والا گنڈا ابھی جھورے غباری والے نے بلا کسی معاوضہ کے مائی بتول کو لا کر دیا تھا۔ اور وقتاً فوقتاً حکیم صاحب کی پھکی کھلانے کی تاکید بھی کی تھی۔ تھوڑے عرصے میں حاجراں کے چہرے کی رنگت بھی گلابی اور جسم بھرا بھرا نظر آنے لگا۔

مائی فضیلت پورے گاؤں کی مائی تھی۔ ہر کسی کے غم اور خوشی میں آگے آگے ہوتی۔ گاؤں کے کسی گھر میں شادی بیاہ کی رسم ہوتی تو مائی فضیلت کو ڈھول پر بٹھلایا جاتا۔ پوری پوری رات مائی فضیلت 'سہاگنوں اور کنواریوں کے درمیان بیٹھ کر ڈھول بھی بجاتی اور گانا گانے میں اُن کی مدد بھی کیا کرتی۔ مائی فضیلت کو ماہیے اور ٹپے کے علاوہ نئے پرانے فلمی گیت بھی اس قدر ازبر تھے کہ گاؤں والیاں مزے لے لے کر مائی کی لے میں لے ملا کر مائی کی یادداشت اور مائی کے شوق پر خوشی سے ایک دوسری کو حیرت زدہ ہو کر دیکھتیں اور شرمانے لگتیں۔ مائی فضیلت جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ شوہر کی بخشش اور چند مربع زمین سے گزر اوقات سے چل رہا تھا۔ کل تین جی کھانے والے تھے۔ بیٹا 'بہو اور مائی فضیلت۔ کسی طرح کا کوئی دکھ بیماری مائی فضیلت کو چھو کر بھی نہ گزرے تھے۔

بیٹے کی شادی کے بعد ہر سال مائی فضیلت پوتے کا ارمان سجاتی اور ہر سال تیسرے یا چوتھے مہینے میں مائی فضیلت کی اُمیدوں پر پانی پھر جاتا۔ مائی فضیلت نے گاؤں کے حکیم 'مولوی اور شہر کے بڑے ہسپتال سے کئی بار اپنی بہو کا علاج کروایا مگر پوتے کا منہ دیکھنا مائی فضیلت کو نصیب نہ ہوا۔ جھورے غباری والے کے پیر صاحب کے تعویز نے ایسا کرشمہ دکھلایا کہ دوسرے سال ہی مائی فضیلت ایک گول مٹول پوتے کی دادی بن کر پورے گاؤں میں الہڑ دوشیزہ کی مانند اٹھلاتی 'بل کھاتی لڈو تقسیم کرتی پھر رہی تھی۔ مائی فضیلت کی خوشی پورے گاؤں کی خوشی تھی۔ جس طرح مائی فضیلت آگے بڑھ کر گاؤں والوں کی غمی خوشی کو اپنا غم 'خوشی سمجھتی تھی اُسی طرح گاؤں والوں نے مائی فضیلت کی خوشی کو اپنی خوشی بلکہ پورے گاؤں کی خوشی کے طور پر منایا۔

بھاگ بھری کا شوہر 'علم دین کام کی تلاش میں دبئی کی طرف گیا کہ سات سال گزرنے کے بعد بھی لوٹ کر نہیں آیا۔ علم دین کی بابت اکثر متضاد خبریں سننے کو ملا کرتیں۔ کوئی کہتا علم دین کے سامان میں جاتے وقت منشیات پکڑی گئی تھی اور وہ اس جرم میں جیل کاٹ رہا ہے۔ کبھی پتہ لگتا کہ علم دین جس ایجنٹ کے ذریعے باہر گیا تھا اُس نے علم دین کے سامان میں منشیات رکھوائی تھیں اور علم دین کی نشاندہی پر ایجنٹ پکڑا گیا ہے اور علم دین چھوٹ گیا ہے۔ کبھی خبر آتی علم دین نے دوسری شادی کر لی ہے اور دوسری بیوی سے اُس کے دو بچے بھی ہیں۔ بھاگ بھری کو شوہر کی جدائی اور بے وفائی نے اس قدر دکھ پہنچایا کہ وہ نیم پاگل ہو کر گم سم رہنے لگی۔ کھانے پینے کا ہوش نہ رہتا۔ کئی کئی دن کبھی کبھی ہفتوں نہاتی نہ کپڑے تبدیل کرتی۔ جھورے غباری والے کی دیکھ بھال اور اُس کے پیر صاحب کے علاج سے بھاگ بھری آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لوٹ آئی اور جھورے غباری والے کی احسان مند 'مداح ہونے کے ساتھ شہرت کا ذریعہ بھی بن گئی۔

سجیلن خان گاؤں کا بڑا ہونہار اور سجیلا جوان تھا۔ بہادری وفاداری اور فیاضی اُس کی شخصیت کے نمایاں اوصاف تھے۔ سجیلن خان کی اکلوتی بہن جمیلہ کا اُس کے خالہ زاد قیوم سے برسوں پرانا رشتہ صرف اس لئے ٹوٹ گیا تھا کہ جمیلہ پر کسی بھوت 'پریت کا سایہ ہو گیا تھا۔ جمیلہ کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اس قدر گہرے اور شدید ہو گئے تھے کہ دیکھنے والے کو خوف آیا کرتا۔ جمیلہ کی جلد خشک اور سخت ہو رہی تھی 'چہرے پر مہاسے نکل آئے تھے اور جمیلہ کے بال بھی تیزی سے گرنے لگے تھے۔ اوّل جمیلہ کسی سے بات نہ کرتی' جب بولنے پر آتی تو گھنٹوں بولے جاتی۔ گفتگو کے دوران جمیلہ چھوٹے 'بڑے کا ادب لحاظ بھی نہ کرتی۔ اکثر نسوانی شرم و حیا کی حدیں بھی بے شرمی سے پار کر جاتی۔ کھانے پر آتی تو کئی کئی آدمیوں کے حصے کا کھانا ایک وقت میں کھا جاتی اور بھوکا رہنے پر آتی تو کئی کئی دن کھانے کی طرف دیکھتی بھی نہیں۔ سجیلن کی والدہ نے گاؤں والیوں

کے اصرار پر جھورے خیاری والے سے رابطہ کیا۔ جھورے خیاری والے نے چالیس دن تک حکیم صاحب کی پھکی مکھن اور شہد میں ملا کر کھلانے کے علاوہ جیلہ کی والدہ کو چند تعویذ دروازوں کی چولوں میں دبانے، چند تعویذ رات کے پچھلے پہر جلا کر جیلہ کو دھونی دینے اور چند تعویذ جیلہ کو پانی میں گھول کر پینے کے لئے دیئے۔ پہلے پہل جیلہ پر جھورے خیاری والے کے علاج کا کوئی اثر نہ ہوا۔ جیلہ جھورے خیاری والے کو دیکھ کر اول فول بکنے لگتی۔ کبھی کبھی گالم گلوچ پر اتر آتی۔ جھورے خیاری والے نے اس وقت تک ہمت نہ ہاری جب تک جیلہ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح ہنستے ہوئے کھیلنے کودنے نہ لگی۔

جھورے خیاری والے کی شہرت اور کاروبار دور دور تک پھیل گیا تھا۔ جھورا خیاری والا گاؤں والوں کے لئے فقط ایک پھیری والا نہ رہا تھا۔ اس کی حیثیت گاؤں کے فرد بلکہ گاؤں کے ہر گھر کے فرد کی ہو گئی تھی۔ جھورا خیاری والا جب بھی پھیری پر آتا گاؤں کی عورتیں اس کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ جاتیں۔ کوئی جھورے خیاری والے کے لئے لسی کا گلاس لے کر آ رہی ہے، کوئی مکئی کی روٹی، ساگ، لسی اور مکھن کا پیڑا لا رہی ہے، کوئی جھورے خیاری والے کے لئے گڑ، گھی، شکر اور کوئی دیسی گھی کا حلوہ لئے چلی آ رہی ہے۔

جھورا خیاری والا گاؤں کی عورتوں کے لئے دکاندار سے زیادہ ہمدرد، رفیق اور غمگسار کا درجہ اختیار کر چکا تھا۔ بہت کم عورتیں جھورے خیاری والے کو جھورا کہہ کر بلایا کرتیں۔ بڑی عمر کی عورتیں جھورا پتر، درمیانی عمر کی ویر جھورا، جوان عورتیں جھورے ویر اور نوجوان لڑکیاں چاچا جی کہہ کر جھورے خیاری والے کو اپنائیت اور محبت سے مخاطب کیا کرتیں۔ جھورے خیاری والے کے ٹھیلے پر ضرورت کی چیزیں خریدنے والی خواتین کے علاوہ حاجت مند خواتین کا میلہ بھی لگا رہتا۔ کوئی عورت ضرورت کی چیز خرید رہی ہے، کوئی ٹھیلے پر رکھی مختلف اشیا کی قیمت دریافت کر کے جھورے خیاری والے سے اٹکھیلیاں کر رہی ہے، کوئی اپنی پریشانی کا حل دریافت کر رہی ہے، کوئی جھورے خیاری والے سے تنہائی میں بات کرنے پر مصر ہے، کوئی جھورے خیاری والے کے کان میں بات کر کے کھلکھلانے لگتی ہے، کوئی جھورے خیاری والے کی بات سن کر حیا سے شرمانے لگتی ہے، کوئی سنجیدگی کا بت بن کر جھورے خیاری والے کا منہ تکنے لگی ہے۔

ایک دن جھورا خیاری والا گاؤں کے چوک میں برگد کے درخت کے نیچے ٹھیلا لگائے دکانداری اور خواتین کی پریشانیاں سننے میں منہمک تھا۔ "میں کہیا جی.... تہانوں ملکانی ہوراں نے سدیا اے" ملکانی ہوراں کا نام پر جھورے خیاری والے کے ساتھ ٹھیلے کے گرد کھڑی خواتین بھی کچھ دیر کے لئے خاموش ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔ "مینوں جناب.....؟" جھورے خیاری والے نے حیرت اور خوف کے ملے جلے احساسات کے ساتھ دریافت کیا۔ "جی جناب.... تہانوں ملکانی ہوراں نے سدیا اے" ملک سجاول کے ملازم خاص نے جھورے خیاری والے کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے اپنا جملہ چبایا۔

ملک سجاول ایک طرح سے گاؤں کا ناخدا تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ملک سجاول کے والد ملک عداوت خان نے زر اور زور کے بل پر گاؤں کی آدھی زمینیں ہتھیائی تھیں۔ ملک سجاول کے والد ملک عداوت خان کی زبان سے نکلا ہوا لفظ حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ ملک سجاول کے والد ملک عداوت خان کے بارے طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ سب سے نمایاں ملک عداوت کا ظلم اور عیاشی تھی۔ بازاری عورتوں، عیاش لونڈوں اور خوبرو مردوں کے ساتھ وقت گزارنا، کتوں، بٹیروں، مرغوں وغیرہ کی لڑائی پر پیسہ لٹانا اور بیاہتا بیوی کی طرف بے اعتنائی برتنا بھی لوگوں کی گفتگو کا اہم موضوع تھا۔ ملک عداوت کی موت کے بعد اُن کے اکلوتے بیٹے سجاول کا رعب دبدبہ اور مشاغل اپنے باپ سے کسی طرح کم نہ تھے۔ کافی عرصے گاؤں کے لوگ ملک سجاول کو جھورے خیاری والے کی بابت بتایا کرتے تھے۔ ہر بار ملک سجاول جھورے خیاری والے کے ذکر پر حقارت سے یہ کہہ کر بات ٹال دیتا "مجھے شہر دے وڈے وڈے ڈاکٹر بے بس نیں تُھکے اک پھیری والا کیہ کر سکدا اے" چونکہ اب جھورے خیاری والے کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی اور ملک سجاول بھی شہر کے ڈاکٹروں سے بدظن ہو چکا تھا لہٰذا ملک سجاول نے ایک شرط کے ساتھ یہ کہہ کر ہتھیار ڈال دیئے "ٹھیک اے جی ٹھیک اے.... جیویں تہاڈی مرضی.... پر میں اُس نٹ پونجئے نال کلام کراں گا نہ اوہنوں اپنے ڈیرے تے سدوں گا"

خاطر مدارت اس سے قبل پورا گاؤں جھورے خیاری والے کی کیا کرتا تھا مگر جو لطف جھورے خیاری والے کو ملک سجاول کے گھر مکھن کے پیڑے والا چھاچھ سے لبالب بھرا لسی کا گلاس، ساتوں میوے ملے دیسی گھی کی پنجیری، کھوئے کے لڈو اور اپنے باغات کے پھل اور پھلوں میں آ رہا تھا اُسے فراموش کرنا یا بھلا دینا جھورے خیاری والے کے لئے ممکن نہ تھا۔ جھورے خیاری والے نے روایتی عاجزی اور انکساری کے ساتھ ملکانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں تاں کی ہویا آں جی تے گناہ گار بندہ ہوں، جو کجھ وی کیتا اے رب دی ذات نے کیتا اے پیر ساب ہوراں نے کیتا اے جے تسی آکھو تے حکیم ساب ہوراں نوں وی سداں.....؟" "جو تیری سمجھ وچ آندا اے کر پر کڑیئے....." پہلی بار جھورے خیاری والے کے کان ملکانی کی مضبوط اور مترنم آواز سے مانوس ہو رہے تھے۔ اس سے قبل ساری گفتگو اور تفصیل ملازم خاص اور ملازمہ خاص نے جھورے خیاری والے کے گوش گزار کی تھی۔

ملکانی کے علاج کی ابتدا حویلی میں قلعی کرانے سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد صبح شام تعویذ ملے پانی سے نہانے اور فجر و عشا کی نماز کے بعد خصوصی وظائف کے ساتھ کھانے پینے سونے جاگنے اٹھنے بیٹھنے میں احتیاط اور بندش کے ساتھ حکیم صاحب کے تجویز کردہ مخصوص خمیرات اور پھکی بھی علاج

میں شامل رہی۔ ابتدا میں علاج کے لیے چالیس دن کا چلّہ تجویز کیا گیا جس کے دوران پیر صاحب کا پڑھا ہوا دودھ، شہد اور پھل کے علاوہ کوئی چیز بھی کھانا ملکانی بوروں کے لئے منع تھا۔ شروع میں علاج سا چلّی تمام تر ذمہ داری ملکانی بوروں کے ذاتی ملازم اور ملازمہ پر عائد تھی لیکن بعد پیر صاحب کی ہدایت پر یہ ذمہ داریاں جھورے نیاری والے کو سونپ دی گئیں۔ جھورا نیاری والا ہر روز صبح شام پیر صاحب سے ملکانی بوروں کے لئے پانی، دودھ، شہد اور تازہ پھل پڑھوا کر لاتا اور پیر صاحب کی ہدایت کے مطابق ملکانی بوروں کو پیش کیا کرتا۔

ہر چند ملکانی بوروں کی شخصیت کافی مضبوط اور طرح دار تھی مگر آہستہ آہستہ پیر صاحب کے علاج نے ملکانی بوروں کی شخصیت میں لوچ، لچک اور نرمی پیدا کر دی تھی۔ علاج کے آخری ایام آتے آتے ملکانی کی قوت مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔ پیر صاحب نے حتمی طور پر جو علاج تجویز کیا تھا ملکانی بوروں کے لئے وہ نہ صرف مشکل بلکہ انتہائی دشوار تھا۔ پیر صاحب کی سحر انگیز شخصیت کا بیان اور جھورے نیاری والے کی جاں نثاری نے سارے مراحل خوش اسلوبی کے ساتھ طے کرا دیئے تھے۔

گاؤں میں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ ملک سجاول نے تجوری کا منہ کھول دیا تھا۔ پیر کی کوا س کے کن کی مراد ول کھول کر دی جا رہی تھی۔ کل تک جو لوگ ملک سجاول کے سامنے بات کرتے جھجک جاتے تھے آج وہی لوگ ملک سجاول سے بغل گیر ہو کر ملک سجاول کو مبارک دیتے اور نومولود کی درازیٔ عمر کے لئے ہاتھ اٹھاتے نظر آتے تھے۔ ملک سجاول نے بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں گاؤں کے یتیموں اور محتاجوں کے علاوہ کمی کمینوں کے لئے بھی صدقہ خیرات کا اعلان کیا تھا اور انعام کے طور پر جھورے نیاری والے کو نقد رقم کے علاوہ گاؤں کے باہر ایک قطعۂ اراضی دینے کا اعلان کیا تھا جہاں جھورا نیاری والا پیر صاحب کا آستانہ تعمیر کرا کر حاجت مندوں کی خدمت کیا کرے گا۔

بیرون ملک طویل قیام بعد وطن واپسی کے موقع پر گاؤں میں بے شمار تبدیلیاں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔ گاؤں کا چھوٹا اور چلتا بازار جو چند دکانوں پر مشتمل تھا اب باقاعدہ بازار کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ گاؤں کی دکانوں پر مختلف قسم کی اشیا کے دل آویز بورڈ اور طرح طرح قسم کے پوسٹر بھی نمایاں نظر آنے لگے ہیں۔ ٹھنڈے مشروبات اور بیکری فروخت بھی عام ہو گئی ہے۔ گاؤں کی کچی سڑک جہاں دھول اڑا کرتی تھی اب لش لش کرتی گاڑیوں کی کشادہ شاہراہ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ گاؤں کی پرانی مسجد کی جون تبدیل ہو کر ایک عالیشان عمارت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس کے سامنے ایک نئی اور کشادہ مسجد بھی تعمیر ہو چکی ہے جس میں بے شمار طلبا اور طالبات دن رات دینی تعلیم حاصل کرنے، گردو پیش کو صوم صلوٰۃ کی جانب راغب کرنے اور غیر شرعی امور سے باز رکھنے میں مشغول ہیں۔ ایک تبدیلی امام باڑے کی شکل میں بھی ظہور پذیر ہوئی ہے۔ امیر حسین شاہ کے گھر کے باہر چھوٹا سا علم لہرانے کے بجائے بڑے بڑے سیاہ پرچم اور علم لہرا رہے ہیں جن پر نئے نئے حق اور معصوم کے نعرے اور پیغام درج ہے۔ کشادہ اور جدید طرز تعمیر کا نمونہ عالیشان عمارت، امام باڑے کی شکل میں نمایاں ہو چکی ہے اور عقیدت مندوں کا رش بھی دیدنی ہے۔

گاؤں کے کچے پکے گھروں کی جگہ اب دو منزلہ اور سہ منزلہ پختہ عمارات نے لے لی ہے جن کی چھتوں پر طرح طرح کے ٹی وی اور ڈش انٹینا بھی نظر آ رہے ہیں۔ گاؤں کے سیدھے اور سادہ دھوتی کرتے والوں کی جگہ اب شلوار قمیض اور پینٹ شرٹ والوں نے لے لی ہے۔ دودھ، دہی، لسی اور ساگ کی جگہ چائے، جوس، پیزا، برگر ہے۔ اب لوگ ایک دوسرے سے مل کر علیک سلیک اور ذکر شکر کرنے کے بجائے ہاتھ ہلا کر سلام دعا کرنے اور خیر خیریت معلوم کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اب لڑکے بالے بزرگوں کو چاچا، بابا کہنے کے بجائے انکل کہہ کر قریب سے گزر جاتے ہیں۔ اب نہ کوئی بزرگوں کے آگے سر جھکا کر ادب سے کھڑا ہوتا نہ جھک کر سلام کرتا ہے۔ ہر کوئی اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے پر یہ کوئی نہیں جانتا کہ اس کی منزل ہے کہاں؟

گاؤں کے بازار کے اختتام پر حکیم ڈاکٹروں کے بورڈ اور جگہ جگہ دیواروں پر وال چاکنگ بھی نئی بات ہے۔ ہر حکیم ڈاکٹر کے بھاری بھرکم اور وزنی نام کے بعد کئی طرح کی ڈگریاں بھی درج ہیں۔ سب کی سب ڈگریاں ہمارے لئے قطعی نامانوس اور اجنبی ہیں مگر ہر حکیم اور ڈاکٹر ایک سے ایک پیچیدہ اور موذی مرض کو چٹکی بجاتے جڑ سے اکھیڑنے اور مریض کو صحت مند، توانا اور خوش و خرم کرنے کے دعوے کر رہا ہے۔

ایک تبدیلی اس طرف بھی نظر آ رہی ہے جہاں عورتوں کا ہجوم نظیر پیر صاحب کی ایک جھلک دیکھنے اور ان کے عصا سے دم درود کرانے کے لئے بیتاب ہے جبکہ دوسری طرف عورتوں کی بھیڑ پیر صاحب کے چیلوں سے تعویذ، گنڈا، پڑھا ہوا پانی، تیل اور چکی لینے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں مصروف ہے۔ عالیشان عمارت کے بڑے ہال کے عین درمیان بارعب پیر صاحب سبز عمامہ اور کالا چوغہ زیب تن کئے جلالی انداز میں جلوہ فرما ہیں۔

ویسے تو پیر صاحب کا زیادہ وقت ورد اور دم درود میں گزرتا ہے جس کے دوران پیر صاحب آنکھیں اکثر بند رکھا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک اچٹتی نگاہ اپنے مریدوں اور کارندوں پر بھی ڈال لیتے ہیں جس سے بہت سوں کی زندگی سنور جاتی ہے۔ عمارت کے باہر بڑے خوشنما اور دیدہ زیب الفاظ میں پیر صاحب کے آستانہ عالیہ کا نام جو القابات کے جلی حروف میں درج ہے جسے لوگ نہ صرف عقیدت سے پڑھتے ہیں بلکہ کچھ لوگ جذبات سے مغلوب ہو کر پیر صاحب کے نام کو بوسہ بھی دیتے ہیں.....!!!

# سخنِ معطّر

## پروفیسر زُہَیر کُنجاہی(راولپنڈی)

مُسلک اپنا عشق میں سب سے جُدا رکھتا ہوں مَیں
تُجھ کو کیا معلوم کیا بادِ صبا رکھتا ہوں میں

جس کی یادوں سے تمناؤں کے جلتے ہیں چراغ
اُس کی یادوں کا دِیا روشن سدا رکھتا ہوں میں

غم نہیں جو ہر طرف طاری ہوئی خاموشیاں
بے ضمیروں کو جگانے کی صدا رکھتا ہوں میں

میری یادیں جس نے اپنے دل سے بھی کر دیں ہیں محو
نام اُس کا اپنے ہونٹوں پر سجا رکھتا ہوں مَیں

جس سے پائیں رنگ غُنچے وہ نظر بخشی مجھے
اور کِھل جاتے ہیں غُنچے وہ نوا رکھتا ہوں مَیں

میری راہوں میں بچھاتے ہیں جو کانٹے اے زُہیؔر
دامنِ دل اُن کی خاطر بھی کُھلا رکھتا ہوں میں

O

## ماجد سرحدی(پشاور)

رسمِ اُلفت ہی جب مٹا دی ہے
آپ نے کیوں مجھے صدا دی ہے

دل کی جنت سے اٹھ رہا ہے دھواں
کس نے یہ آگ سی لگا دی ہے

آپ ہی زخمِ دل کا چارہ تھے
آپ ہی نے اُسے ہوا دی ہے

دردِ دل بڑھ گیا ہے چارہ گر
تو نے کیا سوچ کے دوا دی ہے

آپ کی یاد نے میرے دل پر
ایک تصویر سی بنا دی ہے

عشق کو ہم چھپائے پھرتے تھے
بے رخی نے تری ہوا دی ہے

دیکھ کر میرا داغِ دل ماجؔد
ہر کلی یونہی مسکرا دی ہے

O

**خورشید انور رضوی (اسلام آباد)**

روزنِ دیوار در لگتا رہا
عیب تھا، لیکن ہنر لگتا رہا

ہاں! کبھی اک وقت تھا اک دور تھا
اپنا گھر جب اپنا گھر لگتا رہا

راستے کی سمت کیا جاتا خیال
اپنی مدہوشی سے ڈر لگتا رہا

دشمنوں سے خوف تو کل کی ہے بات
خود سے ڈر تو عمر بھر لگتا رہا

اُس کے ہاتھوں کا تھا یہ سارا کمال
زہر بھی ہم کو شکر لگتا رہا

اُس کی سوچوں کے کبھی راستے جدا
جانے کیوں وہ ہمسفر لگتا رہا

پھر بھی اک اُمید پر چلتے رہے
رائیگاں ہر اک سفر لگتا رہا

O

**سہیل نازی پوری (کراچی)**

بھوک نے کی قمۂ تر کی شناخت
اشکِ غم نے کی سمندر کی شناخت

زعمِ فنکاری کے صدقے جایئے
تیشۂ فن اور پتھر کی شناخت

ٹوٹا پھوٹا کاسۂ دریوزہ گر
بے بصر عہدِ ستمگر کی شناخت

رات کی دہلیز پر شامِ فراق
کر ہی لے گئی دیدۂ تر کی شناخت

بے ہنر دل کی بھی اک پہچان ہے
جیسے گلشن میں گُلِ تر کی شناخت

روشنی ہو تیز تو مشکل بھی ہے
چہرۂ مہتاب و اختر کی شناخت

عقل گُم صُم اور طرزِ شاعری
حرف کی دیوانگی، سر کی شناخت

رنگ و روغن ایک ہیں سب کے سہیلؔ
کتنی مشکل ہے کسی گھر کی شناخت

O

**انور جاوید ہاشمی(کراچی)**

مُشکل ہے! کیا چاہتی ہے آسان نیا سا
چاہتی ہے نظر دیکھنا ہر آن نیا سا

جاتی ہے جہاں سے کوئی کہنہ سی اگر روح
دے دیتا ہے مالک وہاں مہمان نیا سا

عادی ہوا احساسِ زیاں سے یہ مرا دل
محسوس کہاں ہوتا ہے نقصان نیا سا

پھولوں کی طلب دل میں لیے بیٹھی رہی وہ
ٹیبل پہ رکھا رہ گیا گل دان نیا سا!

اشعار سے تقریر سجاتے رہے لڑکے
اب ڈھونڈتی ہیں لڑکیاں دیوان نیا سا

تم جتنے جتن ہاشمی کر لو نہ ملے گا
تم کو نئے دیوان کا عنوان نیا سا

O

**عزمؔ بہزاد(کراچی)**

مرے خدا نے مجھے کتنا سرفراز کیا
میانِ اہلِ ہوس مجھ کو بے نیاز کیا

تری نگاہ سے اسلوبِ خامشی سیکھا
اور اپنے آپ کو اہلِ خبر میں راز کیا

تمام عمر مروت کی نذر کر ڈالی
ہمیشہ خود سے بچا دوسروں پہ ناز کیا

ملا جو ہجرِ مسلسل تو دل نے تنگ آ کر
ترے وصال کی خواہش کو بے جواز کیا

جہاں بھی ذکر چھڑا تیری ہمرہی کا وہیں
ہمی نے سلسلۂ گفتگو دراز کیا

جو اشک عزمؔ مری آنکھ تر نہ کر پائے
انہی سے شام و سحر میں نے دل گداز کیا

**لیاقت علی عاصمؔ(کراچی)**

ماورائی کو ڈھونڈ کے لائے کِسے مجال
آئے گا خود ہی خواب میں وہ گم شدہ خیال

وہ آئینے سے لوگ تو بے عکس ہو چکے
اب ہم ہیں اور اپنے خدوخال کا ملال

ہم نے تو یہ کہا تھا کہ دیوار تھام لے
یہ تو نہیں کہا تھا کہ آ کر ہمیں سنبھال

صبحِ ازل سے شامِ ابد تک ہے میری عُمر
تقویمِ عشق میں کہاں ہوتے ہیں ماہ و سال

## صابر عظیم آبادی (کراچی)

وہی ترجیح دیتے ہیں جفا کو
وفا کہتے نہیں ہیں جو وفا کو

قدم آگے بڑھاتا جا رہا ہوں
چراغِ رہ بنا کر نقشِ پا کو

انہیں کے پیچھے دُنیا بھاگتی ہے
بھلاتے جا رہے ہیں جو خدا کو

عذابِ وقت نازل ہو رہا ہے
اُٹھاؤ ہاتھ اب لوگو دُعا کو

کسی کی یاد جب آتی ہے پیہم
پہنچ جاتی ہے وحشت انتہا کو

وہی تعریف کے قابل ہے عورت
بنا لیتی ہے زیور جو حیا کو

محبت ہے تمہیں تو توڑ ڈالو
حصارِ سایۂ شاخِ انا کو

مری بستی کے سارے رہنے والے
ترستے ہیں عروج و ارتقا کو

عجب انسان ہیں ہم لوگ صابر
خوشی میں بھول جاتے ہیں خدا کو

O

## علی آذر (کراچی)

محفل کو خوشبوؤں سے بساتے ہیں تنہا لوگ
تنہائی میں بھی بزم سجاتے ہیں تنہا لوگ

خورشیدِ جاں پہ گہن لگا ہوتا ہے مگر....
چہرے سے اپنے کرنیں اُگاتے ہیں تنہا لوگ

گرچہ عذاب سہتے ہیں ہر لحظہ ہر گھڑی
خوابوں کے محلات بناتے ہیں تنہا لوگ

ان کا تو دل بُجھا بُجھا رہتا ہے صبح و شام
تاریک گھر میں دیپ جلاتے ہیں تنہا لوگ

زخموں پہ ان کے کوئی کب مرہم لگاتا ہے
مرہم دریدۂ دل پہ لگاتے ہیں تنہا لوگ

تنہائی میں رو لیتے ہیں اکثر علی آذر
کب دُکھ کسی کو اپنا بتاتے ہیں تنہا لوگ

O

### کرامت بخاری(لاہور)

بہاروں کے قدم آنے کے دِن ہیں
دِل ناداں کو سمجھانے کے دن ہیں

کسی کے زلف لہرانے کا موسم
کسی کے اشک چھلکانے کے دِن ہیں

کسی کو واسطہ ہے رتجگوں سے
کسی کے خواب مہکانے کے دِن ہیں

نگاہوں کو ہے نظارے کی دعوت
نظر کے شوق فرمانے کے دِن ہیں

ہمیں واجب ہے تعظیمِ تحیر
جو کھویا ہے اُسے پانے کے دِن ہیں

طبیعت کا تقاضا تو یہی ہے
کوئے جاناں کو جانے کے دِن ہیں

یہی دِن ہیں متاعِ بزم ہیں
یہی تو عشق فرمانے کے دِن ہیں

O

### رب نواز مائل(کوریا)

کہیں تو سفر چھوڑنے سے خوشی ہو
کہیں پھر سفر پہ سفر کی پڑی ہو

جسے آنکھ جھٹلائے دل کب جگہ دے
بھلا اُس نظارے سے پھر کیا خوشی ہو

یہ اپنی سُووَں ناموں سے ہے وہ بچی
کمی ہو تو بس اِک دُکھوں کی کمی ہو

یہ ناموت جاری سا اِک سلسلہ ہے
کہ بس ہر گھڑی کوئی تو دِل لگی ہو

جسے نام بد سے ہی عالم یہ جانے
تمہاری ہر اِک بات وہ بھی مری ہو

### خالد مصطفیٰ(راولپنڈی)

نہیں تھی میرے گھر کی چار دیواری بڑی مدّت
سو گذرے اس سے بیابانی و تاتاری بڑی مدّت

ذرا ظلِ الٰہی نے رعایا پروری کی تھی
رہے دل میں خفا ممتاز درباری بڑی مدّت

اگر میں چاہتا ساری زمیں مفتوح ہو جاتی
مجھے حاصل رہی جذبوں کی سالاری بڑی مدّت

مجھے اس معرکے میں ہار جانے کا بہت دُکھ ہے
کہ کی تھی اس دفعہ لشکر نے تیاری بڑی مدّت

مرے شانے ہیں اور اس دور کے سلطان ہیں خالدؔ
مرے پُرکھوں نے کی یہ بار برداری بڑی مدّت

**ڈاکٹر نثار ترابی (راولپنڈی)**

وفا کے دیپ جو ہم نے جلا کے رکھے ہیں
عجیب خواب ہیں دل سے ملا کے رکھے ہیں

ہزار کوس کی دوری پہ اُس سے دل ہے مرا
وہ جس نے پاؤں سے پاؤں ملا کے رکھے ہیں

یہ گفتگو بھی کوئی موج کی روانی ہے
بھنور میں جیسے بھنور سے صدا کے رکھے ہیں

وہ آئینے جو سجے ہیں تری تمنا میں
زمانے بھر کی نظر سے بچا کے رکھے ہیں

کبھی تو بھیج پیاسوں کی لاج رکھنے کو
وہ سلسلے سے جو تُو نے گھٹا کے رکھے ہیں

یہ کس نے ناز و ادا کا چلن سکھایا ہے
یہ کس نے آنکھ میں ڈورے حیا کے رکھے ہیں

کبھی نثار ترابی پہ بھید بھی تو کھلے
کہ زخم کس نے گلوں میں کھلا کے رکھے ہیں

O

**شگفتہ نازلی (لاہور)**

اَوراقِ باوقار کُھلے ہیں چہارسُو
نقش و نگار کیسے کِھلے ہیں چہارسُوؔ

ترتیب پا رہا ہو جو شعری خیال تو
مصرعے سے جیسے مصرعے مِلے ہیں چہارسُو

خوشبو کے قافلے ہوئے ہیں مہربان یوں
گلزار میں گلاب کِھلے ہیں چہارسُو

ہے موضوعات کی دھنک آنکھوں کے سامنے
رنگوں میں جیسے رنگ گُھلے ہیں چہارسُو

اعزاز کے قرطاس کے سنگ سنگ مکالمہ
قلمی سفر میں ساتھ چلے ہیں چہارسُو

رَس رابطے تو جانیے اَخلاص نامے ہیں
پُرلطف سے کچھ شکوے گِلے ہیں چہارسُو

آفاقیت کا پیام لئے حرف حرف ہیں
حرفوں کی ضو میں معنی ڈھلے ہیں چہارسُو

اُردو ادب فروغ کی یکتا سی راہ پہ
فکر و نظر کے باب کھلے ہیں چہارسُو

قاری کو روشنی محیط کرتی رہتی ہے
دانش کے کیسے دیپ جلے ہیں چہارسُو

تخلیق کرنے والوں کو مربوط رکھتا ہے
سب ہم جلیس اِس پہ تُلے ہیں چہارسُو!

## شاہین فصیح ربانی(کراچی)

رستوں میں سراب رہ گئے ہیں
جیون میں عذاب رہ گئے ہیں

تعبیر کہیں پہ کھو گئی ہے!
آنکھوں میں خواب رہ گئے ہیں

گلشن میں بہار ہے کوئی دَم!
دو چار گلاب رہ گئے ہیں

نظروں میں حیا نہیں رہی ہے
چہروں پہ نقاب رہ گئے ہیں

کوشش تو ہوئی سنوارنے کی
ہم پھر بھی خراب رہ گئے ہیں

منزل تو کسی نے پا بھی لی ہے
ہم پا بہ رکاب رہ گئے ہیں

پیاسوں کے نصیب میں فصیح اب
وعدہ کے سحاب رہ گئے ہیں

O

## فیصل عظیم(کولاڈا)

کیا رنگت پھر سے بدلے گی؟ کیا واقعی رت گدرائے گی
کیا اب کے موسم بدلے گا؟ کیا بادِ بہاری آئے گی

اب چند قدم ہی باقی ہیں اور پیر کہ ٹوٹے جاتے ہیں
یہ گرد نجانے منزل کی کیا کیا شکلیں دکھلائے گی

کچھ دل کو تسلی ہو جائے جو بیٹھ رہا ہے سینے میں
تم آج یقیں سے یہ کہ دو "وہ شام بھی آخر آئے گی"

وہ ایک گھڑی جس کے سپنوں میں آدھی عمر بتائی تھی
معلوم نہ تھا وہ ساعت اس بے رخی سے کترائے گی

یہ زم ہوائیں ہیں لیکن ان کے سنگم پر نصب ہوں میں
یہ آندھی کا اعلان بھی ہے جو میری خاک اڑائے گی

اِس منظر سے اُس منظر تک دو چار قدم کا رستہ تھا
معلوم نہ تھا اس رستے میں سب پونجی ہاتھ سے جائے گی

بس ایک بھرم جو قائم تھا وہ میرے ساتھ ہی ٹوٹ گیا
یہ خار چبھے گا سینے میں تو روح کہاں رہ پائے گی

تم اپنے ہاتھ کے شعلوں پہ خورشید کا دعوی کرتے تھے
یہ سورج آخر نکلا ہے،اب دھوپ بھی آخر آئے گی

ہاں ایک یقیں خاموشی سے اب تک موجود ہے سینے میں
ہاں صبح یہیں سے پھوٹے گی ہاں رات یہیں سے آئے گی

**اختر رضا سلیمی(اسلام آباد)**

دمِ وصال جو کھولی قبائے حُسن و جمال
رواں بدن میں ہُوئی آبنائے حُسن و جمال
ہُوئی ہے فکر مری غرق کس تجسس میں
یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے سوائے حُسن و جمال
مری نظر پہ مسلّط ہیں چند منظر
اِدھر بھی چشمِ کرم اے خدائے حُسن و جمال
طلسم ٹوٹتے جاتے ہیں ایک اِک کر کے
سفر ہے جانبِ حیرت سرائے حُسن و جمال
یہ منظروں میں جو آئی ہے دلربائی سی
کچھ اور بھی ہے یقیناً ورائے حُسن و جمال
خُدا نے خلق کیا عشق اور پھر اختر
نگاہِ عشق نے رکھی بنائے حُسن و جمال

**احمد ظہور(اسلام آباد)**

کئی دنوں سے ظہور گم سُم اُداس بیٹھا ہے اپنے گھر میں
کوئی نہیں ہے جو آ کے پوچھے کہ روگ کیا ہے تیرے جگر میں
کبھی دیواروں سے پوچھتا ہے جواب اپنی محبتوں کا
کبھی ستاروں میں کھوجتا ہے نئے سوال ایک چشمِ تر میں
کھڑا ہوں دہلیز پر کہ جس کا میں منتظر ہوں کہیں وہ آ کر
ملے بنا پھر چلا نہ جائے ابھی جو آیا نہیں ہے گھر میں
کسی کی نظروں سے گر کے شاید سنبھل سکے پھر جہاں میں کوئی
سنبھل سکے گا مگر وہ کیسے گرا ہو اپنی ہی جو نظر میں
یہ کیسی دوری ہے قربتوں میں صلہ ہے کیسا محبتوں کا
اُسی سے لپٹا اُسی کو سوچوں اُسی کے پہلو میں رات بھر میں
برہنہ پا خار زارِ اُلفت میں ساتھ تیرے چلا تھا لیکن
بچھائے کتنے گلاب جاناں ظہور نے تیری رہگزر میں

**پرویز ساحر(ایبٹ آباد)**

تُو جو کہے تو بازی ہاری جا سکتی ہے
تجھ پر اپنی جان بھی واری جا سکتی ہے
یہ بھی ممکن ہے اِس عالمِ اِمکاں میں
خوشبو کی تصویر اُتاری جا سکتی ہے
مٹی کا بس ایک ذرا سا دِیا جلا کر
سینۂ شب میں بَرچھی ماری جا سکتی ہے
مانا اُس کو پانا ہے دُشوار بہت
لیکن جان تو نذر گزاری جا سکتی ہے
یہ میری ہستی ہے کوئی زُلف نہیں
زُلف کا کیا ہے زُلف سنواری جا سکتی ہے
اُس کوچے میں بس اِک میرا گزر ہے ساحر
یا پھر موجِ بادِ بہاری جا سکتی ہے

**علی شاہ(ہنگر)**

گھپ اندھیروں میں سدا جس نے اُجالے پتھر
زیوروں میں ہیں جُڑے اس کے نرالے پتھر
کوئی احسان وہ سر اپنے نہیں رکھتا ہرگز
میں نے تو پھول دیے اس نے اچھالے پتھر
آ گئے شہر میں کچھ لوگ نئی سازش لے کر
چاند چہرے ہیں مگر دل میں ہیں کالے پتھر
میری بستی کو مٹا ڈالا ہے تری موجوں نے
اتنا منہ زور ہے گر تُو تو بہا لے پتھر
وقت بے رحم نے کیا اُس پہ ستم ڈھائے ہیں
وہ تو خود پھول ہے اب کیسے سنبھالے پتھر
تیرا شیشے کا بدن خود نہ بکھر جائے کہیں
زندہ رہنا ہے تو پھر خود کو بنا لے پتھر
میں جسے پھول شب و روز دیا کرتا تھا
مجھ سے بس اس نے علی اتنا کہا لے پتھر

# نسائی ادبی تنقید پر ڈریڈا کے اثرات اور باہمی تعاون وملاپ

حمیدہ معین رضوی (لندن، یو کے)

(۱)

نسائی تحریک نے اپنی جد وجہد کے تیسرے دور میں تقریباً تمام حقوق حاصل کر لئے تھے جس کی بنا پر انہیں معاشی اور معاشرتی آزادی اور وقار حاصل ہوا ادب کے میدان میں بھی انہوں نے جد وجہد جاری رکھی مگر اپنے بعض نظریات کے باعث انہیں سخت مقابلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اب تنقید میں ان کی کوشش یہ تھی کہ ایسا ادبی اور تنقیدی نظریہ وجود میں لایا جائے کہ مردوں کی حوصلہ افزائی کی محتاجی سے نجات ملے اور دوسرے تنقیدی نظریات کی فکر کا بھی ہو۔ اس کی ابتدا انہوں نے مردانہ تحریروں کو دوبارہ لکھ کر سخت حملے بھی کئے اور مذاق بھی اڑایا لیکن سنجیدہ کوششیں بھی جاری رہیں۔ چند اہم کتابوں کا تذکرہ کر کے میں اصل موضوع کی طرف بڑھنا چاہوں گی۔

(1) Petritia Speaks 1975

(2) Literary Women Elen Moer 1976

(3) Elain Shoalter A Literature of their own 1977

(4) Mary ellman Thinking about women 1979

(5) Lisa Jardine Still Harping on Daughters Women & Drama in the age of Shakespeare

(6) Kathleen Mcluskie:The Patriarchal Bard Faminists Criticism and Shakespeare

(7) Janet Adelman Suffocating Mothers

یہ ہزاروں کتابوں میں سے چند کے نام ہیں۔ جن میں ادب و تنقید کا نسوانی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا گیا تھا اور نتائج اخذ کئے گئے تھے۔ ان میں ٹلی اولسن کی Silence نے قارئین کو بے حد متاثر کیا کیونکہ یہ اس کی خود نوشت سوانح حیات ہے جس میں اس نے ان سارے دکھوں کی نشاندہی کی ہے جو ادبی دنیا میں داخل ہونے پر اس نے اٹھائے کہ کیسے ذہانت کے ہاتھ قلم کئے جاتے ہیں اور ہونٹوں پہ پہرے لگتے ہیں۔

جس زمانے میں نسائی تحریک کو عروج حاصل ہوا تو ہر طرف نظریات اور فلسفوں کی کھیتیاں لگ رہی تھیں خواتین نے ہر نقطہ نظر پر تجربے کئے۔ فرائڈ کی تحلیل نفسی اور اس کے خیالات کو امریکن خواتین نے بالکل مسترد کر دیا جب کہ فرنچ فیمنسٹوں نے اس کو خوش آمدید کہا خاص طور پہ "ماؤسٹ" نظریات کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ مشہور ہو گیا کہ چند مفکرین کے ایک انقلاب برپا ہونے والا ہے۔ جلد ہی ماؤسٹ نظریہ سے ان کی دلچسپی ختم ہو گئی اور انہیں فرائڈ کی تحلیل نفسی کے ذریعہ عورت کے لاشعور میں چھپے مظلومیت اور محکومیت کے اثرات کو جاننے کی امید تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس راز سے پردہ اٹھایا جا سکے گا کہ پدری نظام میں نسائیت پہ کیا گزری۔ اس سلسلے میں ژاک لکاں سے بھی نظریات کے تبادلے ہوئے اور مذاق بن گیا کہ لکاں عورت کی صف میں چھپا مرد ہے کیونکہ اس کو نسائی تحریک سے پوری ہمدردی بھی تھی۔ Man Made Language میں بھی خوب غصہ اتارا گیا لیکن اس کتاب میں جن حق تلفیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی حد اک سے آگے نہیں ہے اس میں حیات ممات اور کائنات کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ 1983ء میں ایک کتاب شائع ہوئی جس کا نام ہے This bridge called my back۔

پہلی کتاب کے مضامین کے تنگ دامانی کا احساس ہونے کے بعد اس شرمندگی کو دھونے کے لئے ایک کتاب لکھی گئی۔ (1) Writing by Radical Women of Colours اور اس میں کچھ وسعت بیان بھی ہوئی۔ لکاں اور بارتھز کے زیر اثر ہی کتاب لکھی گئی ہے (2) Faminist Theory and Post Structure Theory۔

اس کتاب میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ پس ساختیات تنقیدی نظریات میں اتنی گنجائش ہے کہ وہ فن مسائل کا حل تلاش کریں یا کرنے کی کوشش ہو جو انسانوں میں طبقاتی تفریق، نسلی تفریق اور خصوصاً جنسی تفریق سے پیدا ہوتے ہیں یہیں سے تنقیدی نظریات وضع کئے جا سکتے ہیں۔

1966-67ء کا وہ زمانہ ہے جب تنقیدی ادب میں بہت سے نظریات پیدا ہوئے بارتھز کا مضمون ادیب کی موت بھی اس وقت شائع ہوا ڈریڈا بھی تحریر و تقریر کے میدان میں نکلے اور ہائی ڈگا کے نظریات پیش کر رہا تھا اور جدیدیت زوال پذیر تھی۔ ساختیات دم توڑ رہی تھی بعض لوگ اسے پس ساختیات بھی کہتے ہیں اور کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ پس ساختیات کوئی چیز نہیں لیکن مارکسی تنقید اور روسی ہیئت پسندی کی تنقید قائم تھی اور نسائی ادیبوں نے اس کو استعمال بھی کیا تھا بلکہ انہوں نے ہر نظریہ پہ غور و خوض ضرور کیا۔

بہر حال اتنے بہت سے نظریات کے ایک ساتھ برآمد ہونے کی کئی وجوہات تھیں۔ خصوصاً معاشی، برطانیہ اور فرانس اب بڑی طاقت نہیں رہ گئے۔ روس کمزور پڑ رہا تھا امریکہ اپنے مفاد کے دانت کو سے بڑھا رہا تھا۔ بہت سے ملک آزاد ہو گئے تھے مگر الجھے ہوئے ہندوستان پاکستان میں جھگڑا۔ ہندوستان اور چین میں مقابلہ کو یا ویت نام دنیا سکڑ گئی تھی اور خیال بڑھ گئے تھے۔ ذریعہ ابلاغ ہر خیال کو دنیا بھر میں پھیلانے لگا تھا۔ نسل پرستی کینیڈی کا

قتل، مارٹن لوتھر کنگ کا قتل، طاقت، ثقافت اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہندوستانی طاقت کے ساتھ یوگا، ویدوں اور پرانوں میں دلچسپی شروع ہوئی۔ روس سے نمٹنے کے لئے امریکہ کی جماعت اسلامی میں دلچسپی شروع ہوئی۔

ناول کی دنیا میں جیمز جوائس اور ورجینیا وولف کی تکنیک آرٹو (Artoud) اور ملارمے کے اثرات دنیا بھر پہ پڑے۔ ادب سے علامت نگاری، جدیدیت رخصت ہو چکی تھی تا ہم فلم اور ڈراموں میں اسے بعد میں بھی برتا جاتا رہا۔

ساختیات کی اشاریت اور نشانیات کی تنقید، ادب اور تجزیہ نگاری میں ساسور کے اصول ہائے زبان کو برتا جا رہا تھا فرانسیسی مفکر دانش ور کرسٹیوا اور ژاک دریدا دونوں فرانسیسی ہیں دونوں ایک دوسرے کے مضامین دلچسپی سے پڑھتے رہے ہیں اور دونوں ملارمے کے علاوہ ہائی ڈیگا اور نطشے سے بھی متاثر تھے لیکن ان کی تحریروں میں نتائج بالکل مختلف انداز میں رونما ہوئے ہیں۔ یہی زمانہ ہے جب Semianalysis and Derrida's Deconstructio n چھپی۔ جینا کرسٹیوا نے بھی اس کا گہرا مطالعہ کیا تھا لیکن اس نے پہلے اشاریت کی تنقید Semiotic کے ادبی پہلو پہ توجہ دی اور کرداروں کی تحلیل نفسی کا تصور پیش کیا۔ کرسٹیوا نے مارکسی اور فرائڈین تحلیل نفسی کے ساتھ لکاں کے نظریات کو بھی استعمال کیا اس کے باوجود اس نے صرف ایک کتاب لکھی ہے۔ Sexual V. Textual فرانسیسی نسائی نقادوں نے Textual زبان والی کو ترجیح دی ہے اور اشاریت یا نفسیاتی تحلیل نفسی پہ لکھا ہے اور استعمال کیا ہے اگرچہ لکاں کے خیالات کسی منطقی اصول کے تابع نہیں ہیں مگر نسائی نقادوں نے خاص طور پر فرانسیسی نقادوں نے اسے پسند کیا اور کرسٹیوا نے اشاریت اور ساختیات پہ کافی بحث کی خصوصاً سماجی اور عمرانی مسائل کے حوالے سے اشاریت اور علامت کو مختلف انداز میں استعمال کیا گیا جبکہ انگریزی بولنے والے حلقوں میں اس کو زیادہ پسند نہیں کیا گیا کیونکہ اس کے ڈانڈے ساختیات سے ملتے ہیں اور نسائی نقادوں کو کسی بہت بڑے بااثر حلیف کی ضرورت تھی لیکن مارکسی تنقید پہ البتہ بحث ہوئی۔ اور اس کو بھی ادبی تنقید کے حوالوں میں استعمال کیا اس تجزیہ کو پڑھتے ہوئے مجھے کرسٹیوا کا ایک بیان بہت دلچسپ محسوس ہوا۔

"استحصال کی قبر کھودنے والے پرولتاری نہیں جیسا کہ مارکس کہتا ہے بلکہ کبھی غلام نہ بننے والا جو گل پہ آمادہ bed ہے تو وہ ہر قانون کی دھجیاں بکھیر دیتا ہے خاص طور پہ وہ قوانین جن میں اسے جبیت اور ساخت نظر آتی ہے" کرسٹیوا Resolution P ڈسکن گلکاں، بارتھز اور کرسٹیوا جیسی ادب اور تنقید کی بحث میں نطشے اور ہائی ڈیگا کے فلسفیانہ خیالات سے متاثر تھے یہ خیالات ژاک دریدا کے ذریعے عام ہوئے تھے اور ایک نئے دور کی نوید دے رہے تھے۔ 1966ء میں ژاک دریدا نے اپنا Deconstruction یعنی بیخ کنی یا ویرانی تعمیر کا فلسفہ پیش کر کے ادب و تنقید، سماجی نظریات، عمرانیات اور تاریخ کی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔

ویرانی تعمیر کے فلسفہ کا محرک پیدائش 1966ء ہے جب فرانسیسی فلسفی ژاک دریدا نے جون ہوپکن یونیورسٹی کی ایک کانفرنس میں ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا۔

"ساختیات، نشانیات، کھیل، انسانی سائنس کی گفتگو میں"

اس مقالے کو دانشوروں نے سن کر رائے دی تھی کہ "آج ساختیات کا کریا کرم ہو گیا۔" اور بعض نے یہ بھی کہا کہ یہ پس ساختیات کا اعلامیہ بھی ہے جب کہ اکثریت کا یہ بھی خیال ہے کہ پس ساختیات کوئی چیز نہیں۔

میں نے Deconstruction کا ترجمہ فارسی کے اس شعر کو مدِنظر رکھ کر کیا "اول آں تعمیر را ویراں کنند"۔ Deconstruction کے سارے فلسفہ کا بھی یہی مطلب ہے کہ ہر پرانی چیز کی بیخ کنی کرنا مجھے ویرانی تعمیر زیادہ اچھا لگا۔ معلوم نہیں اردو کے دانشور کیا پسند کریں گے؟ یہ ویرانی تعمیر کا فلسفہ ہیگل، ہائی ڈیگا اور نطشے سے مستعار ہے اور اب اس نے ادبی اور تنقیدی دائرے سے نکل کر سائنس، سماجی، عمرانی، معاشرتی، تاریخی اور انسانی زندگی کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ ایسی تحریک جو ہر قائم اور موجود اداراتی نظام کی بیخ کنی کرے تا کہ نئی قدریں لائی جا سکیں خواہ ایسی کوئی قدر موجود ہو یا نہ ہو۔ قدامت پسند اور پرانی قدروں پہ جان دینے والے برطانوی صاحب علم کہتے ہیں کہ "اس کا مطلب ہے انسانیت کی ہر قدر کو مٹا دینا" جبکہ انگریزی بولنے والے جو دانش گاہوں میں علم بانٹ رہے ہیں وہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ نطشے اور ہائی ڈیگا کے نظریات کی نشاۃ ثانیہ کا وہ سیلاب جس نے دانشوروں کو ہلا دیا ہے۔

مخدوم کے ادبی حلقوں نے ہر ادبی نظریہ پہ غور و خوض کیا مگر انداز وہی تھا۔

چلا ہوں تھوڑی دور ہر ایک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ژاک لاکاں (1902ء سے 1980ء) اپنے تحلیل نفسی کے تنقیدی نظریہ کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر چکا تھا اس نے فرائڈ کی تعلیم کو دوبارہ زندہ کیا اور ادبی تنقید میں اسے متعارف کروایا تھا۔ لکاں سے متاثر ہو کر سوسور نے یہ خیال پیش کیا کہ زبان صرف اختلاف کی وجہ سے قائم ہے اور اس کا اپنا کوئی وجود نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ سبز اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے مقابل سرخ موجود ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ یہ کوئی منطقی نقطہ نظر ہے۔ شکل چہرہ پر آنکھوں کے مقابل کیا ہے جو ہم ان کو آنکھیں کہتے ہیں؟ یا کوئی کے مقابل کیا

ہے جس نے اسے کوئی کام دیا ہے۔

پھر لاکاں کہتا ہے کہ اجزا کی قیمت اور حیثیت بجز داو معروضی نہیں بلکہ اضافی ہے یعنی ایک جز دوسرے سے متعلق ہے جڑا ہوا ہے۔ بے شناختی خواہش اور الجھن بے بسی کو پیدا کرتی ہے۔ لاکان کا کہنا تھا کہ شناخت کے الجھن کی خواہش کا ہونا ضروری ہے وغیرہ۔

سب سے پہلے فیمنسٹ نقادوں نے لاکان کو آڑے ہاتھوں لیا الیزبتھ گروز نے تو یہ بھی کہہ ڈالا کہ لاکان اپنے مردانہ عضو سے قائد بنا کر جو دل چاہے کہہ دے لوگ سے اہم جانیں گے ورنہ اس کے نظریات میں منطق کے سامنے ٹکڑے ہونے کی سکت نہیں۔ ژریڈا نے بھی اس حیثیت میں لاکاں کا مذاق بنایا جس کے نتیجے میں لاکاں نے تحلیل نفسی کو بالائے طاق رکھ کر اپنی توجہ تحریر اور زبان پہ دینی شروع کی یہی وجہ ہے کہ فیمنسٹ نقادوں نے لاکان کو ہر صورت زیر مطالعہ رکھا بلکہ یہ وہ دور ہے جب خود ژاک ژریڈا بھی فرائیڈ پہ لکھ رہا تھا۔ فیمنسٹ نقاد بھی چونکہ نفسیاتی تنقید میں دلچسپی رکھتی تھیں اس لئے انہیں لاکاں کا مذاق اڑانے کے باوجود مستقل اس کو مطالعہ میں رکھنا پڑا۔ باربرا جونسن نے اپنی کتاب The Critical Difference in Contemporary Rhetorics of Realities 1980 کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوز لاکاں فرائڈ اور ژریڈا سب کا مطالعہ کیا جا رہا تھا۔ خاص طور پر ژریڈا اور لاکان۔ جوز سب ایک ہی دور میں سب کچھ لکھ رہے تھے اور لاکاں اور ژریڈا نے ان کو سنجیدگی سے اہمیت بھی دی کہ دونوں ژریڈا اور کرسٹیوا ہم وطن تھے اور برابر لکھ رہے تھے۔ ژریڈا نے جب ویرانی تعبیر کا نظریہ پیش کیا تو فیمنسٹ اہل قلم کو اس میں بہت دلکشی نظر آئی کیونکہ فیمنسٹ تحریک خود کلیسا، مذہب، سیاست اور طاقت کے تمام سرچشموں کی ستائی ہوئی تھیں اور انہوں نے استحصال کی ہر صورت ہر بت کو توڑ پھوڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا تھا..... اس وجہ سے ژاک ژریڈا کے فلسفہ میں انہیں امان ہی نہیں ایقان بھی نظر آیا۔ ژریڈا کی انتہا پسندی اپنانے سے انہیں اعتبار حاصل ہوا اور یہی وہ چاہتی تھیں۔ نیکلیس ابراہم اور ماریا توروک کی تحریر میں پر اسرار ہے ژریڈا کے فرائڈ پہ تنقیدی مضامین پڑھ کر آئی اور اس سے ژریڈا نے بھی سیکھا۔ ژریڈا نے تحلیل نفسی کے نفسیاتی رویے کے حصے بخرے ادھیڑ دیئے تو گویا فرائڈ کا لاکاں جوز کے نظریات کی ژریڈا نے نفی کی اور اولیں آن تعبیر راویین کرد..... اور اس خیال کو ویرانی تعبیر کا نام دیا گیا۔ فیمنسٹ نقادوں نے مارکسی تنقیدی رویے کے بعد ژریڈا کے "ویرانی تعبیر" کا رویہ اپنا کر ادبی تنقید پہ گہرے اثرات مرتب کئے ہیں گذشتہ مضمون میں میں نے اس حوالے سے کئی خواتین نقادوں کا ذکر غائباً کیا تھا۔ ویسے بھی زیر نظر مضمون کو صرف "ویرانی تعبیر" اور فیمنسٹ تنقیدی نقطۂ نظر کا اندرونی جو تعلق ہے پس منظر اور نتائج پہ بحث کرنے تک خود کو محدود رکھوں گی۔

بہر حال فیمنسٹ ادیبوں نے ہر پرانے نظریہ کو توڑ پھوڑ کر نئے سرے سے اپنی نسوانی حقیقت، کائنات، معاشرہ میں اپنی حیثیت اور اپنی ذات کے جواز کا نیا حوالہ ڈھونڈنا شروع کیا۔ جنسی اختلاف، سیاسی اصول، طاقت کا توازن۔ اس کا جواز نئے فلسفیانہ نظریات کی روشنی میں ڈھونڈنا شروع کیا۔ ژریڈا کے "ویرانی تعبیر" کے ساتھ نہ چاہتے ہوئے بھی نطشے ہائی ڈگا ہی نہیں خود ہیگل کا خیال آموجود ہوتا ہے ہیگل کا فلسفہ بھی اجتماع ضدین پہ ہی ہے دیکھا جائے تو قرآن پاک خود اجتماع ضدین کا بار بار ذکر کرتا ہے بلکہ عربی میں زوج مرد کو بھی کہتے ہیں اور عورت کو بھی اور زمین آسمان کو بھی دن اور رات، موسموں کا تغیر، موت سے زندگی، زندگی کے بعد موت۔ سورہ مومنون۔ سورہ روم۔ سورہ فرقان اور بہت سی جگہوں پہ صرف مختصر حوالے۔ خواتین ژریڈا کے ذریعے پائی فلسفوں کو اپنے اندر جذب کر کے بکھری ہوئی کائنات اور زندگی کے ہزاروں عکس اور لاکھوں حوالے کا جواز پیدا کرتی۔ فرق یہ ہے ہم چیزوں کے اختلاف سے ایک مادری قوت کا ایقان کرتے ہیں یہاں نفی کے بعد کوئی اثبات نہیں اور کوئی فلسفہ ہو خاص کر مغرب تو اس کا تعلق طاقت سے ہوتا ہے اس کو طاقت کے بل بوتے پہ عام کیا جاتا ہے۔ ہمارے فلسفہ اثبات کے پیچھے حکومتی طاقت نہیں اس لئے اور بھی شکایت ہے خود مسلم کو رہی ایک بات یہ بھی ہے لوہے کو لوہا کاٹتا ہے ہمارے ہاں دماغ بھی بک جاتے ہیں کوئی ہے بھی نہیں ایسا دماغ جو ہمارے تضاد اور اثبات کے فلسفے کو مغربی دماغوں کی طرح پھیلا کر پیش کرے بیچاری میری شمل اسلام لا کر بھی اس کا کھلا اعلان نہ کر سکی سے بھی اس شیطانی قوت سے خوف تھا جس کے پنجے گھر گھر پہنچ رہے ہیں۔ بہر حال خیال کا سلسلہ چل نکلا شاید کبھی اس موضوع پہ بھی لکھ سکوں فی الحال تو بات فیمنسٹ نقادوں کی ہے کہ انہوں نے "چار بزوں" کے مطالعہ سے یہ بات جان لی کہ عورت کے وجود کی نئے سرے سے تشریح کی جائے۔ انہوں نے نئی دریافت یہ کی (۱) عورت کا جسم اور نفسیات الفاظ کے حدود میں جکڑے نہیں جا سکتے یعنی اس کا جسم اور جذبات الفاظ کا جامہ نہیں پہن سکتے۔ ذاتی طور پر مجھے اس سے اتفاق نہیں (۲) عورت کی مکمل کر تعریف کی جانی چاہئے یعنی ایک ایک عضو اور رگ کی (۳) عورت اور مرد ایک جیسے نہیں ان میں فرق ہے۔ (بہت جلد سمجھ میں آیا)

میرے خیال میں پہلی بات حماقت زدگی سے بھری ہوئی دوسری بات اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا۔ تو آپ شوق سے کریں مرد بھی عورت کا استحصال اسی انداز سے کرتا ہے تیسری بات فضول لگتی ہے جس کا ہمیں یقین ہے کہ عورت مرد سے کمتر ہے نہ برتر ہے مختلف ہے ایک صدی کی محنت اور ژاک ژریڈا کے اس خیال سے کہ ہر ایک تعبیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی مفہوم کو سمجھ میں آیا کہ وہ مختلف ہیں اور مرد عورتوں میں فرق ہے اس فرق کی بنیاد پہ گفتگو کچھ معقول محسوس کی گئی۔ اس سے منکری رویے سے فیمنسٹوں کی آواز

میں وزن محسوس کیا گیا اور سوسور کاں اور ڈریڈا نے ان کی باتوں پر کان دھرا۔ اگر سوچا جائے تو مردوں کی تمام تر زیادتیوں کے باوجود جانے کیوں مجھ کو ژاک ڈریڈا کا تعاون اور اشتراک نہیں ناگزیر محسوس ہوا۔ اور صحیح محسوس ہوا بروقت بھی۔

ویسے فیمنزم اور "ویرانی" تعمیر میں اشتراک وسعادت اگرچہ نظر آتی ہے اور ادبی سطح پر اس اشتراک کو اہم تسلیم بھی کر لیا گیا ہے لیکن ابھی تک وہ اصول وضع نہیں کیے گئے جس کے ذریعے یا جن کے اوپر نسائی ادبی تنقید کی عمارت کھڑی کی جا سکے میرے اپنے خیال میں "ویرانی تعمیر" اور فیمنزم میں بہت بڑی قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں کسی بھی قدر کے قائل نہیں۔ (۱) دونوں مستقل اپنی تعریف اور حدود اربعہ متعین کرنے میں مصروف ہیں (۲) دونوں میں دو ٹوک بات کرنے کی سکت و اہلیت نہیں (۳) دونوں ایک دوسرے کے بارے میں اپنے نظریات بدلتے رہتے ہیں (۴) دونوں کے نظریات پانی کی لہروں پر بننے والی شکلوں کی طرح غیر واضح اور ناپائیدار ہیں۔ (۵) آخری یہ کہ دونوں ایک دوسرے کو الزام دیتے ہیں کہ دوسرا فریق ہم سے متاثر ہے اور دونوں کا ملاپ شک کے عنصر پر ہوا ہے ابھی تک واضح نہیں ہو سکا کہ کون کس سے متاثر ہے؟ اور کون کیوں دوسرے کو پسند کرتا ہے؟ محبت کا چونچلا ڈریڈا نے ایک بات ضرور اٹل اور دو ٹوک کہی کہ "ویرانی تعمیر" کا نظریہ نسائی نہیں ہے۔ ڈائین ایلم نے اپنی کتاب Faminism and Deconstruction 1994 میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے اور ژاک ڈریڈا نے Deconstruction in America Critical Exchange 17 Winter 1985 میں فیمنسٹ کے بارے میں بحث کی ہے یہی نہیں ڈریڈا نے Women in the Behive میں فیمنزم کی حمایت کی ہے اور ان کو مدد دی ہے ایلس جارڈین + پال سمتھ نے Men in Faminism لکھی ہیں۔

Ellen K. Feder and Mary C. Rawlinson Dreda and Femnism. Recasting the Question of Women.

Interpretation of Jacque Dreda by Nancy Holand۔

Displacement and Discourse of Women by Spyvak

گائتری چکرورتی

یہ مضامین کے جائزے اور کتابوں کے جائزے یہ ثابت کرنے کو کافی ہیں کہ چاہے ان کے ملاپ کی بنیاد شک و شبہ پر ہو لیکن کچھ رابطہ دونوں کو ایک دوسرے سے ضرور ہے اور دلچسپی بھی ہے اور جہاں کرسٹیوا جیسے لوگ ڈریڈا کے حلقہ ارادت میں داخل تھیں وہاں ان اہل قلم خواتین کی بھی کمی نہیں تھی جو ڈریڈا ایک اپنی صف میں شامل کرتا تو وہ کنارا اس کو اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتیں اور ڈریڈا سے متعدد وجوہات کی بنا پر چڑتی ہیں۔ ڈریڈا فیمنزم کی حمایت کے باوجود اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتا ہے کہ "فیمنزم کا سارا چکر یہ ہے کہ عورت مرد بننے کی حسرت میں مری جا رہی ہے" وہ پرانے فلسفیوں کی طرح سچائی کی تلاش کی رٹ لگاتا ہے جبکہ اسے خود بھی معلوم نہیں کہ وہ فیمنزم کے حوالے سے کس سچائی کی بات کر رہا ہے؟ یہ بھی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ کس بنا پر فیمنزم کو مابعد الطبیعاتی مسئلہ کہتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی خوشخبری دیتا نظر آتا ہے کہ فیمنسٹ غلط امید باندھے بیٹھی ہیں کہ "ہم صداقت تک پہنچ سکتے ہیں" بحث اور جوابی بحث پڑھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ڈریڈا فیمنزم کی دلدل میں کود پڑا اگر پڑا ہوا اس سے نکلنے کی کوشش میں مزید پھنستا گیا۔

جبکہ بہت سی خواتین ڈریڈا کے غیر دوستانہ رویے کے باعث اس کو اپنی صف میں دیکھنا نہیں چاہتی ہیں۔ خاص طور پر ڈریڈا نے جس انداز سے عورت کی جسامت کی تضحیک کی ہے اس نے بہت سی خواتین کو ناراض کر دیا ہے لیکن میری ذاتی رائے ہے کہ اس میں ڈریڈا کی غلطی کم اور فیمنسٹوں کی غلطی زیادہ ہے کیونکہ جس طرح انہوں نے عورت کے جسم کو بہت متحرک بہت اہم اور غیر مرئی اور غیر انسانی انداز میں بیان کیا ہے اس کو دیکھ کر تو میں بھی جھنجھلائی اسی طرح کم از کم ان کے بیانات کی میں بھی تضحیک کی کرتی۔ غالباً اس تنگی کی وجہ سے Denis Riley نے Feminism and Category of Women in History اور جین ناگین نے ڈریڈا اور اس کے تابعین پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ویرانی تعمیر کا نظریہ فیمنزم کے بالکل خلاف ہے ویرانی تعمیر کا نظریہ ہر چیز کو اپنے دائرے میں لے کر دیمک لگا دیتا ہے اور پھر اس چیز یا شے کا اپنا وجود بے وقعت ہو جاتا ہے دوسری خواتین نے بھی ویرانی تعمیر کے بارے میں اعتراضات کیے ہیں ان اعتراضات کی تین بڑی وجوہات ہیں۔

(۱) اس فلسفہ کے حامیان کی کھوپڑی میں عورتوں اور مردوں کے بنیادی فرق اور اختلاف کی حقیقت گھر نہیں پاتی۔ وہ لوگ نسائیت کا انجام چاہتے ہیں۔

(۲) یہ فلسفہ جنسی انفرادی اختلاف کو اہمیت نہیں دیتا۔

(۳) حیات و ممات ہر چیز کو ہر پہلو کو کھل کر اور نچوڑ کر "زبان" بنا ڈالا ہے اور کسی قسم کے سیاسی موقف، سیاسی فکر و عمل کا موقع فراہم نہیں کرتا۔ ان کے پاس سیاسی لائحہ عمل نہیں۔

ڈریڈا کے فیمنزم میں دلچسپی لینے سے اور اس کے مضمون Women in Behive میں جو خواتین طالبات کی اور فیمنزم کی حمایت میں لکھا تھا لیکن اس کے مضمون "سپلٹنے کا طرز" جس کا باربرا ہارلو نے ترجمہ کیا ہے انگریزی میں اس سے "ویرانی تعمیر" اور نسائیت کے فلسفے میں بعد المشرقین نہ سہی بُعد ضرور ہے جبکہ باربرا ہارلو نے لہجے کو نرم کرنے کی کوشش کی ہے یہ سچ ہے کہ ڈریڈا جیسے مربیانہ انداز میں فیمنسٹ تحریک کو لیتا ہے جیسے یہ ایک غیر

ضروری غیر اہم جدوجہد ہے اور تھی۔ اگر بہت سی فیمنسٹ اس سے خفا ہیں تو حرج نہیں آخر یہ شخص ادب میں اپنی داداگیری کیوں جتاتا ہے۔ ایسی تحریک جس میں آدمی نسائیت پونی صدی اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرتی رہی وہ ایسی بھی بے قیمت نہیں کہ ژریڈا صاحب اسے مجذوب کی بڑ کہہ کر اپنے دائرہ عمل اور کارکردگی سے خارج کر دیں۔ نسائی تحریک کا "ویرانی تعبیر" کے بارے میں سردمہری کا رویہ ہے لیکن دونوں طرف کے ماہرین کی آرا ہے کہ اس پہ سنجیدگی سے غور کی ضرورت ہے۔ بعض مبصرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان دونوں کے اشتراک اور ملاپ سے ایک مثبت فکر پیدا ہو سکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں تو ایسے نکتے تک پہنچا جا سکتا ہے جہاں مصالحت کے ساتھ جنسی اختلاف و فرق کی بحث کو کارآمد اور نتیجہ خیز بنایا جائے اور دونوں فریق مثبت انداز میں اس مسئلہ پہ مطالعہ اور غور و خوض کریں کہ زبان کا مادہ سے کیا رشتہ ہے؟ اور کیسے زبان کے اظہار کے ذریعے سیاسی عمل کو تحریک دی جا سکتی ہے اور کیسے اس کو فیخوم کے حق میں طاقت کا توازن بڑھایا جا سکتا ہے کیونکہ میرا خیال یہ ہے کہ فیخوم کا سارا زور اس طاقت کا حصول ہے جس کے ذریعے خیال و فکر کو لاگو کیا جا سکتا ہے۔ ۲۰۰۲ء تک بس اسی جگہ پہ معاملات ٹھہر گئے تھے۔ تازہ ترین کوئی نظریہ پہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

"ویرانی تعبیر" کے علاوہ دوسرے فلسفیوں نے بھی عورت کو انسان کے علاوہ مخلوق قرار دیا اور وجہ اس کی جسمانی ساخت بتائی گئی لیکن فیخوم نے بھی کوئی اپنے ساتھ بھلائی نہیں کی جبکہ اظہار کی زبان میں کمزور ہونے کو خوبی کہا گیا (۲) حمق ہونے کو خوبی کہا جانے لگا۔ ہسٹریا کی بیماری بھی خوبی بن گئی۔ خودکشی کا رجحان بھی اچھی خصوصیت گردانی گئی اور پاگل پن متحرک بن گیا۔

جس خصوصیت کو فیخوم اور "ویرانی تعبیر" نے بہت اچھالا وہ یہ نظریہ ہے کہ عورت کا وجود اور شخصیت کا حدود اربعہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اسے اظہار زبان کے اندر قید نہیں کیا جا سکتا اور حرفوں محاوروں اور اصطلاحات میں اسے جکڑا نہیں جا سکتا۔ عورت ناقابل تعین اور ناقابل تعریف ہے اور لفظوں میں ایسی طاقت موجود نہیں جو عورت کی مستقل صورت اور مستقل تعریف بتا سکے۔ بالکل یہی خیال ژریڈا اور اس کے ہمنواؤں کا ہے۔ "ویرانی تعبیر" والے مرد ہیں ان کا یہ خیال سمجھ میں آتا ہے کہ عورتوں کو مردوں کی بہت سی غیر منطقی حرکات بھی سمجھ نہیں آتیں مگر خود فیخوم کا یہ کہنا کہ عورت کا وجود یہ ہے خوبی فریبی نفرت محبت لذت اور بے کلی کے جذبات اور قوتیں غیر مستقل اور ناقابل یقین ہیں میری مشرقی کھوپڑی میں یہ بات نہیں آتی۔ یہاں پہ میرے ساتھ قارئین یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ اگر ایسا ہے تو شاعری، افسانہ نگاری، ناول نویسی

مصوری موسیقی میں عورتیں کیسے کامیاب ہوئیں اور انہوں نے اس کے ذریعے ابلاغ کیسے حاصل کیا۔ میرا جواب ہے کہ انسانی ناطے سے وہ مردوں سے کردار و عمل، پسند ناپسند، اظہار و عمل میں مختلف ضرور ہیں مگر انسان ہیں بلکہ سائنسی تجربات کے مطابق مرد اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں اور بعض چیزوں میں مرد بہتر صلاحیت رکھتے ہیں اور بعض میں عورتیں۔ اس کی تفصیل اگلے کسی مضمون میں دوں گی۔ عورتوں کو مخلوق کی کس قسم میں رکھا جائے یہ سوال فیخوم کے ساتھ "ویرانی تعبیر" والوں کی جان کا روگ بن گیا اور مفروضوں پہ سوال ترتیب دیئے گئے۔

(۱) عورتوں کے ناقابل تعریف ہونے کا تعلق مابعدالطبیعاتی ہے؟ یا...

(۲) اس کا تعلق سماجی سے ہے۔

ناقابل تعریف ہونے کو اگر اخلاقیات اور مابعدالطبیعات سے نتھی کیا جائے تو نہ فیخوم اس کی طرف لوٹنا چاہتی ہے اور نہ ویرانی تعبیر اس کو تسلیم کرتی ہے کیونکہ زمانہ قدیم ہی نہیں زمانہ وسطیٰ اور ابھی سو سال پہلے تک عورت کی جو تعریف کی گئی جو حیثیت اس کی مقرر کی گئی اور اس کے مکمل ہونے کے لئے جو معیار مقرر کئے اس سے نہ تو فیخوم کی دلچسپی ہے کہ وہ ان اصولوں کو مسترد کر چکی ہیں اور نہ ہی ان کی طرف لوٹنے کا کوئی جواز ہے اس لئے دونوں طرف کے ماہرین اس امید میں ہیں فیخوم اور "ویرانی تعبیر" کے اتصال اور اشتراک سے شاید کوئی ایسا اصول، کلیہ، ضابطہ دریافت ہو جائے جس کو استعمال کر کے عورتوں کو سمجھنے میں اور تجزیہ کرنے میں مدد مل سکے۔

فیخوم کے اس دعوے کہ عورت ذات کی کسی ایک لفظ، محاورہ اور ضرب المثل سے عورت کی نمائندگی ناممکن ہے غیر منقسم صورت میں عورت کا وجود ہمیشہ ناممکن ہے اور یہ عورتوں کی لاتعداد قسمیں ہیں عکس ہیں عکس کی گنتی نہیں کی جا سکتی نہ موضوعی حیثیت سے، نہ معروضی، نہ فاعلی حیثیت سے نہ مفعولی حیثیت سے جبکہ فیخوم کا سارا زور اس بات پہ ہے کہ عورت کو فاعلی حیثیت حاصل ہو۔ اس بیان پہ ژریڈا نے لکھا "اگر عورتوں کو فاعل اور خودمختار ہونے کا مقصد حاصل بھی ہو جائے تو اس کا مطلب آزادی نہیں۔ فاعلی حیثیت سے صرف امید بندھتی ہے کہ خودمختاری اور طاقت حاصل ہو گی مگر عورتیں اس وقت تک فاعلی حیثیت کر ہی نہیں سکتیں جب تک کہ ان کا حدود اربعہ متعین ہو ان کی واضح تعریف اور تعارف ہو وہ قابل شمار ہو کر نمائندگی حاصل کر لیں۔"

ژریڈا کا یہ بھی خیال ہے کہ عورت کی ایسی تعریف و تعارف موجود ہونا ضروری ہے جس کے ذریعہ تضادات اور تفریق واضح ہو کر سامنے آئیں۔ مابعدالطبیعاتی طریقے سے جو کچھ عورت ذات ہے وہ زبان کا سوال نہیں جو وہم قیاس خیال اور غیر مرئی ہے بلکہ مادہ کا سوال ہے جسم جو مادی ہے حقیقت میں دونوں کا سوال ہے جسم اور روح دونوں کا۔ یہاں قارئین رک کر سوچیں

گناہوں میں بھی یہی سوچ رہی ہوں کہ مرد جسم اور روح کے علاوہ کیا ہیں اور جس عورت پہ یہاں مغرب میں اتنی بحث جاری ہے ہم سے کیوں پوشیدہ ہے۔

بٹلر اور Arigaray دونوں نے اس مادہ اور روح کی بحث پہ کتابیں لکھ ڈالیں۔ عورت کیا ہے جسم یا روح؟ زبان میں تذکیر و تانیث کیونکر پیدا ہوئی یہ فرق کب اور کیسے پیدا ہوا؟ (مجھے معلوم نہیں کہ فارسی میں مونث صیغہ ہی نہیں) مونث اور مذکر کی ایجاد کے پس منظر میں کون سے تاریخی عوامل کارفرما ہیں؟

مادی طور پر عورت کے بارے میں جو اصول بیان اور کلیات بیان ہوئے اس کے زیرِ سطح جو ایک لہر محسوس ہوتی ہے اور جس میں عورت کو واضح طور پر کمتر مخلوق اور مرد کو بہتر مخلوق کہا گیا فحروم کو چاہیے کہ اس کی طرف توجہ دیں مرد اور عورت کا مادی عنصر اور روحانی دونوں ایک ہیں۔ ہماری "ویرانی تحریر" پہ ہو کہ زبان کی اصطلاحات میں مادیت کے دہرے معیار کو توڑ پھوڑ کر نئے اصول وضع کیے جائیں۔ جوڈتھ بٹلر نے اپنی کتاب Feminism and Subversion of Identity میں یہ مشورہ دیا ہے۔ یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے میں نے اپنے الفاظ میں مختصراً لکھا ہے۔

Luce Arigaray بھی "ویرانی تحریر" کے نظریے کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتی لیکن اسے ایک دم خارج از امکان بھی نہیں سمجھتی۔ وہ اظہار کے لئے زبان کے نئے طریقوں کے استعمال کا مشورہ دیتی ہے کہ وہ کہتی ہے کہ عورت کے ناقابلِ بیان جذبوں کے ابلاغ کے لئے نئے پیمانے، نئے زاویے، نئے قالب تلاش کرنا چاہیے۔ کیونکہ پدری نظام کی اخلاقیات کے باعث عورت اپنی لذتوں کے بیان کے اظہار سے قاصر رہی ہے۔

یہاں پھر میرے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مرد اپنی ہر لذت بعینہٖ بیان کرنے پہ قدرت رکھتے ہیں؟ میں سمجھتی ہوں لذت، لذت ہے خواہ انہیں اشاروں کنایوں اور تشبیہات کے پردوں میں بیان کیا جائے یا حرف حرف کہا جائے لذت کا احساس مابعد الطبیعیاتی ہے زبان کے اظہار سے ہم اس لئے سمجھ لیتے ہیں کہ وہ انسانوں کے درمیان ابلاغ کا بہترین ذریعہ ہے اور ہم انسانیت کے اشتراک سے اور زبان کے ابلاغ سے سمجھ جاتے ہیں کہ جنس کی بھوک میں تسکین کا احساس کیسا ہوتا ہے؟ اشتہا انگیزی کیا چیز ہے؟ کہ اور گرمی میں دھوپ کے سفر اور پیاس کے بعد ٹھنڈے پانی سے کیسے تسکین ہوتی ہے جتنی قسم کی انسانی ضرورتیں ہیں اتنی قسم کی لذتیں ہیں اس میں مرد عورت کا کوئی فرق نہیں ہاں طلب اور تسکین کے کوائف میں اور شدت میں فرق ہو سکتا ہے میرے خیال کی ہر دو حضرات تائید کریں گے اب اس موضوع پہ کہ عورت لذت کیسے حاصل کرتی ہے Luce Arigaray کیا کہتی ہے؟

عورت ایسی ذات ایسی جنس نہیں جس میں اکائی ہو وہ ایسا وجود نہیں جو ایک جز و میں مقید ہو اس کی لذت کی حد میں کثرت ہوتی ہے جو ایک ساتھ جسم کے کئی حصوں میں نمودار ہوتی ہے عورت جسم کے کسی ایک حصے تک لذت کے لئے محدود نہیں اس کی لذت اس کے جذبے اس کا جسم اور احساس۔ ناقابلِ بیان، ناقابلِ تعریف، غیر مستقل اور ناقابلِ شمار ہے۔ یہ میرا بھی ترجمہ نہیں ہے اختصار سے میں نے اپنے الفاظ میں خیالات لکھے ہیں۔

ایک جگہ لکھا ہے عورت پانی کی لہر ہے اور عکس ہے جبکہ Helene Cixousep کہتی ہے کہ "عورت کے جسم کے بارے میں لکھا کمال ہے وہ جسم کے آر پار اور جسم سے لکھتی ہے کہ جسم کے بارے میں بس لکھ دیا۔" Newly Born Women

Ingaray اور ڈریڈا دونوں اس بات پہ متفق ہوتے بھی نظر آتے ہیں کہ زبان اور مادے ایک دوسرے سے مشروط ہیں اور ایک کے بغیر دوسرے کے وجود کا امکان ناممکن ہے۔ بٹلر کہتی ہے "مادے اور زبان نہ تو ہم وجود ہیں نہ ہم شکل ہیں نہ ہی بالکل مختلف (اور بے ربط و بے تعلق)۔ مادے کے حوالے سے جب بھی کوئی بات کی جاتی ہے تو زبان سے ادا ہوتی ہے اور اس کا ابلاغ کیا جاتا ہے جب زبان نشان دہی کے عمل سے گزرتی ہے تو اپنے اظہار اور وجود دونوں میں مادی ہی ہوتی ہے یوں زبان ایک مادی شے ہے مادی چیزوں کا ہی بیان کرتی ہے اور جس مادی چیز کا وہ بیان کرتی ہے وہ الفاظ و زبان کی گرفت سے نکل نہیں سکتی۔ انسانوں کے درمیان ربط اور اظہار کا ذریعہ بھی ہے اور تحریر میں آ کر مستقل بھی ہو جاتی ہے۔ مصرین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر عورتوں کی مابعد الطبیعیاتی اور روحانی دونوں لحاظ سے تعریف و شناخت نہیں کی جا سکتی اور اس کو زبان میں قید نہیں کیا جا سکتا اور ان کا شمار اور عدد بھی ناممکن ہے تو پھر منطقی حیثیت سے بحث کو آگے بڑھانا ناممکن ہے۔ ہاں "ویرانی تحریر" والے انہیں شاید Delerral کے لئے کوئی انقلابی حوالہ ضرور دے سکتے ہیں یا "ویرانی تحریر" کے بعد کوئی ضابطہ خود ہی دریافت کیا جائے گا۔

ویرانی تحریر کے فلسفہ اور ژاک ڈریڈا کی مطابقت میں فحروم نے اپنی رائے بدلی اور اعلان کیا کہ جب تک خواتین اپنی خوبیاں اور خصوصیات کھوتی رہیں گی ان کے مستقل وجود کی حیثیت متعین نہیں ہو سکتی کیونکہ ہر دفعہ کسی دوسری قوم کی عورت کوئی نئی خصوصیت سامنے لے کر آ جائے گی۔ جوڈتھ بٹلر نے لکھا "ہمیں یہ فرض نہیں کر لینا چاہیے کہ عورت ایک واحد شے ہے جس میں مختلف نسلیں، مختلف رنگیں، مختلف طبقوں مختلف عادتوں کا مرکب بھر دیا جائے کہ اس کا وجود مکمل ہو جائے۔ اس کا مطلب مستقل تبدیلی مستقل بحث.... جو کہ اب نتیجہ خیز انداز میں ختم ہونی چاہیے یعنی پرانے خیال سے دستبردار ہوں جو کین سکاٹ نے مشورہ دیا کہ ہمیں پھر سے اپنے خیالات کا جائزہ لینا چاہیے اور تاریخی حقائق کے پس منظر میں جنسی فرق کو "ویرانی تحریر" کے

عمل سے گزار کر نئی تعبیر کے لئے راہ ہموار کرنی چاہئے اور پھر سیاسی اور معاشرتی مساوات کی طرف قدم بڑھانا چاہئے جس کے ساتھ طبقاتی نسلی اور مذہبی عدم مساوات کو بھی دائرہ عمل اور منشور میں شامل کرنا چاہئے ماضی میں فیمنزم نے بتایا تھا کہ تذکیر و تانیث اور جنسی عمل میں فرق ہے ثقافتی لحاظ سے جنس سے مراد عورت اور مرد لیا جاتا ہے اور یہ کہ وہ کیسے اپنے اپنے فرائض پورے کر رہے ہیں۔ ٹریسا ڈی لارٹیز Tresa DeLaurities نے اس پہ نئے زاویے سے روشنی ڈالی کہ "ویرانی تعبیر" کے ذریعہ عمل کر کے بتایا جانا چاہئے کہ جنسی عمل اور مذکر مونث کوئی خیالی ساخت نہیں ہیں نہ ہی جسمانی وجوہ سے متعین ہونے والی چیز ہے مذکر مونث زیادہ کی اصطلاح جسم کی ملکیت نہیں ہے یعنی ایسی شے جو پہلے سے جسم میں موجود تھی بلکہ اس کا وجود میں آنا بہت ہی معاشرتی اور مشقی عمل کا مرہون منت ہے اور مرد اور عورت کے معاملہ میں معنوں کا اعادہ اور الفاظ جو تضاد اور اختلاف کی نشو ونما اور پرورش کرتی ہے وہ نیا نئی معاشرتوں اور تہذیبوں سے سفر کرتے ہیں۔

ٹریسا کے خیال میں فیمنزم اور "شکست تعبیر" کے ملاپ کی حد یہاں یعنی تذکیر و تانیث پہ ختم ہو جاتی ہے کیونکہ تذکیر و تانیث کے مسئلے سے دامن بچانا اور جان چھڑانا ہے تذکیر و تانیث اور جنسی عمل میں فرق sex and gender میں بتایا گیا ہے۔ وہ کہتی ہیں sex جنسی عمل کا تعلق اجسام سے ہے۔ ایک قدرتی شے ہے جس کی بنا پہ تذکیر و تانیث کا نظام قائم ہوا ہے۔

جنس عمل ہے اور تذکیر و تانیث فرق عمل یا اختلاف عمل اور اختلاف نتائج کو ظاہر کرتے ہیں فرق۔ عورت حاملہ ہوتی ہے مرد نہیں۔ اس سارے قصے میں دونوں ایک دوسرے کی ویرانی تعبیر یا شکست تعبیر کرتے رہتے ہیں۔ اس سے ایک ڈھانچہ بنتا ہے اسی لئے اسے فطری عمل کہتے ہیں یہ ایک ساختہ عمل ہے۔ اب یہ سوال ذہن میں آتا ہے کیسے مذکر مونث اور جنسی عمل کا جو آپس میں تعلق وہ کیسے خود شکستگی یا خود ویرانی تعبیر کے عمل سے دوچار ہوتے ہیں جبکہ اسی وقت وہ تقریباً جنسی فرق کے عام اصطلاحوں کے اندر کام کر رہے ہیں۔ اور تذکیر و تانیث کا استعمال کرتے ہیں۔ Drycilla نے اس پہ یوں رائے زنی کی ہے کہ ہمیں اپنے نہاں خانہ دل اور ذہن سے جنسی فرق یعنی جسمانی ساخت اور ساخت کے مطابق عمل کے فرق کو اور اس کے نتائج کو دل سے نکال دینا چاہئے اور ظاہر ہے نہیں۔

وہ اس چیز کو خوشدلی سے تسلیم کر لیتی ہے کہ ویرانی تعبیر نے جو بہت اہم خیال ہمیں دیا وہ یہ ہے کہ وہ اس نقطے سے آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے کہ جنسی پہچان صرف دو جنسی حیثیت سے ہی ہو سکتی ہے یا یہ اجتماع ضدین ہے۔

اس پہ ذریڈا نے تبصرہ کیا کہ یہ جنسی پہچان کی بنیاد پہ اٹھائی جانے والی سیاست عموماً مختلف انفرادی فرق کو نظر انداز کر دیتی ہے جبکہ فرق کو دیکھنا اور جاننا نسائیت کے لئے بہت اہم ہے۔

مبصرین نے ذوسیلا کے خیال کو خیالی جنت سے تعبیر کیا لیکن ذوسیلا اس اعتراض پہ خفا نہیں ہوئی کیونکہ اس کے خیال میں فیمنزم کو خیالی جنت کی ہی ضرورت ہے۔

نظریاتی فلسفہ، نظریاتی عورت، نظریاتی مثال اور تو اور نظریاتی 'ویرانی تعبیر' کا فلسفہ بھی اگر خیالی جنت ہی آج ضرورت ہے تو پھر..... میرا اعتراض اور سوال یہ ہے کہ پھر سینڈریلا کی کہانی اور دور میں کیا برائی تھی...؟ وہ بھی خیالی یہ بھی خیالی۔

ذوسیلا ذریڈا پہ اعتراض جڑ دیتی ہے کہ ذریڈا خیالی جنت بناتے ہیں لیکن وہ جو دنیا بناتے ہیں وہ آج کے دور کی نہیں ہے کیونکہ ذریڈا بہت واضح طور پہ صرف اس عمل کو جنسی قرار دیتا ہے جس میں حقیقی ایک مرد ایک عورت ہو اور یہی اس کی شناخت ہے جب کہ بقول ذوسیلا کے جنسی عمل کے اور بہت سے طریقے ہیں ہم جنسی کے علاوہ عربوں میں بکری کے ساتھ بھی جنسی عمل بہت مقبول ہے واللہ اعلم۔

تذکیر و تانیث اور جنس یعنی جنسی فعل کی صحیح تفریق پہ ایک انتہا پسندانہ سوال اٹھتا ہے کہ زبان کے متبادل مادے پہ کیسے غور کیا جائے؟

ذریڈا بحث شروع ہی نہیں سے کرتا ہے کہ عورت کے جسم کے بارے میں جو فضول مبالغہ آمیز لفاظی کی گئی ہے یہ خیال مسترد کئے جانے کے لائق ہے اسی طرح عورت کے کنوارپنے اور فطری زندگی کی رو سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے عورت کا کنوارپن اس کا ہونا نہ ہونا علم الاجسام کے بیان میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور اگر وہ ہے یا ختم ہو چکا ہے اور ختم ہو جاتا ہے خواہ کیسے اور کب ہو اس سے کسی عورت کی مادی شخصیت اور اہمیت پہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جسم پیچیدہ ہوتا ہے اپنی شکل آپ ہے اس پہ اثر پڑتا ہے وہ اثر ڈالتا بھی ہے۔

فیمنزم نے عورتوں کے جسم کے بارے میں جو لفاظی کی ہے اس کا بھی مذاق اڑایا گیا اور روح کے جسم کے ناطے پہ بھی اعتراضات ہوئے اور مابعد الطبیعیاتی حیثیت سے بھی وہ کوئی معقول دلیل نہ دے سکیں اس لئے "ویران تعبیر" کی ماننے والی مخصوص خواتین نے اعلان کیا کہ عورتیں مابعد الطبیعیاتی ختم نہیں بلکہ سیاسی گروہ ہے۔ یہاں بھی ایک مشکل پیدا ہو گئی "ویرانی تعبیر" کے فلسفہ میں سیاست کی جڑیں عوام میں نہیں ہے جو اپنے فیصلے خود کریں بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر سوچ بچار کرنا چاہتا ہے کہ منتخب عوام کے عمل سیاست کے کیا معنی ہوں گے عورتیں دوٹوک فیصلے نہیں کر سکیں۔

اس کا تعلق خاص طور پر اس سیاست سے ہے جو عورتوں کے

خصوصی حقوق حاصل کرنا چاہتی ہے "ویرانی تعبیر" والے کہتے ہیں کہ حقوق پہ مبنی سیاست حقوق کو بیان نہیں کرتی اس کی تعریف نہیں کرتی حقوق ان عوام کو پیدا کرتے ہیں جو انہیں سنبھال سکیں سیاسی بندے اپنی کارگزاری دکھانے والے نمونہ عارضی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے ژرویلا اس سوال سے دامن بچانے کے لئے Equal Rights کے بجائے equivalent کا لفظ استعمال کرتی ہے (۱) مکمل مساوات تقریباً 2 ہے ابہام کے "ویرانی تعبیر" کے فلسفہ کا تسلسل سے کچھ مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں جیسے نسائی سیاست کے بارے میں کچھ حدود متعین کی جائیں اور نئے اصولوں اور دائرہ عمل پہ بات چیت ہو کہ سیاست کا انداز بدلا جا سکے اور نسائیت کے نظریہ کو ترک کر کے مرد اور عورت میں فرق کو بنیاد بنا جائے Trinch Minha-La کہتی ہے کہ فرق نسائیت کو ختم نہیں کرتا بلکہ ساتھ ساتھ چلنے والی اصطلاح ہے یہ فرق نہ صرف عورتوں کی مختلف اقسام کی وضاحت کرے گی بلکہ ایک ہی قسم کی عورتوں کے اندر بھی بعض اختلافات اور فرق ایسے ہیں جنہیں ختم کیا جا سکتا ہے نہ مٹایا جا سکتا ہے۔ یہ عورت کے اندر پھیلتی چلی جانے والی شے ہے جو عورت کی حد بندی کرتی ہے اور نہ ختم ہونے والی نسائیت کو ابھارتی ہے۔ اس طرح یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ سیاسی طاقت کا اثبات ہوگا اور تفریق کے تصور کو واضح شکل کے بغیر اس مختلف بیان سے واضح ہوتا ہے "ویرانی تعبیر" اور ابہام دونوں اپنے اپنے خدوخال واضح کرنے اور حدود و قوانین متعین کرنے کے لئے فقط سیاست کو رگید رہے ہیں اور سکالے نیا کرنے و شکل اور بے شکلی کے آزار میں مبتلا ہیں۔

نسائی سیاست اس وقت ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے جب مشاہدہ اور احساس پیدا ہوتا ہے کہ تمام عورتیں ایک جیسے سیاسی مسائل سے دوچار نہیں مختلف طبقے، مختلف قومیں، مختلف رنگوں کی عورتوں کے سیاسی مسئلے ایک جیسے نہیں ہیں نیز وسائل اور مطالبے ایک جیسے ہیں یہاں میں قارئین کو یاد دلانا چاہوں گی کیا بیچ مختلف قوموں مختلف طبقوں مختلف رنگوں کے مردوں کے بھی سیاسی مسائل ایک جیسے نہیں؟ ... میری رائے میں ہیں مگر اس آزار میں مبتلا ہو کر انہیں حاصل کیا ہوا.... شاید پلو کے پیچھے نہ جاؤ کے لئے۔

☆

بے بنیاد باہمی استحکام اور انصاف کی تلاش۔ ژرویلا

"سیاست غیر یقینی غیر مستحکم کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ فیصلہ کن بات نہیں کہی جا رہی بلکہ اس کا مطلب ہے کہ فیصلے کے بعد اقدام کرنا بغیر اپنی ذات کے موجود کا احساس کئے" یہ خیال باربرا جونسن نے ظاہر کیا اور اس کی تشریح یوں کی ہے وہ کہتی ہے کہ جہاں پہ سیاست میں کوئی مسئلہ ناقابل فیصلہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اقدام عمل سے گریز کیا جا رہا ہے یا فیصلہ کرنے سے جان بچائی جا رہی ہے باربرا مثال یوں دیتی ہے کہ تصحیح حمل کے سوال پہ سیاسی قدم اٹھانا ناممکن ہے کیونکہ یہاں لا جا سکتا ہے کہ ناقابل کونسا جزو ہے اس کی ادبی تحریروں میں اس سوال پہ بحث کی گئی ہے رحم مادر میں زندگی کے آغاز کا لمحہ کون سا ہے جب پہلے ماہ میں عورت کو پتہ چلتا ہے یا چند ہفتوں بعد جب بچہ شکل اختیار کر لیتا ہے اس سوال کو پیچیدہ جان بوجھ کر بنا دیا جاتا ہے کیونکہ یہ تصور زبان کا ہے ابلاغ کا ہے جو موت اور زندگی کے سوال کو دھندلا دیتا ہے کہ حد کس کی کہاں ہے یہی دھندلاہٹ وہ نکتہ ہے جس کے بعد قانونی تعریف زندگی کی شروع ہوتی ہے اور خود غیر مستقل شے ہے پھر اس کے بعد روحانی اور اخلاقی بحث کی وجہ سے مزید کمزوری پیدا ہوتی ہے اس لئے تصحیح حمل پہ بحث کسی فیصلے اور نتیجے کے بغیر ہی رہ جاتی ہے اور رہ جائے گی۔

واضح رہے کہ "ویرانی تعبیر" یا "شکست تعبیر" جو چاہیں کہیں یہ فلسفہ یہ تو نہیں کہتا کہ ابہام اس نوع کے سوال پہ دوٹوک فیصلہ کرے کیونکہ (دوٹوک تو وہ خود اپنے فلسفے کے بارے میں بھی آج تک نہ کہہ سکے) کہ پھر ناقابل فیصلہ اور تردد بالکل ختم ہو جائے اور تصحیح حمل کی سیاست ختم ہو جائے لیکن ژرویلا ابہام کی ان معنوں میں ضرور حمایت کرتا ہے کہ عورت کو فیصلہ کرنے کا پورا اختیار دیا جانا چاہئے کہ وہ حمل ضائع کروائے یا نہ کروائے اور یہ اس لئے کہ وہ مرد اور عورت کے وجود کے فرق کے نسائی نظریہ کی تعظیم کرتا ہے عورت کے حق میں انتخاب پہ عمل اس لئے ممکن ہے کہ کوئی ایسا عالمی قانون موجود نہیں ہے جس پہ سمجھوتہ ہو چکا ہو کہ عورت کو ضروری ہے کہ حمل ضائع کروائے یا ضروری ہے کہ ایسا نہ کروائے کیونکہ کوئی دو خواتین بھی اس نظریہ پہ ایک رائے نہیں رکھتیں اور شخصیتوں کا یہی فرق ایک اخلاقی فرق بن جاتا ہے کیونکہ کسی کے پاس نئی وجوہ ہوں گی "حق اور مخالفت" کسی کے پاس اخلاقی۔ مندرجہ بالا موضوع پہ بات کرتے ہوئے سیاست کی پھر سے تعریف اور حد مقرر کرنی ہوگی۔ معاشرتی سچائی کے بیان کے طور پہ نہیں بلکہ ایک ایسے عمل کے طور پہ جس کا مقصد سچائی قائم کرنا معاشرہ کے بارے میں اور معاشرے کے اندر۔ معاشرتی انصاف کے طور پہ جو خیالات اور انصاف کا گھر ہے۔ اخلاقیات کا یہاں ذکر معاملہ کو گڑبڑ کرنے والی بات ہوگی کہ معاشرتی ذمہ داری سے دامن بچانے کی کوشش ہو رہی ہے اور ایک ایسے معاشرے کا تصور کرنا ہے جسے شخصیت کی صداقت سے دلچسپی نہیں ہے۔ اگر غور کیا جائے تو سیاسی تنظیم کی حیثیت سے "شکست تعبیر" اور ابہام میں دونوں کے لئے "ناقابل فیصلہ" کا نشان Ethical ہے یہ اخلاقی سوال ناقابل فیصلہ ہو سکتا ہے اور اس پہ دونوں متفق ہیں۔ کوئی بھی معاشرت اور تہذیبی گروہ "انصاف" کو خارج نہیں کر سکتا۔

"ویرانی تعبیر" میں یقین رکھنے والی فیمنسٹ ممکن ہے ایک ایسی سیاست کا نقشہ بنائیں جس کا منشور معاشرتی انصاف ہو لیکن عملی طور پہ تو وہ ایسا کرنے کی سکت رکھتی ہیں نہ ہی اس قابل ہیں واضح طور پہ تشریح کریں کہ کوئی بر انصاف معاشرہ سے ان کی مراد کیا ہے؟ .... بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اسی وجہ سے ایسا کرنا چاہتی بھی نہیں کہ وہ دو ٹوک بیان تیار کر کے لائیں بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے والی بات ہوگی اس لئے گول بیانات پہ اکتفا کیا جاتا ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیمنزم کے حالات بہت سازگار ہیں یعنی "ویرانی تعبیر" سے اشتراک کے باوجود لیکن اس بحث سے یہ حقیقت مسلم ہو گئی ہے کہ فیمنزم کو ابھی اپنی جدوجہد میں بہت دور جانا ہے انصاف کے لئے آگے بڑھنا ہے شاید ابھی راہ میں کئی بھاری پتھر اٹھانے کا کام کرنا ہے۔

"ویرانی تعبیر" کی طالع فیمنسٹ کی سیاست نے مردم شماری کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا اور نہ ہی ان کا کوئی متفقہ منشور ہے مردم شماری میں ہزاروں قسم کی تفریق کا سامنا ہے تمام تفرقات اور اختلافات کی فصل کھڑی ہے اور بیجوں کے نیچے زمین ہموار ہے یہ مبصرین کی آراء ہیں۔

فیمنزم کی تازہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس قسم کی بحث ان لوگوں نے کی ہے اور جو ایک علیحدہ گروہ کی حیثیت سے قیام کرنے کا خواب خوب سے آگے حقیقت تک پہنچا ان کے لئے ممکن نہیں کیونکہ سب سے اہم گروہ کی فرد کی حیثیت سے ایک شناخت ہونا ضروری ہے یہاں ابھی شناخت کا مسئلہ ہی حل نہیں ہو سکا ان کے باہمی اتحاد اور استحکام کی عمارت بے بنیاد ہے کیونکہ اتحاد و استحکام کے لئے اصول و آدرش درکار ہوتے ہیں اور ایسا استحکام بے بنیاد ہے جبکہ فیمنزم کا اتحاد اور باہمی مضبوطی کے ڈھونگ کی عمارت زمین پہ ہی نہیں اس قسم کے اتحاد کو مضبوطی کو اتحاد کہا تو جا سکتا ہے مگر یہ قائم بالذات اور غیر مشروط نہیں ہے اور خواتین جو فیمنسٹ ہیں ان کی Soliderity کی بھی حالت ہے اور ڈزیلا کا ویرانی تعبیر سے ملاپ بھی ایسا ہی ہے اسی حوالے سے ڈاک ڈزیلا نے کہا کہ بعض قسم کی مضبوطی کو جانچنے کے لئے یکجہتی کا تصور اس کے ساتھ شامل نہیں رکھنا چاہئے نہ ہی کوئی باہمی اتحاد مضبوطی قائم بالذات ہے اس میں تاریخ کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے اور اخلاقیت کے غیر فطری پن کو بھی اور ادتی سیاست کا بھی اس میں ایک کردار ہے استحکام کوئی بھی کسی قسم کا ہو اس کا مطلب ناقابل تغیر ہونا نہیں ہے ناقابل تغیر کا مطلب ہی ہے کہ اس کی فطرت میں تغیر تھا ہے اور ہر چیز پہ زوال آتا ہے لایا جا سکتا ہے عورتوں کے باہمی اتحاد کو جو بے بنیاد کی عمارت اور بے جڑ کا درخت ہے اس کی تشریح ڈزیلا یوں کرتا ہے کسی اور گروہ سے سیاسی اتحاد جس کے اخلاقی اصولوں میں قدر مشترک ہو ایسا اتحاد ہمیشہ کے لئے نہیں ہوتا وقتی طور پہ بحالی چارہ ترتیب دے دیا جاتا ہے اس کو اشال بھی نہیں کہیں گے اور نہ ہی اس ملاپ کو اتمام کہیں گے اس ملاپ کو یہ بھی نہیں کہیں گے کہ یہ قدرتی ہے یہی بات عورتوں کی بے بنیاد soliderity کی ہے (باہمی تعاون)۔

یہ عورتوں کی اندرونی خصوصیت سے وجود میں نہیں آیا اسی لئے اس کا نام Groundless Soliderity پڑا ہے اس بے بنیاد استحکام کا فائدہ یہ ہے کہ یہ گروہ نسائی جب چاہے "ویرانی تعبیر" کے اصول کے ذریعہ اس باہمی استحکام کی عمارت کو ویران کر کے نئی عمارت کھڑی کر لیں۔ یہ توڑ پھوڑ اختلافات سے وقوع پذیر ہوگی۔ اختلافات جو فرد اور گروہ کے درمیان نمودار ہوتے ہیں اور جو انسان کے باطن اور دوسرے کے اندر ہوتے ہیں۔ اختلاف فرد اور معاشرہ اور گروہ سب کو کمزور کرتے ہیں۔ کمزور کئے جا سکتے ہیں۔ افراد معاشرہ میں خود مختار نہیں ہوتے وہ صرف اپنے عمل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ بعض اوقات افراد دوسروں کی مروت اپنے فرائض لوگوں کے حقوق کے جال میں پھنس جاتے ہیں اپنے خوارج میں جو کچھ واقع ہوتا ہے اس کا حساب نہیں کیا جا سکتا یہ غیر متوقع بھی ہو سکتا ہے چنانچہ عورتوں کی اس باہمی قوت کا بھی یہی حصہ ہے۔

یہ لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں میں نے مختصراً پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈزیلا کی ویرانی تعبیر اور فیمنزم نے جو مندرجہ بالا تصور پیش کیا ہے "بے بنیاد باہمی استحکام" اور جو اصولوں کے نتیجے میں یہ تصور وجود میں آیا ہے یہ اولین اصولوں کی بنیاد پہ وجود میں نہیں لایا گیا ہے بلکہ سرے سے اصول ہی نہیں ہیں اس لئے کہ عورتوں نے خود کو چوں چوں کا مربہ بنا رکھا ہے اسی لئے ڈزیلا نے ان کی قوت کو بے بنیاد بنا ڈالا کیونکہ ان کی شناخت نہیں ہو سکی ان کی گنتی نہیں ہو سکی۔ وغیرہ وغیرہ مگر یہ بھی خیال کہ ایسی کوئی غیر معمولی زبان ابھی تک دستیاب نہیں جو مردوں اور عورتوں میں اور عورتوں عورتوں میں فرق کی وضاحت کر سکے اس لئے ان کی ڈزیلا کی نامعین فیمنسٹ ایسے بیان دے دیتی ہیں۔ "اخلاقی فیصلوں پہ بھی فیصلے کئے جانے چاہئیں۔ ہم کبھی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے صحیح فیصلہ کیا یا سیاسی طور پہ کیا ہے؟

مبصرین کی رائے یہی ہے کہ "ویرانی تعبیر اور فیمنزم غیر حقیقت اور ماورائی ہونے کے آثار میں مبتلا ہیں ان دونوں کو چاہئے کہ عملی میدان میں اتریں اور سیاسی انداز میں اخلاقی فیصلے کریں دونوں ہی کی بے بنیاد قوت ہے عورتوں کا آپس کا باہمی اتحاد اور عورتوں کا ڈزیلا کا تعلق۔

☆

# اقبال اور ترک

پروفیسر محسن احسان (پشاور)

علامہ اقبال کے ذہنی و فکری ماخذات کا سلسلہ قرآن مجید کے علاوہ بہت سے مشرقی و مغربی فلاسفر تک پھیلا ہوا ہے اسی لئے ان کا یہ کہنا کہ:

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے

درست اور لائق ستائش ہے۔ مرزا عبدالقادر بیدل کے بھی بڑے قائل تھے اور اس دشوار پسند برگزیدہ شاعر کو عقیدت و احترام سے دیکھتے تھے۔ مرزا بیدل کا ایک شعر ہے:

ساحل کر اصل طپیش از جوش تشنگی
دریا بست در کنار و بش تر نمی شود

ترجمہ: دریا کا کنارا جس کی فطرت میں تشنگی رچی بسی ہے اس کی بغل میں ٹھاٹھیں مارتی موجیں بہہ رہی ہیں مگر اس کے ہونٹ پانی کی لذت سے محروم ہیں۔ یہی حال ہم اہل پاکستان کا ہے کہ ہمیں اقبال جیسا عظیم مفکر، تصور پاکستان کا خالق، ملت اسلامیہ کا غم رکھنے والا اور رموز حیات و کائنات سے آگاہ شاعر میسر ہے مگر ہم اس کے افکار، اس کے فلسفے، اس کی عمیق نظر اور اس کے بصیرت افروز کلام سے مکمل طور پر شناسا نہیں ہم باشندگان پاکستان اسے اپنی بے بصری، بدنصیبی، بے توجہی اور کوتاہی کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ اقبال کے ایک بڑے ممدوح ترکی کے مولانا روم تھے جن کے اسرار و رموز سے دنیا باخبر ہے اقبال کی فکر کو جلا بخشتے ہیں۔ مولانا روم کا انتقال ۱۲۷۳ء میں ہوا۔ ان کی مثنوی شعر و معرفت کے ساتھ ساتھ اسرار دین اور علم کلام کا مجموعہ ہے اور اسی لئے کہا گیا کہ:

ہست قرآں در زبان پہلوی

ڈاکٹر خلیل طوق آر نے اقبال اور ترک لکھ کر اردو دنیا کو اقبال کی ترکوں کے ساتھ محبت و یگانگت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ڈاکٹر طوق آر ترکی زبان و ادب کے استاد ہونے کے علاوہ ترکی تہذیب و ثقافت سے بھی بخوبی آشنا ہیں۔ انہوں نے استنبول سے شائع ہونے والے اردو اخبار 'جہان اسلام' کے چند منتخب شمارے سنی یونیورسٹی کے تعاون سے شائع کیے ہیں۔ 'جہان اسلام' کے مدیران یوسف شعوان اور یوسف العربی الہندی تھے اور یہ دونوں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان کے دوستوں میں سے تھے۔ خلیل طوق آر نے کراچی سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'قومی زبان' کے جون ۲۰۰۵ء کے شمارے میں ایک طویل مضمون "اردو زبان/مشکلات و مسائل" کے عنوان سے لکھا ہے جس میں انہوں نے انگریزی زبان کے نظام تعلیم کے مفادات اور مضرات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

'اقبال کے چند نوادر' کے عنوان سے اکبر علی خان کا ایک مضمون ماہ نومبر ۱۹۷۷ء کے شمارے میں ملتا ہے جس میں اقبال کا متروک کلام شامل ہے اس میں ایک غزل کا مطلع ہے جس سے اقبال کی ترکی اور اہل ترکی کے ساتھ محبت کا سراغ ملتا ہے۔ یہ غزل اقبال کے مروجہ کلام میں شامل نہیں ہے لیکن یہ پوری غزل عالم اسلام سے محبت کی تصویر ہے۔

عشق صادق ہے مجھے ترکی و ایران کے ساتھ
دل کے ہمراہ ہے یہ وہ ہے مری جان کے ساتھ
ہند میں دور کی نسبت ہے مرا کو سے مجھے
سلسلہ ملتا ہے اس کا عربستان کے ساتھ
وقعت خاص ہے کابل کی بھی مرے دل میں
رشتہ مذہب کا ہے وابستہ ہر افغان کے ساتھ
جو مسلمان ہے دنیا میں مرا بھائی ہے
میں مسلمان ہوں کہتا ہوں یہ ایمان کے ساتھ
بول بالا رہے اسلام کا دنیا میں سدا
وحدت توحید رسالت کا ہو قرآن کے ساتھ

علامہ اقبال کے دو خطوط مولوی انشاء اللہ خان ایڈیٹر اخبار وطن لاہور کے نام ہیں۔ یہ دونوں خطوط جناب فضل الرحمان نعیمی کو جرا نوالہ کا عطیہ ہیں اور جناب گوہر نوشاہی کی کتاب مطالعہ اقبال کے آخری صفحات میں شامل ہیں۔ یہ چھ اکتوبر ۱۹۰۵ء اور ۲۳ دسمبر ۱۹۰۵ء کو لکھے گئے ہیں۔ جب اقبال بغرض تعلیم انگلستان کو روانہ ہو رہے تھے۔ بمبئی کے قیام میں (جس ہوٹل میں علامہ مقیم تھے اس کا کرایہ تین روپے یومیہ تھا)۔ علامہ اس دن مختلف لوگوں سے ملاقات کا احوال لکھنے کے بعد تحریر کرتے ہیں۔ "ایک شب میں کھانے کے کمرے میں تھا کہ دو جنٹلمین میرے سامنے آبیٹھے۔ شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ یورپین ہیں۔ فرانسیسی میں باتیں کرتے تھے آخر جب کھانا کھا کر اٹھے تو ایک نے کرسی کے نیچے سے اپنی ترکی ٹوپی نکال کر پہنی جس سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ کوئی ترک ہے میری طبیعت بہت خوش ہوئی اور مجھے یہ فکر پیدا ہوئی کہ کس طرح ان سے ملاقات ہو۔ دوسرے روز میں نے خواہ مخواہ باتیں شروع کیں۔ یورپ کی اکثر زبانیں سوائے انگریزی کے جانتا تھا۔ میں نے پوچھا

فارسی جانتے ہو؟ بولا بہت کم۔ پھر میں نے فارسی میں گفتگو شروع کی وہ سمجھتا تھا آخر ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس سے باتیں کیں۔ یہ نوجوان ترکی ینگ پارٹی سے تعلق رکھتا تھا اور سلطان عبدالحمید کا سخت مخالف تھا۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ شاعر بھی ہے۔ میں نے درخواست کی کہ اپنے شعر سناؤ۔ کہنے لگا میں کمال بے (ترکی کا سب سے مشہور شاعر) کا شاگرد ہوں اور اکثر پولیٹیکل معاملات پر لکھا کرتا ہوں۔ کمال بے کے جو اشعار اس نے سنائے وہ سب کے سب عمدہ تھے لیکن جو شعر اپنے سنائے وہ سب کے سب سلطان کی ہجو میں تھے۔ ان میں سے ایک شعر یہاں درج کرتا ہوں۔

ظلم و جودن قو سعو جبہ پر ملکی مجۂ ابلیلین
آدمیت ملک و ملت دشمن عبدالحمید

یعنی کہ یہ ظلم و جور نے تمام قوم کو ستا دیا ہے عبدالحمید آدمیت اور ملک و قوم سب کا دشمن ہے۔

اسی خط میں اقبال آگے لکھتے ہیں کہ ینگ پارٹی کے اس نوجوان سے آگے بہت گفتگو ہوئی اور میں نے اُسے بتایا کہ ینگ پارٹی کو انگلستان کی تاریخ سے فائدہ اٹھانا چاہیے کیونکہ جس طریق سے رعایائے انگلستان نے بتدریج اپنے بادشاہوں سے پولیٹیکل حقوق حاصل کیے ہیں وہ طریق سب سے عمدہ ہے۔ بڑے بڑے عظیم الشان انقلابوں کا بغیر کشت و خون کے ہو جانا یہ کچھ خاک انگلستان ہی کا حصہ ہے۔ ایک روز سرِ شام میں اور یہ ترک جنٹلمین بمبئی کا اسلامیہ مدرسہ دیکھنے چلے گئے۔ وہاں سکول کے گراؤنڈ میں مسلمان طلبا کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ہم نے ان میں سے ایک کو بلایا اور سکول کے متعلق بہت سی باتیں اس سے دریافت کیں۔ میں نے اس طالب علم سے پوچھا کہ انجمن اس سکول کو کالج کیوں نہیں بنا دیتی کیا فنڈ نہیں ہے یا اور کوئی وجہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ فنڈ تو موجود ہے اور اگر ضرورت پڑے تو ایک آن میں موجود ہو سکتا ہے۔ خدا کے فضل سے یہاں بڑے بڑے متمول مسلمان سوداگر موجود ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ مسلمان طلبا پڑھنے کے لیے نہیں آتے۔ اس کے علاوہ اور اچھے اچھے کالج بمبئی میں موجود ہیں جیسی تعلیم ان میں ہوتی ہے ویسی تعلیم سردست ہم یہاں دے بھی نہیں سکتے۔

اس طویل خط کے اقتباس سے ترک قوم اور ترکی مزاج و تمدن سے اقبال ابتدا ہی میں آشنا ہو گئے تھے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ترکوں کی ثقافتی اور سیاسی کامیابیوں میں کمال اتاترک کا اہم کردار رہا ہے۔ علامہ نے جولائی ۱۹۲۳ء میں پیامِ مشرق میں فارسی نظم خطاب بہ مصطفےٰ کمال پاشا لکھ کر ترکوں کے ساتھ جذباتی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں:

اے چو گل ما از اثر حکمت او
واقف از سرِ نہاں خانۂ تقدیر شدیم

اصل ما یک شرر باختہ رنگے بود است
نظرے کرد کہ خورشید جہانگیر شدیم
نکتۂ عشق فروشست ز دل پیر حرم
در جہاں خوار باندازۂ تقصیر شدیم
باد صحراست کہ با فطرت ما در سازد
از نفسہائے صبا غنچۂ دلگیر شدیم
اے بسا صید کہ بے دام بفتراک زدیم
در بغل تیر و کمان کشتۂ نخچیر شدیم
ہر کجا راہ دہد اسپ برآں تاز کہ ما
بارہا مات دریں عرصہ بہ تدبیر شدیم

علامہ کی اتاترک اور اہل ترکی کے ساتھ یہ قلبی اور جذباتی وابستگی ان کے اسلامی جذبے کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

ترکی میں اقبال شناسی کے سلسلے میں جن شیدائیانِ اقبال نے کام کیا ان میں محمد عاکف ارصوئے، پروفیسر ڈاکٹر علی نہاد تارلان، ڈاکٹر عبدالقادر قرہ خان، پروفیسر ڈاکٹر علی گنجلی، ڈاکٹر این میری شمل، ڈاکٹر حسین پروین احمد تمکن، شاہین یوسف صالح، قرہ جاہ صوفی حوری اور ڈاکٹر احمد امرار کے علاوہ بہت سے دیگر نام بھی شامل ہیں۔

ترکی میں مختلف رسائل میں اشاعت پذیر ہونے والے اقبال کے بارے میں مضامین بھی بڑی دقتِ نظر سے لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبا کے مقالات بھی خصوصی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان ہی طلبا نے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے اقبال کی زندگی، شاعرانہ بصیرت اور فکری ارتقا کا جائزہ لیا ہے۔

میں ڈاکٹر خلیل طوق آر کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے اقبال اور ترک لکھ کر اہل علم و دانش کو اقبال کی فکر سے آگاہی حاصل کرنے کا ایک نیا اور تازہ راستہ دکھایا ہے:

جلالِ تو کہ در دل جز آرزو نہ دارم
بجز ایں دعا کہ بخشی بہ کبوتراں عقابے

حال ہی میں صدر پاکستان اور ترکی کے وزیر اعظم نے دو طرفہ تعلقات بڑھانے اور علاقائی عالمی صورتحال پر تبادلۂ خیال کیا۔ زلزلے کے دوران پاکستان کی امداد کرنے والوں میں سب سے پہلا ملک ترکی تھا اور پورے علاقے میں وہ تعمیر ترقی کے کاموں میں امداد دے رہا ہے۔ ان دونوں کی دوستی پھل پھول رہی ہے۔ دونوں ملکوں کے عوام کے دلوں کی دھڑکنیں ایک ساتھ ہیں۔

زندہ باد ترکی پاکستان دوستی

# سُخن آفتاب

## حریفِ قلم

عبدالعزیز خالد (لاہور)

(۱)

گو اب وہ خرابات نہ وہ ساقی ہے
طرّاری و تیزی نہ وہ برّاقی ہے
تھی عشق کی سینے میں جو آتش نا کی
وہ تو نہیں، لَو اس کی مگر باقی ہے!

(۲)

سمجھو نہ کسی ادیب کو جیتے جی
چپ دیکھ کے، بجھ چکی جو آگ اس میں تھی!
معلوم کیسے سوزِ نہانی سے کب
لَو دے اٹھے کجلائی ہوئی چنگاری؟

(۳)

ہر جسم تو ہوتا نہیں آغوش طلب
سمجھے نہ ہوس کو وہ تمنائے طرب
ہم کو یہ بتایا ہے بَنی عذرہ نے
ہوتی ہے تعشّق کی بھی اک حدِّ ادب!

(۴)

کیا ذکر کریں روابطِ خوباں کا
شائستہ و شوخ و ظاہر و پنہاں کا
گو بوالہوسی سے رہے بچ کر لیکن
دعویٰ نہیں کرتے پاکیِ داماں کا!

(۵)

لیتی نہیں بیگار کسی سے قدرت
ضائع نہ ہو محسنوں کا حقِّ الخدمت
محنت کش کو دے صلہ وہ محنت کا
محنت کہ جو کی جائے بصدقِ نیّت!

(۶)

یہ بزمِ جہاں یہ عالمِ فکر و نظر
قائم ہے تنوّع پہ اقلّ و اکثر
ہوں کچھ بھی خصائل و عقائد اس کے
ہرگز کسی انسان کی تحقیر نہ کر!

(۷)

کچھ وہ جو زمیں کی پیٹھ پر بھی مُردہ
کچھ وہ جو زمیں کے پیٹ میں بھی زندہ
کچھ پت جھڑ میں بھی شاد مان و خنداں
کچھ فصلِ گُل و لالہ میں بھی پژمُردہ!

(۸)

"سب دکھ ہی دکھ" آوازہ ہے گوتم بدھ کا
نانک کی بھی بانی: "سب جگ دکھیارا!"
یہ دارِ محن اک آزمائش گہ ہے
سکھ بھی ہے یہاں، دکھ ہی نہیں ہے تنہا!

## رباعیات

نامی انصاری (کامٹی، بھارت)

گلشن میں مہکتے ہیں جدھر جاتے ہیں
شعلوں میں گھرے ہوں تو نکھر جاتے ہیں
یہ اہلِ محبت ہیں انہیں کچھ نہ کہو
وقت آنے پہ جاں سے بھی گزر جاتے ہیں

توقیرِ حیات سب ہے اوّل افضل
لاریب زمانے میں نہیں اس کا بدل
کہتے ہیں اسے زندگی دو روزہ
یعنی کہ ہے اک روز ابدؔ ایک ازل

دانائے ازل نے کیا سکھایا تھا تجھے
مخلوق میں اشرف بھی بنایا تھا تجھے
ہابیل نے قابیل کو جب قتل کیا
اس وقت بھی کیا ہوش نہ آیا تھا تجھے؟

تحریرِ سماوات سے لرزاں ہے بشر
آفات کی زد پر ہے زمیں آٹھ پہر
فریاد کرے کس سے پکارے کس کو
اطراف و جوانب میں بپا ہے محشر

شعلہ گلشن میں اب دہکتا ہی نہیں
بلبل باغات میں چہکتا ہی نہیں
افتاد پڑی ہے کیا رندِ خراباتی پر
پیتا ہے مگر پی کے بہکتا ہی نہیں

تاریخ نے پلٹا ہے کوئی اور ورق
ہر سمت سے آتی ہے ہوائے ناحق
مغرب کی غلامی نے دکھائے یہ دن
بازار کی رونق سے ہے گھر کی رونق

## آواز کی آلودگی

انور سدید (لاہور)

مری آواز کی دنیا میں
کتنی دیر سے گھمبیر سناٹا
بلاتا ہے مجھے.... کہتا ہے
آؤ دونوں مل کر
اپنی تنہائی کا غم بانٹیں
مجھے تم دیکھ کر روؤ
تمہیں میں دیکھ کر روؤں
اور ان اشکوں میں
اپنے دہر کی آلودہ آوازوں کو
سارے شور و غل کے زہر کو
اک لمبا گہرا سانس لے کر
آکسیجن میں ڈبو ڈالیں
O

# محبت کا گیت

ڈاکٹر صابر آفاقی (مظفرآباد)

فلک پہلے ہی دشمن تھا
مگر اب تو یہ حالت ہے
نہ دھرتی پیار کرتی ہے
نہ موسم ساتھ دیتا ہے
کبھی بھونچال آتے ہیں
کبھی طوفان اٹھتے ہیں
زمیں ناراض ہے ہم سے
کبھی سردی میں شدت ہے
کبھی موسم میں حدت ہے
سمندر ہیں خفا ہم سے
خفا ہے اب خدا ہم سے
عناصر نے لباسِ اعتدال اب کے اتارا ہے
عناصر کو کہاں انسان کی وحشت گوارا ہے
زمیں ناراض ہے ہم سے
جہاں دیکھو
فقط دہشت ہی دہشت ہے
فقط نفرت ہی نفرت ہے
کہاں سے آئی یہ دہشت؟
ذرا سوچو
کدھر سے آئی یہ نفرت؟
ذرا سوچو
سنو مجھ سے
یہ شعلے تو لبِ واعظ سے لپکے ہیں
یہ شعلے یعنی کھیتی سوز شعلے
جلا کر راکھ کر دیں گے
بھسم کر دیں گے انساں کو
گھروں میں
مسجدوں میں
اور گلی کوچوں میں دہشت ہے
عداوت ہے رذالت ہے
بنامِ دین پھیلاتا ہے
ہر سو دشمنیں واعظ
یہ "نارِ موقدہ" ہے
جو دلِ واعظ پہ لپکی ہے
یہ وہ برقِ ہلاکت ہے
سرِ واعظ پہ کڑکی ہے
اٹھو شعلے بجھائیں ہم
بشر کو اب بچائیں ہم
خدا نے جو محبت دی
اسی کے گیت گائیں ہم
بشر مذہب سے اونچا ہے
یہی ہے مذہبِ یزداں
چلو یہ گیت گائیں ہم
بشر کو اب بچائیں ہم

O

جینت پرمار (احمد آباد، بھارت)

This miseries of man will never end - Van Gogh

## دُکھ کی کالی چڑیا

(وان گاگ کے لیے)

تیری کہانی.....
آنکھ
برش یا
پیلٹ کی صرف کہانی نہیں
لیکن اک ایسے تنہا
دل کی درد آشوب کہانی ہے
جو گھرے اندھکار کی
قید گاہ میں دھڑک رہا تھا
اور اس کو معلوم نہیں کیوں
دکھ کی اک کالی چڑیا
چہرے پر اڑتی رہتی ہے
جنم جنم سے!!

Palette

## مکئی کا کھیت اور کوّے

مکئی کے پیلے کھیت کے سر پہ
موت کی مانند
منڈراتے ہیں کالے کوّے
آسمان بھر کالے کوّے
تھوڑی دیر کے بعد
اٹھالے جاتے ہیں
دبا کے اپنے کالے پروں میں
وان گاگ کو
پیلے پیلے آسمان کو قبر کی اور!

O

Crows Over Corn Fields

اس تصویر کے بنانے کے بعد وان گاگ نے خودکشی کر لی تھی
پیارے!

## سوریہ مکھی

بہت ہی پیارے وان گاگ
ہم سے جدا ہو کر یونہی
تم تو ساتویں آسمان پر
جا بیٹھے ہو
اور یہاں پر
تمہاری قبر کی چاروں اور
پھول کھلے ہیں
سوریہ مکھی کے
کینواس پر تم نے بنائے تھے جن کو
بالکل ویسے

آنکھوں پر
سوریہ مکھی کے پھول
فاتحہ پڑھتے ہیں!

## لچیلی یہ گھڑیاں

ملائم و تنہا
لچیلی یہ گھڑیاں
بے صوت و صدا
پیڑ کی سبز ٹہنی پہ رکھی ہیں
سوکھنے کے لیے
گیلے کپڑوں کی مانند

ان کے اندر
وقت کو کاٹنے کی طرح کھا رہے
کالے کیڑے مکوڑے
دور پیلے پہاڑوں پہ جامد سمئے
پاس میں ہی پڑا
مونچھ والا کوئی جانور
وقت کی سوئی کے تیز دانت
ناخن خوف خیمہ خلاء
بے ستوں آسماں سے کہیں بے خبر!

مشہور پینٹر سالوور ڈالی (1904) کی Persistence of Memory (1931) سے متاثر ہو کر۔

## ھمکلامی

تنہائی پسند اسی سالہ بزرگ سے

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ (دہلی بھارت)

عمر کا تقاضہ ہے، کہ آپ نہ رہیں تنہا،
آتی جاتی سانس پر کیسا بھروسہ، کیا پتہ

بالائی منزل خالی ہے،جس طرح جی چاہے رہو!
ایک خاتون دوست نے، دبی زبان میں کہا

آپ کے ہی خواہ ہیں، کیوں یہ سمجھتے نہیں
دل رکھنے کے لیے کیوں بات مانتے نہیں

کھٹکا رہتا ہے جو ہمیں کچھ اُس پر غور کرو
دیرینہ تعلق کا کیوں لحاظ کرتے نہیں

دل ہی رکھنے کے لیے، یار میرے پاس رہو
تنہا رہنے کی اس طرح یار نہ ضد کرو

اشکبار آنکھوں سے کہہ رہا ہوں بار بار
تشنگی میری بجھاؤ، اور میرے پاس رہو

دوستو! یہ واہمۂ جلوت و خلوت ہے کیا
خاک ہوا ہے مقدر، اس میں اندیشہ ہے کیا

O

## قطعات

خیال آفاقی

اب اور کوئی بُت نہ اے نادان تراشو!
اے سنگ تراشو، نیا سامان تراشو!
اب تک تو خداؤں کو تراشا ہے مگر اب
پتھر کے خداؤں میں سے انسان تراشو!

میں ہوں اہل دل، مجھے اہل دول سے کیا غرض
میری سرمستی کی مجھ کو داد جائز دیجئے
میرا نعرہ ہے محبت، پیار انسانوں سے پیار
میرے دل کو امن کا نوبل پرائز دیجئے

کیا طرفہ تماشا ہے اپنائے شکم ہو کر
ہر بات میں کہتے ہیں ہم لوگ کہ ہم اچھے
اپنوں سے نہیں لڑتے، غیروں پہ نہیں مرتے
مشرق کے خداؤں سے مغرب کے صنم اچھے

برقی نظام لاکھ ڈراتا رہا مگر
لکھنے کا میں نے وقت وہی شام کا رکھا
کس منہ سے وہ چراغ بجھاؤں کہ دیر تک
بجلی کے بعد جس نے مجھے کام کا رکھا

O

## ۱۲ مئی ۲۰۰۷ء کی ریلیاں

کراچی خون میں ڈوبا ہوا تھا اسلام آباد جلسہ عام میں ڈھول پر خوشیوں کا اظہار ہو رہا تھا

ماجد سرحدی (پشاور)

اپنے یارو پہ پیلی خوب ہے
اک ارب میں ایک ریلی خوب ہے

وہ بسوں میں گھر سے لدوائے گئے
ریوڑوں کی شکل میں لائے گئے
اُن کو کچھ خطابات سنوائے گئے
پھر بھی وہ انسان کہلائے گئے

یہ مسافر کس قدر مجبور تھے
چودھری صاحب مگر مغرور تھے

اپنی شیشوں کے پیچھے حکمراں
دور سے وہ کر رہے تھے کچھ بیاں

بے خطا کو خوں سے نہلایا گیا
اور وکیلوں پر ستم ڈھایا گیا

نہ کوئی قانون نہ انصاف ہے
ظلم کا اب اک نشاں الطاف ہے

حکمراں آئینہ دیکھا کرو
نازیوں سے کچھ سبق سیکھا کرو

یہ شفق کا رنگ ہے یا انقلاب
جو بھی ہونا ہے خدایا ہو شتاب

اب ابابیلوں کی اک ریلی چلے
تا کہ منحوس رات کا ماجد ڈھلے

نوٹ: سُنا ہے کہ اسلام آباد کے جلسے پر ایک ارب روپے سے زیادہ خرچ آیا۔

## کمی کا احساس

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بہار، بھارت)

گھرے سناٹے میں چاندنی
دھڑکتا ہوا دل بن گئی تھی
لیکن ہزاروں دل
آج ٹوٹ گئے ہیں
لوگ مل کر بچھڑ جاتے ہیں
ایک اجنبی مسافر کی طرح
اور پلکیں نم ہو جاتی ہیں
فضاؤں میں ان گنت گیت بکھر جاتے ہیں
خوابوں کی بستی میں چلتے ہوئے!
اکیسویں صدی کا چاند
اُگ چکا ہے......
مگر تم حیرتوں کے آنسو دے گئے
من سے نکلنے والی زرد کرنوں میں
امنگوں اور ارمانوں کی سرخی
مدھم ہو گئی ہے
پہچان کی دہلیز پر
بیتی گھڑیوں کی کہانیاں ہیں
اور ایک کمی کے احساس سے
بے چین و مضطرب روح ہے!

## نظمیں

خورشید انور رضوی (اسلام آباد)

(۱)

چلو اُس دیس چلتے ہیں
جہاں نیلے سمندر میں
ہوا کے دوش پر چڑھ کر
جواں لہریں
سُریلے گیت گاتی ہیں
خوشی سے گنگناتی ہیں
چلو اُس دیس چلتے ہیں۔

(۲)

یہ کیسا دور آیا ہے
پرندے آشیانوں میں
سکوں کی نیند سے عاری
سدا اِک کپکپی طاری
ہر اک آواز و آہٹ پر
پَروں کو پھڑ پھڑاتے ہیں
بدن کو تھر تھراتے ہیں
کسی موہوم خطرے میں
بسر کرتے ہیں شب اپنی
یہ کیسا دور آیا ہے۔

## مہنگا پڑا مذاق

بھگوان داس اعجاز (دہلی بھارت)

آج کا رتک انسان تھا
میں نہ تیرا جانتا
گہرے پانی میں گئی
لے ہاتھوں میں ہاتھ
ہاں ہاں کرتے ہیں چلو!
آگے چل کر بات!

O

جب لائی وہ ناچنے
کیوں بھائی سر ڈھانپنے
وہ چنچل کل شام کو
لیے ہاتھ میں ہاتھ
لوک لاج کو تیاگ کر
ناچی میرے ساتھ!

O

وہ میری پتنی ہی تھی
دن رکشا بندھن کا تھا
تین بار بھیّا کہا
مہنگا پڑا مذاق
لا کر دلہن دوسری
میں نے دیا طلاق!

O

**پرویز مظفر (برمنگھم)**

### زندگی کے نام

اپنی آنکھ میں
تصویر بسا کر
نکلا تھا نئے خواب سجا کر
کہ
زندگی میں
رنگ بھرا جائے
کچھ کرا جائے
ہنستی ہوئی زندگی
ہر فکر سے دور
بہت جلد بوڑھا کر دیا
زمانے نے
اور عجیب سا رنگ
بھر دیا بالوں میں

O

### ہمارے زمانے کے لوگ

اپنی اچھائیاں
اس کی برائیاں
دونوں اجاگر کرتے رہے
زندگی بھر خود سے لڑتے رہے
ہونا تو
یوں چاہیے تھا
کہ اُس کی اچھائیوں پر
اور اپنی برائیوں پر
نظر رکھتے
اس طرح موقع ملتا ہمیں
اپنے اندر اور باہر اُگنے کا
مگر ایسا کہاں.....

## سراب

**علی آذر (کراچی)**

زمانے نے ستایا تھا بہت ہی
تم آئے تو مری اُمید جاگی....
کہ اب سیراب ہوگی تشنۂ اُلفت
کہ اب گلزارِ دل کا کھل اُٹھے گا
میں زانو پر تمہارے سر کو رکھے
کسی بچے کی مانند سو رہوں گا
تمہاری زلفوں میں چہرہ چھپا کر
زمانے بھر کی ظلمت سے بچوں گا
مگر معلوم مجھ کو یہ نہیں تھا.....
کہ پوشیدہ ہر اِک رگ میں تمہاری
زمانے کا زہر آلود خوں ہے۔
تمہاری چاہ تھی اونچی حویلی
تمہارا پیار تھا دولت کی دُنیا
اور میں اِک بے خبر دیوانہ شاعر
کبھی سے دُنیا کی بیگانہ شاعر
تمہارے خوشنما پیکر میں ہر دم
محبت کی کہانی ڈھونڈتا تھا
کہ جینا مجھ کو آتا ہی نہیں تھا۔

O

## مرے ہی خواب جھوٹے تھے

فیصل عظیم (کینیڈا)

مرے ہی خواب جھوٹے تھے
مرے وہ خواب آئینہ تھے
اس باطن کا
جس پر جھوٹے رنگوں کے غلافوں سے
میں اپنے آپ کو دھوکے میں رکھتا تھا
مرے ہی خواب جھوٹے تھے
میں ان خوابوں میں اپنے آپ سے نظریں چراتا تھا
زباں کچھ اور کہتی تھی تو دل کو کچھ بتاتا تھا
مرے وہ خواب اندھیرے میں
کسی سائے کے دھوکے سے عبارت تھے
جہاں خود کو چھپاتا تھا
مگر جب روشنی آئی تو وہ ٹوٹے
مرے وہ خواب تھے جھوٹے
جبھی تو روشنی میں مر گئے سارے
مگر وہ مر گئے تو
مجھ پہ میرے عکس روشن کر گئے سارے

O

## زندگی

حفیظ انجم کریم نگری (بھارت)

نغمہ ہے ایک گیت ہے سرگم ہے زندگی
یہ کس نے کہہ دیا کہ تمہیں غم ہے زندگی

پت جھڑ میں پات پات بکھرتی دکھائی دے
ساون میں دیکھئے تو بڑی نم ہے زندگی

خاموشیوں کا دشت اگر موت ہے تو پھر!!
اک شور ہے شرابہ ہے اُدھم ہے زندگی

جس آدمی کے ذہن میں حزن و ملال ہے
اُس آدمی کے حق میں تو ماتم ہے زندگی

اک بار اِس کو پیار سے چھو کر تو دیکھئے!
نازک بدن ہے نرم ہے ریشم ہے زندگی

ہے اپنے اختیار میں جو کچھ بھی مان لیں!!!
امرت ہے یہ کبھی تو کبھی سم ہے زندگی

کر استعمال اپنے ہر اِک لمحہ کا صحیح!!
کرنے بہت ہیں کام بڑی کم ہے زندگی

محنت بغیر جینا جہاں میں محال ہے
بہتر ہے جان لے کے پرشرم ہے زندگی

ہر شخص چاہتا ہے جیوں اور بھی جیوں
اتنی جناب پیاری ہے جانم ہے زندگی

یہ مانگتی ہے اگنی پرکشا بھی مون بھی
سیتا ہے یہ کبھی، کبھی مریم ہے زندگی

اک بار آنکھ موند کے دیکھو تو تم سہی
کتنی حسیں یادوں کا البم ہے زندگی

موت و حیات پر تو اجارہ نہیں مگر
انجم یہ دیکھنا ہے کہاں ضم ہے زندگی

## کاش! ایسا ہوتا

سجاد مرزا (کراچی)

ہمارے ذہنوں میں آج بھی ہے
وہی شمالی قطب کا موسم

ہماری فکریں ہیں سر بریدہ
ہماری سوچیں ہیں پرشکستہ
ہمارے پاؤں میں کوئی جنبش
نہ آنکھ میں روشنی کی دھارا
کہاں پہ آ کر رکا ہوا ہے
یہ ارتقائی سفر ہمارا؟

ہمارے جذبوں کی گرم جوشی
گلیشیر میں ہوئی مبدل
ہماری ہمت جوان ہمت
بھی منجمد ہو کے رہ گئی ہے!

خدائے ارض و سما اِدھر بھی
نظر ہو تیری
تو اپنے سینے کا بحرِ جامد
پگھل سکے کاش!
ایسا ہوتا۔

O

## صدائے بیگانگی کا مراقبہ

پروفیسر زُہیر کنجاہی (راولپنڈی)

میں نہیں لوں گا یہ قبرستاں کی سی زندگی
میں اسے لے کر جیوں گا کس بھروسے پر بتا
مال و دولت تیرے ہر منکر کی جھولی بھرتے ہیں
تیری دولت خون کے پیاسوں کا گویا شاہکار
ابنِ آدم کے لہو سے اُن کے چہروں پر نکھار
بھوک میری میرے لب پر مُسکراتی ہے تو یہ تیرا سماج
قہقہوں کی سر داندھی روشنی
میرے چہرے پر سجاتا ہے سوالوں صبح میں
مَیں اُسے شامِ زمستاں میں سجا کر لوٹ آتا ہوں
دُکھوں کے شہر میں
اُور اِس وعدے پر جیتا ہوں کہ
شاید تُو کبھی
اِک نگاہِ لطف اِدھر بھی ڈال دے
تا کہ یہ میرا وجود
میری نا آسودہ اُمیدوں کا امنگوں کا یہ قبرستان
حسین کتبے سے ہے آراستہ
اِس جگہ آسودۂ خواب گراں ہے ایک شخص
جس کا خون گرم کل تھا
غازۂ روئے حیات
زندگی بھر مل سکی جس کو نہ رنج و کرب پیہم سے نجات!

O

## گنجہائے گرانمایہ

(نظیر۔میر۔آتش۔ذوق۔حالی)

شگفتہ نازلی (لاہور)

آتے ہیں یاد سب کو اکبر آباد کے نظیر
رم جھم کی رُت کبھی جو مہربان ہوتی ہے
ہر رنگ اور رُوپ میں انسان کے لئے
اُن کی ہر ایک نظم تو احسان ہوتی ہے!

اپنے تقی جو میر تھے برگشتہ وہ بھی تھے
کہ خواہ مخواہ ہی تہمت ہے مختاری کی دھری
جو چاہتے سو کرتے ہیں اپنی ہے کیا مجال
بدنام یونہی کرتے ہیں لو! ہم نے کیا کری!

جو بات اپنے کہنے میں وہ غیر میں کہاں
آتش کو پیامبر پہ بھی اشتباہ رہا
جب حل نہ پایا کوئی تو یہ تجربہ ہوا
کیا خوب کہ کسی کا نہیں آسرا رہا!

نالاں تھے ذوق اس لئے بے اختیار ہیں
کم مائیگی پہ رہتا تھا دائم انہیں ملال
جتنا بھی عرصہ دہر میں گزرا اِدھر اُدھر
اِس میں خوشی کے ہونے نہ ہونے کا کیا سوال!

حالی بھی کیسے جینئس تھے اپنے دور کے
چلنا ہمیں اُدھر کو جدھر کی ہوا رہے
کیا بات کام کی ہمیں وہ ہیں سُجھا گئے
تا کہ عمل سے سازگار یہ فضا رہے!

## ماہیے

گلشن کھنہ (یو کے)

یہ دنیا نکھرتی ہے
پیپر سے ہوں لاکھ مگر
خوشبو تو بکھرتی ہے

غم پیتے ہیں ہنس ہنس کے
اس دل کو جلا کر بھی
ہم جیتے ہیں ہنس ہنس کے

آکاش پہ تارے ہیں
تیری محبت میں
ہم دل کو ہارے ہیں

یہ کیسی دُعا مانگوں
درد دیا جس نے
اُس کا ہی بھلا مانگوں

تم خواب میں آیا کرو
کاجل بن کر ہی
آنکھوں میں سمایا کرو

ہے بات بتانے کی
روکے نہیں رُکتی
رفتار زمانے کی

خود کو بہلاتے ہیں
لوگ جلائیں دیے
ہم دل کو جلاتے ہیں

# تخلیقِ عصر

تازہ تصانیف کا تعارف

عطیہ سکندر علی

## نوائے محمود

طب کی پانچ اعلیٰ اسناد، مسلح افواج کے پانچ اعلیٰ اعزازات اور کلاسیکی شاعری کے رنگ و آہنگ اور بلیغ لہجے سے مزین پانچ شعری نسخوں کے خالق لیفٹننٹ جنرل محمود الحسن (ریٹائرڈ) کا چھٹا شعری نسخہ "نوائے محمود" منظر عام پر آ گیا ہے۔ ڈاکٹر محمود الحسن کا شعری سفر چھ دہائیوں پر مشتمل ہے۔ اردو شاعری کے قدیم و جدید مکاتب فکر میں محمود الحسن صاحب کا نام اور مقام اب اس منزل کو چھو رہے ہیں جہاں تعریف و توصیف کے بجائے تقلید و تفہیم مقدم ہوا کرتی ہے۔ پاکستان کی مسلح افواج اپنے جن مایہ ناز اہل قلم پہ بجا فخر کر سکتی ہیں اُن میں جناب محمود الحسن کا نام ہی سرفہرست ہوگا۔ مسلح افواج پہ ہی موقوف نہیں اردو شاعری کی تاریخ جب بھی رقم کی جائے گی ڈاکٹر محمود الحسن صاحب کا انداز فکر اور فنی پیرایۂ اظہار بہت سی جہات کے ساتھ نہ صرف زیر بحث آئے گا بلکہ نصف صدی سے اوپر کے فنی سفر میں کلاسیکی شاعری کا علم بلند رکھنے پر محمود الحسن صاحب کو نمایاں مقام کا حامل بھی گردانا جائے گا۔ منظوم پیش لفظ میں ڈاکٹر محمود الحسن صاحب کیا فرماتے ہیں آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

زندگی آلام سے جب ہو زبوں
شعر کی دنیا میں پاتی ہے سکوں
شعر میں فرزانگی کی بھی جھلک
شعر ہے دراصل اک کارِ جنوں

اپنے رب کے حضور ڈاکٹر محمود الحسن صاحب کا اظہار تشکر بھی لائق توجہ ہے:

میری زباں سے ہو نہ سکے گا کبھی ادا
جو شکر تیرا تیرے محمدؐ نے کر دیا
تو ہے مرا خدا پہ کہاں آگہی مجھے
پایا فقط اسی کے وسیلے سے ہی تجھے

عشق محمدؐ میں جناب محمود الحسن کی طبیعت کچھ اور بھی رواں ہو جاتی ہے:

زمیں کیوں نہ ہو رشکِ جناں مدینے میں
مرے رسول کا ہے آستاں مدینے میں
نہ کوئی درپئے آزار ہے نہ گرفتار
نئی زمیں ہے نیا آسماں مدینے میں

اب ذرا محمود الحسن صاحب کا رنگ غزل اور تخیل پرواز بھی ملاحظہ کیجیے:

اُن سے مل جانے کا آخر پورا جب ارمان ہوا
دل کا پنچھی قید میں آ کر جانے کیوں حیران ہوا
اُن کے پیچھے چلتے چلتے ہم منزل تک آ پہنچے
اُن کا چلنا پھرنا اُٹھنا بیٹھنا سب قرآن ہوا

☆

بادشاہوں سے بھی تسکین سوا دیتے ہیں
جو گدا دولتِ تسکین و رضا دیتے ہیں
آپ جیتے ہیں آزارِ محبت لے کر
لوگ کہتے ہیں وہ ہر دکھ کی دوا دیتے ہیں

وقتِ آزمائش جو دار پہ نہیں ہوتے
سر تو وہ بھی ہوتے ہیں معتبر نہیں ہوتے
آپ خود ہی بتلائیں اور کون ہوتا ہے
آپ ذرہ ذرہ میں جلوہ گر نہیں ہوتے

اصل میں لیفٹننٹ جنرل محمود الحسن (ریٹائرڈ) کی تمام شاعری عشقِ خدا اور عشقِ رسول میں ڈوبی ہوئی ہے۔ وہ کسی بھی موضوع پر شعر کہیں انتہا عشقِ خدا اور عشقِ رسول کی جلوہ نمائی پر ہی ہوتا ہے۔ ایک بڑے صاحبِ علم، بڑے شاعر، بڑے انسان اور بڑے سلطان کے طور پر جناب محمود الحسن کو خراج پیش کرنے کا بہترین طریقہ اُن کے تازہ شعری نسخے "نوائے محمود" سے رجوع کرنا ہے جو فقط دو صد پاکستانی روپے کے عوض "حسن پبلیکیشنز" پشاور روڈ راولپنڈی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

## پانی میں ماہتاب

"علیم صدیقی صاحب کے ہاں ایک گہرا اسلامی اور ایک بلند تر دینی بصیرت یک جا نظر آتی ہے۔ اُن کی باتیں بہت کچھ حضرت امیر خسرو سے مماثل ہیں۔ یعنی مذہب اور ثقافت کا امتزاج۔ یہ شاعری پوری روایت سے جڑی ہوئی لیکن اسلوب میں یکسر منفرد و بالکل تازہ ہے۔" شان الحق حقی

"علیم صدیقی صاحب کے ابتدائی دور کا کلام اس قدر پختہ ہے کہ دل کو تڑپا دینے والے معاشرتی اور سماجی حقائق اُن کی شاعری کا اہم موضوع ہیں۔ میں اپنی نارسائی پر متاسف ہوں کہ علیم صدیقی صاحب سے مجھے براہ راست نیاز حاصل نہیں رہا حالانکہ ایسے صاحبِ علم و صاحبِ طبع رسا سے تا زندگی کبھی ملاقات ضرور ہونا چاہیے تھی۔" رشید حسن خان

"پروفیسر علیم صدیقی صاحب کی علمی و ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مرحوم کی زندگی بھی قابلِ رشک تھی اور وفات بھی قابلِ رشک۔ آپ رمضان المبارک ۱۴۳۲ ہجری کو نماز عشا و تراویح کی ادائیگی کے لیے مسجد کی جانب سفر کے دوران خالق حقیقی سے جا ملے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم کی

تخلیقات اس معیار کی حامل ہیں کہ انہیں محفوظ ہو کر اُس کے اصل حقدار تک ضرور پہنچنا چاہیے۔" ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان

"عابد صدیق میرے عزیز دوست اور محبوب صادق تھے۔ وہ ہمہ صفت موصوف تھے وسیع المطالعہ اُستاد ہونے کے علاوہ بہت عمدہ شاعر بھی تھے۔ وہ اگر لاہور میں مقیم ہوتے تو اُن کی شاعری کی دھوم مچ جاتی اور پاکستان بھر میں اُن کا نام مشہور ہو جاتا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ عابد صدیق کا کلام ہرگز ہرگز ایسا نہیں کہ اُسے نظر انداز کر دیا جائے۔ تمام با ذوق ادب اور قارئین شعر اور صاحب فن حضرات کو اس کلام کا ہمدردی اور انصاف سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ عصرِ حاضر کے شعرا میں عابد صدیق کی اہمیت کے قائل ہو جائیں گے۔" خواجہ محمد ذکریا

عاروں کی بیخودی میں بھی ہے مصلحت کو دخل
ساقی کا التفات بھی مردم شناس ہے

☆

کیا کیجئے کہ جھوٹ تھا لیکن ہر ایک بات
ہوتی ہے حق شمار جسے دار پر کہیں

☆

شہر وحشت زدوں کی بستی ہے
جس کو پوچھو وہ گھر نہیں ملتا

☆

مدا ہیں خیر شہر میں مفقود ہو گئے
جو ہیں وہ اپنے آپ میں محدود ہو گئے

☆

کسی کو پیارا کوئی علاقہ، کوئی قبیلہ، کوئی زبان
ہمارے شہروں میں چھوٹی چھوٹی محبتوں کے عذاب اُترے

☆

جانے کیا رنج تھا عابدؔ اُسے ہم سے ورنہ
بات اتنی تو نہ تھی جتنی بڑھا دی اُس نے

صفحات تین سو دس، مجلد، قیمت تین صد روپے، دستیابی: اُلفہ بیلی کیشنز، رانا چیمبر، پرانی انارکلی، ایک روڈ لاہور۔

بند ہونٹوں پہ دھری کہانیاں

"منج خالد کا شمار اُن افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے ستر کی دہائی میں اس وقت لکھنا شروع کیا جب علامت نگاری کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ کسی بھی نئے لکھنے والے کے لئے اس رجحان سے وابستہ ہوئے بغیر توجہ حاصل کرنا بظاہر مشکل نظر آتا تھا مگر منج خالد کی تخلیقی اُپج نے کسی بھی ایسے طریقے کا ری محض فیشن یا رواج کی خاطر جنا کی اختیار نہیں کی جو اُس کے موضوعات سے مطابقت نہ رکھتا ہو اور پھر بھی سنجیدہ قاری اور نقاد دونوں کی بھرپور توجہ حاصل کی۔ پیش لفظ میں فردوس حیدر نے درست طور پر تحریر کیا ہے کہ منج خالد کے افسانوں میں کسی ازم کی شعوری چھاپ نہیں ہے۔ وہ جو محسوس کرتی ہیں اُسے سادہ الفاظ میں بیان کر دیتی ہیں۔ اس بیان میں البتہ ذرا سی ترمیم ضروری ہے اس لئے کہ اُن کے الفاظ اتنے بھی سادہ نہیں ہوتے۔ وہ معروف معنوں میں علامت نگار تو نہیں ہیں مگر ادب کی اشاراتی اور استعاراتی تیکنیک کی اہمیت سے منحرف بھی نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کا تنقیدی شعور کسی بھی انداز کے اختیار کرنے میں اپنے موضوع کی نوعیت ہی کو پیش نظر رکھتا ہے۔ "گمشدہ لمحوں کی تلاش" میں ایسے افسانے دستیاب ہو جاتے ہیں جو سادہ اسلوب سے بلند ہو کر فکری تیج کی طرف سفر کرتے ہیں۔ "گمشدہ لمحوں کی تلاش"، "بدن میں اُترتی خزاں" اور "شجر زاد" ایسی ہی کہانیاں ہیں جو سوچتے ہوئے انداز کے ساتھ اس کنا رتخی شعور اور اپج کی نمائندگی کرتی ہیں۔ منج خالد متنوع موضوعات کی افسانہ نگار ہیں۔ معاشرتی زندگی کے نئے نئے رنگ ان کے ہاں بخوبی دستیاب ہوتے ہیں۔ وہ ہر لحہ بدلتی زندگی کے ساتھ چلتی ہیں گویا جو کچھ وہ دیکھتی ہیں وہ جھیلتی بھی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ منج خالد کے افسانوں میں آپ بیتی اور جگ بیتی کا ادغام ہوا ہے۔ اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ قاری کے آگے کہانی بیان نہیں کر رہیں بلکہ قاری سے باتیں کر رہی ہیں۔ ایک سچ پر بیان کے جذبے کا خلوص اور موضوع کی صداقت ہے۔ "زندہ لوگ مردہ سوچیں"، "انسان اور آدمی" اور "بدن میں اُترتی خزاں" ایسی کہانیاں ہیں جن میں اُن کے مشاہدات خود ہمارے تجربات کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں۔ کوئی کردار ایسا نہیں جو ہمارا دیکھا بھالا نہ ہو۔ منج خالد کی ایک کہانی "مریندی بلبل" بطور خاص توجہ کی طالب ہے جس میں کراچی کی جواں مرگ شاعرہ سارہ شگفتہ کا المیہ بیان ہوا ہے۔ معاشرتی مسائل پر لکھنے کے لئے مشکلات یہ ہیں کہ نہ صرف زندگی کے گہرے مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ انسانی نفسیات سے بخوبی آگاہی بھی اس کی بنیادی شرط ہے۔ منج خالد کی کامیابی اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ انسانی نفسیات اور اس پر اثر انداز ہونے والے واقعات پر اپنی توجہ مرکوز رکھتی ہیں اور اپنے معاشرے کا ہی نہیں بلکہ اس میں بسنے والے انسان کا بھی بھید پانے کی کوشش کرتی ہیں۔" احمد جاوید

اگر آپ احمد جاوید کے رشحات قلم سے متفق ہیں تو آپ کو اولین فرصت میں محترمہ منج خالد کے تازہ افسانوی مجموعے "بند ہونٹوں پہ دھری کہانیاں" کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ "بند ہونٹوں پہ دھری کہانیاں" کی اُنیس کہانیاں جناب احمد جاوید کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کی گواہی اسی طرح دے رہی ہیں جس طرح چلتی سانسیں ہماری زندگی کی گواہی دیتی ہیں۔ صفحات ایک سو چھہتر، مجلد، قیمت ایک سو پچاس روپے، دستیابی: اُلفہ بیلی کیشنز، پرانی انارکلی لاہور۔

## تضاد

"بھائی عزیز جبران انصاری وطن کے پکے اور کام کے سچے ادیب شاعر اور معلم ہیں۔ ان کی ادب دوستی کثیر الجہات ہونے میں کوئی شک نہیں۔ شاعری کی طرح اُن کی افسانہ نگاری میں بھی زندگی کے مثبت اور تعمیری اقدار کو ترجیحی طور پر اپنے افسانوں کی امتیازی مرکزیت میں جذب کیا ہے۔ افسانہ حقیقت سے زیادہ دلچسپ ہوا کرتا ہے۔ افسانہ نگار زندگی کی اساسی قدروں سے بہرور ہوتا ہے اور مقصدِ تحریر میں سچی اقدار یا حقیقی رجحانات نہ ہوں تو غم اور خوشی دونوں ہمہ گیر حوالوں کو اپنے نقطہ نظر افسانوں میں وہ رنگ و آہنگ دیتا ہے کہ قاری اول تا آخر افسانہ نگار کے تجزیاں کے سحر میں گرفتار رہتا ہے۔ "تضاد" کے سبھی افسانے زندگی کے تلخ و شیریں حقائق سے عبارت ہیں لیکن بات اندازبیاں کی ہے اور صرف اندازبیاں کو اولیّت سائش گردانے کے بجائے فنی اور فکری آداب اور ان کا اطلاق بھی میرے نزدیک افسانوی تحریر کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کتاب میں شامل تمام افسانے اور ایک قابل قدر ذرائعہ افسانہ نگار کی مشاقی اور افسانے کے فنی تقاضوں کی بجا آوری کا بیّن ثبوت ہیں۔ افسانہ نگار سے اختلاف کی گنجائش تو بہر کیف موجود ہی ہے مگر ذاتی طور پر مجھے "تضاد" کے تمام کے تمام افسانے بہت اچھے لگے ہیں۔" پروفیسر آفاق صدیقی

پروفیسر آفاق صدیقی کی رائے جناب عزیز جبران انصاری صاحب کے لئے سند کا درجہ رکھتی ہے مگر قاری کی رائے معیزن کی مانند ہے آپ کو حق ہے کہ آپ عزیز جبران انصاری کے تازہ افسانوی مجموعے "تضاد" کا مطالعہ کھلے دل، دماغ سے کیجئے اور اپنی رائے کے اظہار میں ہر طرح کی مصلحت سے بالا ہو جایئے۔ "تضاد" دوصد اٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے اور "تضاد" میں شامل افسانوں کی تعداد اکیس ہے۔ کسی بھی افسانے کی بحیثیت کسی اور مقام پر رکھنا نہ صرف اُس افسانے بلکہ مصنف سے بھی ناانصافی کے مترادف ہے لہٰذا ہم یہ کہنا زیادہ بہتر تصور کرتے ہیں کہ ہر افسانہ اپنی جگہ ایک نئے تجربے، نئی واردات اور نئے احساسات کا حامل ہے اور خود کو پڑھوانے کی پوری قوت رکھتا ہے۔ "تضاد" کی قیمت: دوصد پچاس روپے اور دستیابی کا پتہ: جبران اشاعت گھر ۲۰۱ اما ئیسنٹرل نزد مسجد مقدس، اردو بازار، کراچی ہے۔

## سفر جاری ہے

"میں تو ملک مقبول احمد صاحب کو صرف ایک شریف النفس انسان اور ایک معروف اشاعتی ادارے کے مالک کی حیثیت سے ہی جانتا تھا لیکن اُن کی خود نوشت سوانح عمری کے مسودے کی ورق گردانی کی تو یہ راز کھلا کہ ملک صاحب صرف کتابیں چھاپتے نہیں بلکہ کتابیں اُن کے اندر بھی بستی ہیں۔ وہ پبلشر ہونے کے باوجود کتابوں سے محبت کرتے ہیں۔ اسی محبت کی ایک اہم کڑی اُن کی زیرِ نظر تصنیف "سفر جاری ہے" جس میں کئی گو تجربات، حوادث اور مشاہدات اور ملک صاحب کا نہایت دلچسپ اسلوب اور منفرد اندازِ تحریر اس کتاب کو سوانح عمریوں میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت بخش رہے ہیں۔" ڈاکٹر صفدر محمود

"یہ کتاب پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ مقبول صاحب کی زندگی بھی افسانے سے کسی طرح کم نہیں۔ انہیں مشکلات اور حادثات کا سامنا کرنا پڑا مگر انہوں نے صداقت، دیانت اور امانت کے اصولوں کو قائم رکھا، خود محنت کی اور نتائج خدا پر چھوڑ دیے۔ اس کتاب کا باب "دفتری کا تپ کے لوگ" معاشرے کا حقیقی روپ ہمارے سامنے لاتا ہے لیکن یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ملک مقبول صاحب نے ہر طرح کے لوگوں سے رابطہ کا سلسلہ کس طرح قائم رکھا اور آنکھوں کو تیس لگنے سے کس طرح بچایا۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں "زیب داستان" سے کام نہیں لیا گیا۔" ڈاکٹر فوزیہ صدیقہ

ملک مقبول صاحب نے خود نوشت تحریر کر کے اپنی زندگی کے دلچسپ اور معلومات آفریں واقعات سے روشناس کرایا ہے۔ ایک اچھا شروعی کہلاتا ہے جس کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت گہرا ہو اور وہ انسانی نفسیات پر بھی عبور رکھتا ہو۔ ملک مقبول احمد کی تحریر بھی ہوئی شستہ اور رواں ہے جس میں جابجا ان کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کے ثبوت نظر آتے ہیں۔ سفیان آفاقی

"سفر جاری ہے" آپ بیتی کی صنف تعریف پر پورا اترتی ہے۔ ملک مقبول احمد نے بچپن سے لے کر موجودہ عمر تک زندگی کے احوال، یادآفریں واقعات اور تلخ و شیریں تجربات کے بیان پر مشتمل ہے۔ کتاب کا اہم حصہ اُس عرصے پر محیط ہے جس کا تعلق ملک صاحب کے بچپن، جوانی اور عملی زندگی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے۔ یہ عرصہ حیات اُن کے گاؤں "دیوال" سے جڑا ہوا ہے جس کے بیان میں ملک مقبول احمد صاحب نے دیہی زندگی کی منظر کشی اس مہارت سے کی ہے کہ پریم چند اور سدرشن کے افسانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔" ڈاکٹر طارق عزیز

"میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ ملک مقبول احمد "گرم دم جستجو اور نرم دم گفتگو" والے انسان ہیں ان کا رابطہ ہر قسم کے ادیبوں اور شاعروں سے پڑا جس کا تذکرہ زیرِ نظر کتاب میں موجود ہے فطرتاً ملک صاحب "خیالِ خاطرِ احباب" رکھنے والے انسان ہیں جس کے باعث انہوں نے عملی زندگی میں اور نہ زیرِ نظر کتاب میں انسانیت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔" شعیب بن عزیز

مجلد نفیس کاغذ، ضخامت چار سو پچیس صفحات، قیمت: چار صد روپے، دستیابی کا پتہ: مقبول اکادمی، چوک اردو بازار، سرکلر روڈ، لاہور۔

## خوش کلامیاں قلم کاروں کی

"داغ دہلوی نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک صاحب اُن سے ملنے آئے اور انھیں نماز میں مشغول دیکھ کر لوٹ گئے۔ اُسی وقت داغ نے سلام

پھر ملازم نے کہا "فلاں صاحب تشریف لائے تھے اور واپس چلے گئے" داغ نے فرمایا "دوڑ کر جا ابھی راستے میں ہوں گے" ملازم بھاگا بھاگا گیا اور ان صاحب کو بلا لایا۔ داغ نے اُن سے پوچھا "آپ آ کر چلے کیوں گئے تھے" مہمان نے کہا "آپ نماز پڑھ رہے تھے اس لئے چلا گیا۔" داغ نے برجستہ کہا "حضرت نماز ہی پڑھ رہا تھا لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا۔"

"ناٹک ساقی اردو زبان کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ انہوں نے زیر نظر کتاب میں جو لطائف شامل اشاعت کئے ہیں وہ تو قابل تعریف ہیں ہی لیکن اپنی بات کے عنوان سے ناٹک ساقی کا تحریر کردہ مقدمہ بھی قابل توجہ اور لائق مطالعہ ہے"..... پروفیسر گوپی چند نارنگ

"عبدالمجید سالک روزنامہ "زمیندار" کے ایڈیٹر تھے۔ ترک موالات کی تحریک میں برطانیہ کے خلاف مضامین لکھنے کی پاداش میں گرفتار ہو کر ایک سال کے لئے جیل چلے گئے۔ اس کے بعد "زمیندار" کے بہت سے ایڈیٹر گرفتار ہوئے۔ مہر جان جالندھری جیل جانے کے دوران تشریف لائے تو سالک صاحب سے دریافت کیا کہ "زمیندار" کا اصل ایڈیٹر کون ہے۔ سالک صاحب نے جواب دیا کم از کم میں تو اصلی ہوں۔ مہر جان جالندھری نے ہنس کر کہا یہ تو ہم بھی جانتے ہیں لیکن آج کل "زمیندار" میں بطور ایڈیٹر جس کا نام چھاپا جا رہا ہے وہ تو کوئی پان فروش ہے۔ سالک نے تڑ سے بڑی جواب دیا جب آپ اصل ایڈیٹروں کو اس تیزی سے گرفتار کرتے جائیں گے تو کسی پان فروش کو ہی آگے بڑھانا پڑے گا۔"

"خوش کلامیاں قلم کاروں کی" کے مقدمے کی تعریف نہ کرنا ایک طرح سے حقدار کو حق سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔ ناٹک ساقی نے زیر نظر کتاب میں اردو ادب کی ہزاروں سال پر محیط مزاحیہ تاریخ بیان کر دی ہے"..... ڈاکٹر خلیق انجم

"شملہ مشاعرے کی صدارت متحدہ پنجاب کے پہلے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات کر رہے تھے۔ عرش ملسیانی نے جب یہ شعر پڑھا تو انہیں بہت داد ملی:

دو روزہ عظمت و شوکت پہ پھولنے والے
اجل سے پوچھ کہ شانِ سکندری کیا ہے

شعر کہتے وقت عرش صاحب کے گمان میں بھی نہ تھا کہ سر سکندر حیات خاں تھوڑے عرصہ میں اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔ اتفاق سے عظمت اور شوکت سر سکندر حیات کے دو لڑکوں کے نام بھی تھے۔"

دلچسپ بات چیت ہماری روایت کا حصہ ہے ناٹک ساقی نے نے اردو ادب کی شگفتہ تاریخ رقم کر کے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ یہ کتاب خوش کلامی نہیں بلکہ جست کلامی ہے۔ اس طرح کی کتابوں سے ادب کا روپ نکھرنے لگتا ہے اور کتاب میں جس ادوار کے لوگ شامل ہوتے ہیں ان کی تصویریں سامنے آجاتی ہیں..... جوگندر پال

جس طرح ایک ماہی گیر مچھلیوں کو پکڑنے کے لئے دریا میں اپنا جال بچھاتا ہے اسی طرح ناٹک ساقی لطیفوں کو پکڑنے اور جمع کرنے کے لئے خیالات کا جال بچھایا کرتے ہیں..... مجتبیٰ حسین

ناٹک ساقی پاک و ہند کے قریب سارے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں سے ذاتی طور پر واقف ہیں جن میں سے اکثر ناٹک ساقی کی ساقی گری سے بھی لطف اٹھانے والوں کی محفلوں میں اپنی زبان بند، بلکہ اپنے کردار کے بند کھولنے کا موقع بھی ملا ہے..... شمس الرحمٰن فاروقی

اس گھٹن، مہنگائی و کولی کے اس پر آشوب دور میں اگر آپ چند لمحے شگفتگی کی ہم عصری میں بسر کرنا چاہتے ہیں تو فوری طور پر ایم آر پبلی کیشنز 2695 گلی کالے خان، کوچہ چیلان، دریا گنج دہلی سے رابطہ کیجئے جہاں ناٹک ساقی کی یہ شگفتہ ادبی یادداشت صد ہندوستانی روپے کے عوض آپ کی راہ دیکھ رہی ہے۔

تجدید جگر

حجاب عباسی میرے بزرگ دوست حضرت شعیب حزیں کی صاحبزادی ہیں۔ شعیب صاحب اور میں گزشتہ صدی کی پانچویں دہائی میں برسوں ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ رہے۔ وہ اپنے عہد کے صف اول کے شاعر تھے۔ ظاہر ہے حجاب کی تربیت انہیں کے سایہ عاطفت میں ہوئی اور شعر گوئی کا جوہر بھی انہیں کی عطا ہے۔ ایسے خاندان اور ایسے ماحول سے روشنی حاصل کرنے والی دختر نیک اختر دنیائے ادب میں کیسے اعلیٰ مقام حاصل نہ کرتی۔ ان کی شاعری خود گواہی دے رہی ہے کہ حجاب نے اپنے والد محترم سے کیا کچھ حاصل نہ کیا یا کچھ نہ پایا۔

نہیں ممکن سخن آغاز کرنا
تو پھر کیا دل دریچہ باز کرنا

ہمیں عادت ہے تجدیدِ وفا کی
تمہارا فن نظر انداز کرنا

پلٹ آنا اچانک میری جانب
کبھی تو اس طرح اعجاز کرنا

حقیقت زندگی کی کچھ بھی نہیں ہے
تو کیا اس زندگی پہ ناز کرنا

-جاری ہے-

یہ کیسی رات ہے، کیسا موسم؟ اک جس نے سارے جہاں کی رنگین ساعتوں کو اُداسیوں کی ردا اُڑھادی/ اک جس نے سر سبز پودے خزاں کی نذر کا اسیر کر کے/ اک خوشبوؤں کو بھی وحشتوں کا سفیر کر کے/ پھر آج بھیجا ہے میری جانب/ گذرتے لمحے گزرنے والے مرے تصور کی رہگذر پر/ انشان قدموں کے ثبت کر کے چلے گئے ہیں/ میں آج بھی ان گئی بہاروں میں کھلنے والے/ محبتوں کے گلابی پھولوں سفید کلیوں کو اپنے آنچل میں بند کر کے/ خزاں سے محفوظ ہو رہی ہوں..... حجاب

حجاب کی غزل ہو یا نظم..... دونوں ہی فکری اعتبار سے بھرپور داد و تحسین کے متقاضی ہیں۔ خاص طور سے اُن کی غزل جدید ہونے کے باوجود کلاسیکی روایت سے بھی سرشار نظر آتی ہے..... حامد علی شاکر

آپ نے اوپر کی سطور میں جدید لہجے کی شاعر حجاب عباسی کا کلام اور اس کی بابت ہمارے عصر کے بلند آہنگ شاعر جناب حامد علی شاکر کی رائے ملاحظہ فرمائی۔ آپ ہی کہیے اس قدر مدلل اظہار اور اثبات کے بعد کسی طرح کی حاشیہ آرائی کی ضرورت باقی رہتی ہے کیا؟ اگر نہیں تو پھر گیند آپ کے کورٹ میں ہے۔ جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس کا درست استعمال کرتے ہوئے "دنیائے ادب" ویگل ٹریڈ سکوائر سے رجوع کیجیے اور محترمہ حجاب عباسی اور جناب حامد علی شاکر کی خوش گمانیوں کو یقین میں بدل دیجیے۔

انشا کا گلزار نمبر

میں جب سے دیکھ سن رہا ہوں/ تب سے یاد ہے مجھے/ خدا سجا بجا رہا ہے/ رات دن/ خدا کے ہاتھ میں ہے سب برا بھلا/ پاؤں تلے سے ایک زلزلہ گذرا اور آئینہ گر کے چور چور ہو گیا/ آئینوں سے بات کرتے رہنا ہے/ پتہ نہیں کتنے پھر ٹوٹ جاتے ہیں/ میں کچھ کہتا نہیں خود سے/ کہیں کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے/ میں روز خود دعا میں بیٹھ جاتا ہوں/ لیکن..... دل نہیں لگتا/ میں سجدے میں چلا جاتا ہوں لیکن یاد رہتا ہے/ کہ میری پیٹھ میں جو درد تھا تو کئی راتیں جگا دے گا/ ذرا سا کم ہی تو جھکتا ہوں/ بہت کچھ کمی میں آتا ہے/ کیوں لیکن/ میں کچھ کہتا نہیں خود سے/ کہیں کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے..... گلزار

میں اپنے پاپا کی ابتدائی زندگی کی چشم دید گواہ نہیں ہوں۔ وہ میرے لیے محض باپ نہیں بلکہ زندگی کا مستند تجربہ ہے ہیں/ طاقت اور جذباتی مدد کا ایک ستون بے زبان/ میرے تخلیقی سرچشموں کا منبع تحریک اور ایک وراثت جس کے ساتھ میں ہمیشہ جینے کی کوشش کرتی رہوں گی..... میگھنا گلزار

اپنے دماغ اور الفاظ سے فلمی دنیا میں طرح طرح کے گل بوٹے کھلانے والے گلزار کو آج سے نہیں گذشتہ پچیس برسوں سے جانتا ہوں۔ جب ترقی پسند مصنفین کی بیٹھک میں آیا کرتا تھا۔ یہ بیٹھک کبھی ہمارے گھر پر بھی ہوا کرتی تھی۔ کرسیاں کم ہونے کے باعث دری کا فرش بچھا دیا جاتا کچھ لوگ آ گئے

بچھتے جیسے علی سردار جعفری، راجندر سنگھ بیدی، ساحر، مجروح وغیرہ کچھ نوجوان کونے میں چھپ کر جن میں آج کا قد آور گلزار بھی ہوا کرتا تھا۔ بھل رائے بہت سنجیدہ آدمی اور بڑے تخلیق کار تھے ان کی قلم کے ڈائیلاگ لکھنا آسان کام نہ تھا لیکن یہ ہونہار نوجوان وہاں ایسا فٹ بیٹھا جیسے انگوٹھی میں نگینہ..... خواجہ احمد عباس

گلزار کی شاعری موزرٹ (Mozart) کی موسیقی کی طرح سکون بخشتی ہے، جمالیاتی انبساط عطا کرتی ہے۔ گلزار کی نظموں کے موضوع اور فارم کے درمیان جو مطابقت پیدا ہوتی ہے وہ روح/ وجود اور حقیقت کی بازدید بن جاتی ہے..... ڈاکٹر شکیل الرحمن

خط گلزار یوں تو اردو فارسی کا ایک آرائشی خط ہے جس میں خطاط اپنے دستِ ہنر سے جادو بکھیرتا ہے لیکن یہاں خطِ گلزار سے مراد تخلیق کاری و تمثیل نگاری کا وہ اسلوب ہے جس کے سہارے گلزار نے مرزا غالب کو حیات نو بخش دی ہے۔ میرے خیال میں گلزار کی تخلیق "مرزا غالب" ایک سوانحی منظر نامہ ہے..... ڈاکٹر قمر رئیس

گلزار کا موضوعاتی کینوس بہت بڑا ہے۔ اس میں وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو تاریخ، آرٹ، ادب اور فلسفہ کی قد آور شخصیتوں کو ان کی ذاتی زندگی کے تناظر میں دیکھ کر ان کے فن کا تجزیہ کرتی ہیں..... ڈاکٹر ستیہ پال آنند

گلزار نے اپنا ادبی سفر افسانوں سے شروع کیا تھا لیکن وہ افسانے عام ڈگر سے ہٹ کر تھے۔ گلزار کے افسانے جن لوگوں نے پڑھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ صرف خارجی ماحول کے عکاس نہیں تھے یہ افسانے انسان کے باطنی احوال کو بھی سامنے لاتے تھے۔ انسان کے باطنی احوال سے گہری دلچسپی غالباً انہیں شاعری کی طرف لے آئی۔ جو عصری اردو شاعری کے لئے ایک مبارک شگون ہے..... محمود سعیدی

آپ گلزار کی کوئی بھی کہانی لے لیجیے اسے پڑھتے ہوئے شور اور سرعت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ گلزار چپ چاپ اپنی بات نبھاتے چلے جاتے ہیں اور قاری ان کی خاموشی کلمت میں گویا اپنے آپ ہی کو پڑھتا چلا جاتا ہے..... جوگندر پال

انشا کولکتہ کی خاص اشاعت گلزار نمبر کے خزانے سے چند انمول موتی آپ کے اشتیاق کو مہمیز دینے کی غرض سے پیش کئے گئے ہیں یقیناً آپ اپنے وقت کے کامیاب فلمساز، ہدایتکار، کہانی نویس، شاعر، انسان دوست اور انسان نواز تخلیق کار کی بابت وہ سب کچھ جاننے کے آرزو مند ہیں جس کی جستجو آپ کے دل میں مدت سے تھی۔ پہلی فرصت میں B-25 ذکریا سٹریٹ کولکتہ سے رابطہ کیجیے جہاں اردو ادب کی یادگار دستاویز تین صد ہندوستانی روپے میں آپ کی منتظر ہے۔ آپ کی سہولت کے لیے گلزار صاحب کا پتہ بھی درج کیا جا رہا ہے "BOSKIYANA"
PALI HILL, BANDRA, MUMBAI-400050

## مونالیزا.... اک بھکارن

ستیہ پال آنند (کینیڈا)

''فالتو کچھ ریزگاری؟'' 1

میٹرو کی سیڑھیوں کے پاس سردی سے ٹھٹھرتی
ایک بوڑھی گوری عورت
اپنے ہونٹوں پر سجائے ایک کم گو مسکراہٹ
پھینک دیتی ہے ہوا میں
یہ ہزاروں بار دہرایا ہوا بے کار جملہ
''فالتو کچھ ریزگاری؟''

اور میں رکتا ہوں....
کچھ سکّے جو میرے ریل بھاڑے سے بچے ہیں
اس کے ہاتھوں میں تھماتا ہوں.....
مرا معمول ہے یہ!
سامنے کے زرد دانتوں کی نمائش
اور ہلکی بدبداتی سی کسی آواز میں
(جو ''تھینک یو'' ہے)
شکریہ کہتی ہے مجھ کو
اور سیڑھی پر مرے پیچھے اترتے
شخص کو امید افزا اک نظر سے دیکھتی ہے
''فالتو کچھ ریزگاری!''
اس کے بوڑھے ہاتھ کی خالی لکیریں بولتی ہیں

اور میں چلتے ہوئے یہ سوچتا ہوں
مونالیزا عمر میں شاید تجاوز کر گئی ہوتی تو اس کی
ہلکی پُراسرار دھیمی لب خمیدہ مسکراہٹ
یوں ڈاونچی 2 کے دقیقہ رس برش 3 سے
کینوس پر رنگ میں ڈھل کر ابھرتی
جیسے اس کو
گم شدہ جنت میں ممنوعہ ثمر کے
ذائقے کی کھٹی میٹھی یاد پھر سے آ گئی ہو!

1 امریکا میں بھیک مانگنے کا یہ عام جملہ ہے جس کے لیے بھکاری اکثر some spare change? کا سوال کرتے ہیں
2 DAVINCHI 3 Brush کا انگریزی تلفظ دہرایا گیا

## مونالیزا سامنے دیوار پر تھی

مونالیزا سامنے دیوار پر تھی
بیش قیمت پرنٹ، جو اک خوبصورت
فریم میں جکڑا ہوا تھا
مونالیزا کا تبسم!
رازدارانہ، خمیدہ، زیر لب، دھیما ہیولے
ایک سایہ، شائبہ مسکان کا....
اک ادھ کھلا غنچہ، ذرا سے خم میں مخفی!

''بول مونا!'' رات کو میں
ہوتے ہی اصرار کرتا تھا'' بتاؤ، راز کیا ہے
اس تمہاری مسکنی کا؟''

واہمہ تھا، یا حقیقت
ہر کسی شب مجھ کو لگتا تھا، کہ جیسے
اس کے لب پورے کھلے ہوں
ادھ کھلا غنچہ گلابی پھول بن کر کھل گیا ہو
واہمہ ہی تھا یقیناً
مونالیزا کا تبسم راز تھا ملفوف.... جس کو
اس کا خالق ایک ہی لمحے کے وقفے میں مقید کر گیا تھا
جامد و بے جان لمحہ!

اور پھر اک رات وہ دیوار سے نیچے اتر آئی....
ڈونچی کا حسیں شہکار، لیکن
ایک بڑھیا
لب پچک کر پوپلے منہ میں مدارد ہو گئے تھے
جھریاں چہرے پہ گویا جال سا اک بن گئی تھیں
زرد چہرہ، روکھے سوکھے بال، خستہ حال، لیکن
آرٹ کا نادر نمونہ!

ششدر و حیراں مجھے دیکھا، تو مونا مسکرائی
بے زبانی کی زباں میں وہ تبسم کہہ رہا تھا
راز میرا اب بھی سربستہ رہے گا!

صبح سے اب
جاگ کر کیا دیکھتا ہوں
سامنے دیوار اب خالی پڑی ہے!!

# پنجابی غزلاں

ستیہ پال آنند (کناڈا)

تن دے پچھے' من دے کالے' پر متاندے پھردے نے
[1] ہردی پوڑی' سنگم' کاشی' تیرتھ ناہندے پھردے نے

یاداں لنگھ گئے ورہیاں دیاں' سُفنے کل آندے ورہیاں دے
نٹ کھٹ بچے دل دے وہیڑے شور مچاندے پھردے نے

خانہ بدوش نہ وودھ کے کوئی اُنہاں توں جو رہندے ساہاں تک
سر تے گھر دیاں کندھاں چُک کے گلیاں واہندے پھردے نے

خورے انہاں نال جیاں دے گھر وچ رات دا اَن نہ ہووے
میلیاں وچ جو نچدے گاندے ڈھماں مچاندے پھردے نے

یار نہ بیٹھے' جام نہ کھڑکے' نویں سال دی رات ویکھیا
سڑکاں تے بس پلس دے "کروزر" [2] ہارن وجاندے پھردے نے

دل دے کر منڈل پھیلائے حسن دی خیر نے منگدے جوگی
رات رات بھر الکھ جگاندے' پھیرے پاندے پھردے نے

پائیا چولا تیری غزل دا' سجڑے اپنیاں ساریاں سِراں
ننگے شبد آنند ارتھاں دی لاج بچاندے پھردے نے!

1. گنگا اشنان کے لیے
ہندوؤں کے تیرتھ سے تیرتھ استھان ہیں
ہردی پوڑی = ہردوار
سنگم = ترِبینی الہٰ آباد
کاشی = بنارس

2. Cruiser

شاید کسے نوں لوڑ پوے عشق دی صلیب
شعراں چ گھڑ کے میں وی رکھی کاغذی صلیب

خوشیاں چ سارے یار سی پر وقت جد پیا....
آپے ہی اپنے موڈھے تے چکنی پئی صلیب

اک لیمپ پوسٹ سی کہ کوئی خنڈ منڈ رُکھ
لگیا کہ جتھ پیارے کھڑی اے کوئی صلیب

مردے نوں دفن کر کے جد پرتے گراں دے لوک
قبراں دی رہ تے آپ ای ٹردی ملی صلیب

اُتّھی کوئی ناں جیسے اکیہویں صدی چ پھر
لوکاں نوں سانبھ سانبھ کے رکھنی پئی صلیب

قصے ای بس تاں رہ گئے انجیل دے آنند
باقی رہیا مسیح نہ باقی رہی صلیب!

O

# رس رابطے

**وقار جاوید**

محترمی گلزار جاوید صاحب تسلیمات۔

ڈاکٹر ہوگیندر بکل تشنہ صاحب کے توسط سے تازہ چہارسُو دستیاب ہوا۔ ہر چند آپ کو صحت کی علالت اور دیگر دشواریوں کا سامنا تھا اس کے باوجود آپ نے کم صفحات میں بہت اچھا گوشہ مرتب فرمایا ہے۔ یہ مختصر ہے مگر تاثر سے بھرپور ہے۔ تند کشور وکرم صاحب کا گوشہ بھی بہت عمدہ شائع ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ لطف لے کر پڑھ رہا ہوں۔ دل تو چاہتا ہے کہ آپ کو تفصیلی خط تحریر کروں مگر آنکھیں دھوکہ دے رہی ہیں۔

(مانک ٹالا)

جناب گلزار جاوید صاحب السلام علیکم۔

یہ کہنا تو آسان ہے کہ آپ نے چہارسُو کے ہر شمارہ میں کسی نہ کسی کو قرطاسِ اعزاز پیش کرکے چہارسُو کو ایک منفرد حیثیت بخش دی لیکن یہ کتنا مشکل کام ہے یہ آپ ہی سمجھ سکتے ہیں اور ہم جیسے لوگ صرف واہ واہ کرکے آپ کا دل بزعم خویش خوش کر دیتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ اپنی کوئی چیز آپ کو بھیج دیتے ہیں چنانچہ اس بار پھر اپنی ایک غیر مطبوعہ اور غیر مسعود غزل بھیج رہا ہوں.... اور ہاں اپنا تیسرا مجموعۂ غزلیات "نگہداشت" اور غالب پر ایک تازہ کتاب "غالب کا جمالیاتی شعور" بھی بھیج رہا ہوں۔

(مشکور حسین یاد)

بھائی جان گلزار جاوید صاحب تحیّات اور خیر و عافیت۔

اِی میل ایک نہیں دو عدد بھیجی ہیں۔ امید ہے پہنچ گئی ہوں گی۔ غالبؔ نے مکتوب کو نصف ملاقات کہا ہے۔ اب فون پر بات کرنے اور ای میل سے بات کرنے کو پوری ملاقات کہیں گے کیا؟

وکرم صاحب نے دہلی سے "منتخب پال آنند کی تین نظمیں" کی ایک جلد یا دو جلدیں آپ کو بھجوائی ہیں۔ امید ہے یہ بھی مل گئی ہوں گی.... میں چلتا پھرتا تو پہلے بھی تھا اب دوبارہ ڈرائیو کرنے لگا ہوں۔ البتہ انجکشن کے لیے یا ریڈیائی شعاعوں کے لیے ہسپتال کی وین میں جاتا ہوں۔ اس حالت میں ڈرائیونگ ممنوع ہے۔ بہر حال میڈیکل رپورٹ اور PSA کاؤنٹ ہمت افزا ہے۔ اللہ خیر کرے گا۔ آپ سب کی دعائیں شاملِ حال ہیں۔ میرے پشاور کے دوست یونس صابر صاحب، ارباب یوسف رضا چشتی صاحب، خاطر غزنوی صاحب، محسن احسان صاحب، ماجد سرحدی صاحب، ظہور اعوان صاحب اور دیگر دوست ای میل، فون اور خطوط سے رابطہ بنائے رکھتے ہیں۔ اللہ ان سب کو اجر دے گا۔

نند کشور وکرم صاحب کی شخصیت آپ کے رسالے کے سرورق (اندرونی سرورق) پر برملا شائع ہونے والے اشعار کی چہت: مصاحر کا مرقع ہے۔ یہ ہیں محبت، مروت، تحمل، تدبر، برداشت اور رواداری۔ اس میں بردباری، علم اور شرافت کو شامل کرلیں تو یہ فہرست مکمل ہو جائے گی۔ جن لوگوں نے "نیسوس اوصاف" کا مطالعہ کیا ہے وہ ان کے قلم کی شگفتگی سے واقف ہیں۔ اسی شمارے میں "چپاسام کے نام" مزاحیہ خطوط ان کے قلم کی کاٹ کا بہترین نمونہ ہے۔ دیویندر اسر نے صحیح لکھا ہے کہ نند کشور وکرم آج کے دور میں سیاست اور نظریات کے بوجھ کے باوجود سچ بولتے ہیں۔ اور اس سچ کی ان گنت لوگوں کے چہروں کے آئینوں سے منعکس جھلک ہم وکرم صاحب کے ناول میں دیکھ سکتے ہیں۔ پریم پال اشک صاحب کا مضمون کربلا کے حوالے سے موہیال برہمن قبیلے کی ایک شاخ "دت" کے تناظر میں وکرم صاحب کو "حسینی دت" کا خطاب دیتا ہے جو با موقع اور کل ہے۔

قرطاسِ اعزاز سے قطع نظر اس شمارے میں حرفِ معتبر کی کے تحت غزلیات میں ڈاکٹر وزیر آغا، محسن احسان، ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر قیصر نجفی، ماجد سرحدی اور حنیف ترین کی غزلیں اچھی لگیں۔ کچھ اشعار تو لطف دے گئے۔

رنگ نکلے امیروں کے ہیں
مسئلہ غریبوں پہ غربت کی

(انور سدید)

اب تو یوں لگتا ہے اے گردشِ ایام جیسے
عمر ساری کسی خیمے میں بتا دی ہم نے

(وزیر آغا)

آنکھ تشنہ بھی نہیں، ہونٹ سوالی بھی نہیں
یہ صراحی کہ بھری بھی نہیں، خالی بھی نہیں

(محسن احسان)

امیر شہر کی دنیا بڑی سہی، لیکن
فراز دار سے چھوٹی دکھائی دیتی ہے

(قیصر نجفی)

یا تو دکھ سکھ مل کر بانٹو ورنہ چمن کا نام نہ لو
یہ کیسا انصاف ہے جس میں سارے پھول تمہارے ہیں

(ماجد سرحدی)

عشق سے میرے علاوہ کس طرح بچ پائے گا
کر گیا ہے جو مری حالت جنونی دیوتی

(حنیف ترین)

قرطاس اعزاز کے بعد قرطاس احترام کی طرف آئیں۔ مالک رام اور میں نے شاید ایک ساتھ ہی اپنا تخلیقی سفر افسانہ نویسی سے شروع کیا۔ میرا پہلا افسانوی مجموعہ "چھپنے کے لیے" ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ تب تک ہم دونوں شاید تیس سے کچھ اوپر افسانے لکھ چکے تھے۔ ان سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ صرف غائبانہ تعارف رہا۔ ملک بدری، بے زمینی اور غریب الوطنی نے مجھے چار دانگ عالم میں خس کے پتے کی طرح اڑایا۔ نتیجے کے طور پر ان سے کبھی ملاقات نہیں۔ لیکن جہاں کہیں ان کی تحریر دیکھتا تھا۔ ضرور پڑھتا تھا۔ اب قرطاس احترام کے مندرجات سے ان کے بارے میں کما حقہ واقفیت حاصل ہوئی ہے۔ پریم چند پر جو کام انہوں نے کیا ہے وہ امرت رائے کے موازنے میں کہیں آگے ہے۔

بچپن میں گاؤں کی مسجد کے گنبد کی پیشانی پر کندہ ایک شعر پڑھا کرتا تھا:

روز محشر کہ جانگداز بود - اولیں پرسش نماز بود

اب سید محمد علی مظفر دہلوی (مرحوم) کے اس موضوع پر اشعار پڑھ کر آنکھوں کے سامنے مسجد کے پھاٹک، اس پر کندہ شعر، محراب اور مینار کا نقشہ ابھر آیا۔ واللہ انسانی ذہن بھی ایک عجوبے سے کم نہیں، لیکن اس سے ان اشعار میں مضمر تجزیے کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔

کچھ عجیب سا لگا یہ دو نظمیں پڑھ کر۔ اور وزیر آغا صاحب کی نظم پر اگر کوئی اور نام بھی ہوتا، تو میں کہتا کہ یہ نظم وزیر آغا کی ہے۔ نام غلطی سے کسی اور کا لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ نظم ان کی دیگر نظموں سے موضوعاتی سطح پر کچھ مختلف ہے کیا یہ "مرگ پیش آگاہی" کی نظم ہے؟ جی نہیں مانتا کہ ایسا ہو، لیکن جب یہ سطریں دیکھتا ہوں تو شک یقین میں بدل جاتا ہے۔

آ خدا آ

مجھے میرے بدن کے اس جہنم سے رہائی دے
مجھے آزاد کر مجھ سے!

شاعر کے اندر کئی واحد متکلم پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ شاعر اپنی ہی ذات کے تقاضے سے "اس چھوٹے" کو بلند آواز سے بلائے جو آتا ہے تو "تقاضہ کرتے ہیں!" ممکن ہے یہ ایک جزوی لمحے کا شعری اظہار ہو۔

دوسری نظم خود صدیقی صاحب کی ہے۔ رجائیت سے بھرپور۔ وزیر آغا صاحب کی نظم کے برعکس اس میں جہنم داشت خود اعتمادی ہے۔ بلا ریب وشک جیتے رہنے کی تمنا ہے، تا کہ "خیالوں کی تازہ آکسیجن" سے وہ نئے مفہوم کے اشعار کہہ سکیں...... کہا تھا نہ میں نے کہ مجھے کچھ عجیب سا لگا ان دو متضاد المعنی نظموں کو پڑھ کر!

مجھے فیصل عظیم کی مختصر نظم "تین رخ" بھی پسند آئی۔ ضمیر، روح اور خدا کی حیثیت میں الجھا ہوا انسان صرف یہ استفسار کرتا ہے کہ کیا وہ اس بڑے جنگل میں مقید ہے اور کیا یہی اس کا مقدر ہے؟ یا کوئی راہ فرار بھی ہے۔ ترنم ریاض کی کہانی بہت پسند آئی۔

(ستیہ پال آنند)

برادرم گلزار جاوید! مزاج؟

"چہار سُو" کے ہر شمارہ کو کسی اہم ادبی شخصیت کے نام منسوب کر کے، جس محنت سے آپ اس کی شخصیت اور فن کو اجاگر کرتے ہیں۔ مجھ سمیت دیگر اہل قلم بھی اسے سراہ چکے ہیں۔ آپ کی مساعی اس معیار پر ہوتی قابل قدر ہے کہ "چہار سُو" کو آپ نے مالی منفعت یا پبلک ریلیشنگ کا ذریعہ بنانے کی کوشش نہ کی نہ جانے آپ شمارہ کا یہ کام کس طرح سرانجام دے لیتے ہیں کیونکہ "چہار سُو" میں اشتہارات بھی برائے نام ہی ہیں۔

آپ کی اس لگن کا میں قائل تو تھا ہی مگر اب میں مزید قائل ہو گیا ہوں۔ ہوا یہ کہ مجھے جناب افتخار امام صدیقی مدیر "شاعر" (بمبئی) کا خط ملا کہ وہ میرا ایکشن بنانا چاہتے ہیں اور میں انہیں اپنے بارے میں ضروری مواد ارسال کروں ابھی میں انہیں کچھ ارسال نہ کر پایا تھا کہ ایک اور خط ملا جس میں لکھا تھا کہ ایکشن کی اشاعت کے معاوضے کے طور پر میں انہیں پندرہ ہزار روپیہ انڈین مالیت کے ڈرافٹ یا پونڈز اس بینک کے ذریعے بھجوادوں۔ قطع نظر اس امر کے کہ پندرہ ہزار میری دو ماہ کی پنشن کے برابر ہیں۔ شہرت اجرت کا سوری کی خریداری میرے مزاج کے منافی ہے پندرہ ہزار تو کیا اس کام کے لیے تو میں پندرہ پیسے بھی نہ خرچ کروں۔

ایک وہ ہیں اور ایک آپ ہیں کہ قرطاس اعزاز چھاپ کر بلا معاوضہ خاصی تعداد میں پرچوں کا تحفہ بھی دے دیتے ہیں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔

(ڈاکٹر سلیم اختر)

محبی جناب گلزار جاوید، تسلیم!

"چہار سُو" کا تازہ شمارہ یوگیندر بہل تشنہ صاحب کے توسط سے موصول ہوا۔ شکریہ!

اس مرتبہ آپ نے نند کشور وکرم اور مالک رام پر گوشے شائع کر کے گویا فرض کفایہ ادا کیا ہے۔ وکرم صاحب میرے بھی بہت عزیز دوست ہیں اور ایک بیباک، غیر متعصب اور روشن خیال ادیب کی حیثیت سے وہ ایک بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ اس بار انہوں نے گلڈریولے، اشفاق احمد پر ایک دستاویزی کتاب شائع کی ہے جس پر عالمی اردو ادب کا ٹائٹل دیا ہوا ہے۔ عالمی اردو ادب کی پابندی سے اشاعت ہی ان کا ایسا وقیع کارنامہ ہے جو مستقل حیثیت کا حامل ہے اور اس کی افادیت آج ہی نہیں آئندہ زمانوں میں بھی قائم رہے گی۔ حیرت ہے کہ ۸۷ سال کی عمر میں بھی ان کا قلم جوان ہے اور ان کے افکار تازہ ہیں۔

میں ان کی درازیٔ عمر، صحت مندی اور سلامتی کا خواہاں ہوں۔

(نامی انصاری)

جناب گلزار جاوید صاحب۔

جب سے "چہارسُو" (مئی جون) ملا ہے، بار بار پڑھ رہا ہوں۔ تند کشور وکرم صاحب کے بارے میں اتنا کچھ جان لیا ہے کہ "بے خبری" جاتی رہی۔ انہوں نے اپنے خط بنام "چچا سام" میں بڑی سلیس زبان میں مدعا بیان کیا ہے وہ حصہ زیادہ دلچسپی سے پڑھا جس میں انہوں نے تیس برس کی جنگ کی تاریخ بیان کی ہے۔ اب تو عراق کو جاتے دیکھ کر ورق ورق سے خون ٹپکنے لگتا ہے۔ "بَرملا واست" پڑھا۔ بہت سی ایسی باتوں کے بارے میں مجھے اس سے پہلے معلوم نہ تھا۔ "سُکھ کی سوچ" دیویندر ستیارتھی کے بارے میں دلچسپ، دلپذیر اور جامع تحریر ہے۔ منیر الدین احمد کا افسانہ (تقریباً) پڑھ لیا ہے۔ خوب ہے۔ مالک رام سے متعلق قرطاسِ احترام بھی جامع و مستند اور بہت معلومات افزا ہے۔ "تحقیقِ عصر" میں "سخن" پر اظہار رائے کا شکریہ۔ "رَس رابطے" موثر اور گہرے ہیں۔ میں عموماً مدیر کے نام خطوط پہلے پڑھ لیتا ہوں۔ دلچسپی ہے۔ یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ پرچہ کون کون پڑھتا ہے اور کہاں کہاں پڑھا جاتا ہے۔ کتنے پڑھنے (خط لکھنے والے) اعزازی ہیں اور باقی خطوط پر قیاس کرنے سے اشاعت تک جیتی پرچے کی ارتقا اور بقا کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس حصے میں ناچیز کا عریضہ بھی شامل ہے۔ یہ تو آپ ہی کے لئے تھا۔ عام قاری کو الجھن ہوگی۔ مگر شاید میں نے ڈاکٹر انور سدید کے مراسلے سے نسبت دیتے ہوئے "تجزیہ" کا مکمل کرلیا ہو۔

(مقصود الٰہی شیخ)

عزیز و محترم گلزار جاوید! السلام علیکم۔

محترمی ڈاکٹر تشنہ کی وساطت سے "چہارسُو" کا جنوری، فروری ۲۰۰۷ء کا شمارہ موصول ہوا، شکریہ قبول کیجئے۔ "چہارسُو" بے حد جاذبِ نظر ہے۔ بید قیمتی نگارشات سے مزین ہے۔ اس شمارے میں یگانہ روزگار محقق اور نقاد ڈاکٹر وحید قریشی سے متعلق بھرپور گوشہ بے حد جاذبِ نظر ہے۔ موصوف کا انٹرویو اور اُن کی ادبی اور تحقیقی تحریریں اُن کی شخصیت اور کارناموں پر خاصی روشنی ڈالتی ہیں۔ شخصی طور پر بھی وہ علمی، دردمندی اور انکسار کی تجسیم ہیں۔ پاکستان کے دورے کے دوران اُن سے ملاقات کا نقش آج بھی دل پر کندہ ہے، اپنے گلے لگا کر انہوں نے کہا کہ وہ میری ہر چیز کو پڑھتے ہیں اور مجھے مبارکباد دی۔

موصوف کے بارے میں ایسا جامع گوشہ مرتب کر کے آپ نے ادبی اقدار کو سر بلند کیا ہے۔ مبارکباد!

(حامدی کاشمیری)

محترم گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

پہلے بھی لکھ چکا ہوں آپ کی تخلیقی لگن اور سرگرمیاں اور مدیرانہ کاوشیں قابلِ قدر ہیں۔ میں ان کا احترام کرتا ہوں۔ "قرطاسِ اعزاز" اور "قرطاسِ احترام" خوب سلسلے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں آئندہ نسلوں کے کام آئیں گے۔

"چہارسُو" کے لئے مزید ترقی اور پذیرائی کی دعاؤں کے ساتھ

(قیوم راہی)

میرے گلزار، دعائیں۔

"چہارسُو" بابت مئی جون باصرہ نواز ہوا۔ (مارچ، اپریل) کا شمارہ سوالیہ نشان بن کر رہ گیا۔ اس مرتبہ قرطاسِ اعزاز پر ہمارے دوست تند کشور وکرم آپ کی گرفت میں آگئے۔ ایسے بھی نیک سیرت خوش خلق بھی زمانے میں اب شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔

آپ کا بَرملا واست اور اُن کا چچا سام کے نام خط بھی خوب ہے۔ اور دیویندر اسر صاحب کا یہ عشق نہیں آساں، اور شرف عالم ذوقی کا تیر انہوں کی دنیا، تند کشور وکرم کا انیسویں ادھیائے پر تبصرہ بھی خوب ہے۔ تند کشور وکرم کا افسانہ آتم پرجن پسند آیا۔ جو آج کل کے ماحول کی بزرگوں کے ساتھ زیادتیوں کی المناک داستاں لئے ہے۔ اور ان کا مضمون دیویندر ستیارتھی پر اس سے پہلے بھی چہارسُو میں پڑھا ہے۔ کرشن کمار طور صاحب کے ماہیے اچھے لگے مگر اسے "ٹوپاسی" تبدیلی دے کر پنجابی میں لکھ دیتے تو زیادہ اچھا لگتا کیونکہ کم و بیش لہجہ پنجابی ہی ہے۔ وزیر آغا کا یہ شعر اچھا لگا "ڈکھیری اپنی کہانی سنا دی ہم نے تو دیکھا اسے شخص تجھے کیسی سزا دی ہم نے"۔ غزلیں اور نظمیں اچھی لگیں۔

مشتاق انجم کی "روشنی" افسانہ بہت اچھا لگا۔ لیکن روش اگر عام ہو جائے تو یہ دنیا کس قدر حسین ہو جائے۔ "شناخت پریڈ" روشن دماغی کے دعویداروں کے دلوں اور دماغوں میں تعصب کی آگ بھڑکا دی تھی۔ اور بار بار سوچنے غور کرنے اور ایک دوسرے کے دریافت کرنے کے بعد اُن کو اپنی شناخت، اپنی بنیاد، اپنی فہرست اپنے وطن کی بابت تسلی بخش جواب سجھائی نہ دیتا تھا۔ کس قدر درد اس میں نہاں ہے۔ آپ کا افسانہ پڑھ کر ایک عجیب سا دھکا لگا۔ آپ بن کچھ کہے اتنا سب کچھ کہہ گئے اور انگشت نمائی کی نوبت ہی نہیں آئی۔ خوب نبھایا ہے۔ اور پھر اُردو آپ کی اور آپ کے ملک کی زبان ہے ہم لے ٹھیک کیا کریں گے۔

مالک رام صاحب پر آپ کا قرطاسِ احترام بھی خوب ہے۔ اُن کا مضمون سدا بہار تخلیق کار پسند آیا۔ ماجد سرحدی کا "سب سے پہلے پاکستان" اگر ہندوستان بھی لکھا ہوتا جب بھی موزوں ہے۔ ہر دو ملکوں میں یہی کیفیت ہے۔ تحسین ماہتاب میں ستیہ پال آنند صاحب کی نظمیں دھو دے گئیں۔ اُن کی پنجابی کی غزلیں بھی اچھی لگیں۔

(یوگیندر بہل تشنہ)

بھائی گلزار جاوید صاحب، آداب

آپ کی عنایتوں کا شکریہ کس طرح ادا کیا جائے۔ اتنی محبت، اتنا خلوص اللہ اللہ۔ خدا آپ کو صحت مند و سلامت رکھے آمین۔

"چہار سُو" مل رہا ہے۔ میرے نکمے پن کے باوجود مل رہا ہے۔ پڑھتا ہوں اور آپ کی محنت و صلاحیت کی داد دیتا ہوں۔ آپ کی پیروی میں گوشے تو اور رسائل بھی لگا رہے ہیں لیکن آپ نے جو طرز اختیار کی ہے وہ آپ کی اپنی ہے۔ اہم اور منفرد۔ آئندہ تحقیق کار خوب فائدہ اٹھائیں گے اور آپ کو دعائیں دیں گے۔
(نکہت بریلوی)

محترم گلزار جاوید صاحب السلام علیکم۔

"چہار سُو" شمارہ جنوری فروری ۲۰۰۹ء بصورت ہوا۔ گوشہ ڈاکٹر وحید قریشی خوب ہے اس شمارے کی آن بان شان ہے۔ سونے پر سہاگا میری غزل بھی شائع کی گئی ہے۔ شکریہ کرم مہربانی۔ نجمی معروف نجمی معطر، وفیک قمر نجمی آفتاب جیسے آپ نے رنگ برنگے کئی عنوانات دیے ہیں ان رنگوں کی خوشبو مہک دل و دماغ کو معطر کر دی ہے۔ آپ کا یہ انداز قابلِ تحسین ہے۔ کئی افسانے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ متعدد غزلوں کے اشعار بھی پسند آئے۔ سچ تو یہ ہے کہ بھی شعرا کا کلام انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہے جو متاثر کن ہے۔ میرے پاس آنے والا یہ دوسرا شمارہ ہے تشنگی ہے کہ اور بڑھ گئی ہے پتہ نہیں اگلا شمارہ اور کتنا حسین ہوگا۔ آنے والے شمارے کا انتظار ہے اس وقت کے اچھے اور سچے دانشمند فنکار آپ کے ساتھ ہیں۔ اس پر آپ کی امامت کیا کہنے....!!
(حفیظ انجم کریم نگری)

محبی بھائی گلزار جاوید صاحب! آداب و خلوص۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے نام "چہار سُو" نکال کر آپ نے حق ادا کیا ہے۔ سرورق پر ان کا مسکراتا چہرہ اور دل کو چھو لینے والی علمی نگاہیں دور تک کچھ تلاش کر رہی ہیں۔ امکان نامہ میں وحید قریشی کے تازہ اشعار پڑھ کر ملکہ پکھراج کو یاد کر رہا ہوں۔ "ابھی تو میں جوان ہوں" اللہ کرے جیتے کھیلتے سو برس پار کریں.... آمین! صفحہ 36 پر بلاک پر تاریخ غلط چھپی ہے۔ 13 سے شروع براہِ راست دو تین ورق الٹنے کے بعد ورق گردانی کی اور کچھ غزلیں پڑھیں۔
انور سدید کی غزل سے چن سو ملیا:

یہ اوپر سے اشارا آ رہا ہے
زمانہ پھر ہمارا آ رہا ہے

انور صاحب شاید پڑھنے کی بات کر رہے ہیں غالب نے بھی کہا تھا:

سب کہاں کچھ لالہ و گل نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

مقطع بھی خوب ہے:

ترے قد سے بہت لمبا ہے انور
ترے پیچھے جو سایا آ رہا ہے

انور صاحب کے پیچھے پیچھے خاکسار بھی آ رہا ہے:

سایہ سر کرنے چلے ہم ڈوبے منجدھار
پاؤں مرے اس پار تھے سر میرا اُس پار

(بھگوان داس اعجاز)

محترم گلزار جاوید صاحب، مزاجِ گرامی قدر۔

پرچہ نظر نواز ہوا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کو اللہ تعالیٰ صحت اور زندگی سے نوازے بہت ہی کمال کے آدمی ہیں۔ تمام زندگی اردو ادب کے لیے وقف کر دی اور اب تک کام کیے جا رہے ہیں۔ ابرار و شہاب صفدر، جواز جعفری، حنیف ترین، حمیدہ معین رضوی، غفار بابر، اکرام تبسم بھی لوگ بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ علیم صبا نویدی صاحب بھی اُردو ادب کی بہت خدمت کر رہے ہیں۔ بہت ہی محنتی اور مخلص تخلیق کار ہیں۔ خدا کرے ان کے قدم اور قلم میں روانی رہے۔

مشکور یادو صاحب، محسن احسان صاحب، مرتضیٰ برلاس صاحب، کرشن کمار طور ہمارے سینئرز ہیں۔ ان کی تخلیقات سے پرچہ بچ جاتا ہے۔ "قرطاسِ اعزاز" سے "رس رابطے" تک عمدہ، دلچسپ، جامع اور موثر جریدہ ادب "چہار سُو" ایک تحفے سے کم نہیں ہے۔
(کرامت بخاری)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم

مزاج بخیر۔ "چہار سُو" ملا۔ آپ کے ادارے کے اراکین کی کاوشوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ وکرم جی کی خدمات، تخلیقات، براہِ راست اور حمد و نظم خوب ہیں۔ آپ جس طرح پاک و ہند کے ادبا کو دل قلم کے ذریعے قریب کر رہے ہیں اچھا ہے۔ دونوں سرکاروں کو چھوڑیں۔ ان کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ "تخلیق اعزاز شخل" (ادبی اور سماجی ادارہ) کے زیرِ اہتمام ہر ماہ کے تیسرے جمعہ کی شام احباب حیات آباد میں مل بیٹھتے ہیں۔ کبھی موقع ملے تو مہمان نوازی کا موقع دیں۔
(ماجد سرحدی)

میرے بہت ہی محترم دوست اور پیارے بھائی! السلام علیکم۔

رسالہ پڑھنے سے پہلے میں نے آپ کا مختصر لیکن محبت اور پیار سے لبریز خط پڑھا۔ خط پڑھنے کے بعد کافی دیر تک مجھ پر سرشاری اور محویت کی کیفیت طاری تھی۔ میں کچھ نہیں پا رہا تھا کہ اس پیار اور خلوص پر مبنی خط کا جواب کس طرح لکھوں۔ میں نے اپنی بیوی کو خط پڑھنے کے لئے دیا تو انہوں نے خط پڑھنے کے بعد مجھ سے کہا کہ ایسے اچھے خط تو آپ کے پاس بہت کم آتے ہیں۔ بہرحال مجھ سے تو اتنا پیارا خط نہیں لکھا جاتا پھر بھی کوشش کر رہا ہوں۔ اللہ رب العزت آپ کو ایک طویل اور کامیاب زندگی عطا کریں اور آپ اسی طرح خلوص اور محبت کی دولت لٹاتے رہیں۔ ایسے پیارے لوگ اللہ کی

زمین پر خوشبو کی مانند ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے درد کے رشتے قائم و دائم ہیں۔ جزاک اللہ۔

تازہ شمارے میں دو گوشے ہیں۔ ایک کا تعلق نند کشور وکرم سے ہے اور دوسرے کا مانک ٹالا سے۔ دونوں بہت عمدہ اور معلوماتی ہیں۔ دیگر مضامین، کہانیاں، نظمیں اور غزلیں بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ رسالہ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے جاذبِ نظر ہے۔ خطوط کا حصہ بہت قیمتی ہے۔ اسے پڑھ کر آپ کی شخصیت کی قدر و قیمت کا پتہ چلتا ہے۔ (محمد ایوب واقف)

محترم و مکرم گلزار جاوید صاحب! سلام و رحمت۔

"چہارسُو" کا تازہ شمارہ حسبِ سابق آپ کی عنایات کی سوغات کی صورت موصول ہوا۔ آپ کی خصوصی کرم فرمائی۔ قرطاسِ اعزاز نند کشور وکرم کے نام منسوب کر کے آپ نے اُن کی تحریک، ادبی شخصیت اور اُن کی خدمات کا بجا طور پر اعتراف کیا ہے۔ براہِ راست کے تعارفیہ میں آپ نے نہایت عمدگی اور اختصار سے موصوف کا شخصی خاکہ پیش کر دیا ہے۔

اردو کی متاعِ گم گشتہ جناب مانک ٹالا کو خراج پیش کرنے کی کاوش بھی نہایت صائب ہے لیکن تمام تر مسائل ہی چہارسُو کا امتیازی وصف ہیں اور اس کی یہی ادا ہی سب سے جدا ہے۔ (ڈاکٹر غفور شاہ قاسم)

محترم گلزار جاوید صاحب۔ سلام مسنون

چہارسُو کا تازہ شمارہ مئی جون 2007ء باصرہ نواز ہوا۔ اس مرتبہ قرطاسِ اعزاز اس شخصیت کے نام ہو کام پر مشتمل ہے جو اردو دنیا کا ایک معتبر اور ممتاز قلم کار ہے۔ نند کشور وکرم پر میں پہلی بار اتنا مفصل تحریریں پڑھوں گا۔ آپ مبارکباد کے لائق ہیں جو گوہرِ ادب سے جواہر چن کر لاتے ہیں۔

قرطاسِ احترام میں اردو دنیا کی ایک ممتاز ہستی مانک ٹالا پر بھی ہے۔ مانک ٹالا بھی حقیقتاً ادب کا ایک موتی ہے ایسا موتی جس کی چمک سے ایوانِ اردو جگمگا رہا ہے۔ دونوں صاحبانِ قرطاس و قلم کے بارے میں آپ کی تحریریں میری معلومات اور استفادہ کے لیے پیش بہا ہیں۔

(سید معراج جامی)

محترم گلزار جاوید صاحب!

تازہ "چہارسُو" نظر نواز ہوا۔ اس عنایت کے لیے آپ کا بے حد شکرگزار ہوں۔ نند کشور وکرم اور مانک ٹالا کے حوالے سے آپ نے بھرپور گوشے شاملِ اشاعت فرمائے ہیں۔ انہیں پڑھ کر یقیناً معلومات میں معتدبہ اضافہ ہوتا ہے۔ آپ کی محنت، ہمت اور لگن قابلِ داد ہے۔ "رس رابطے" کے مطالعے سے معلوم ہوا اس سے پیشتر کا شمارہ ڈاکٹر وحید قریشی کے حوالے سے تھا۔ قریباً ہر مکتوب نگار ڈاکٹر صاحب موصوف کی توصیف میں رطب اللسان ہے۔ جب ڈاکٹر صاحب گورنمنٹ کالج میں تھے تو ان کی رہائش گاہ پر اکثر مشاعرے ہوتے تھے۔ میرا ابتدائی دور تھا۔ میں بھی اُن مشاعروں میں شریک ہوتا تھا۔ ایک مشاعرے میں ڈاکٹر صاحب نے جو غزل پڑھی اُس کے دو شعر مجھے آج بھی یاد ہیں:

داغِ دل کی سنا دی ہم نے
آگ محفل میں لگا دی ہم نے
قیس و فرہاد کے قصے چھوڑے
داستاں اپنی سنا دی ہم نے

(سجاد مرزا)

مدیرِ محترم! سلام مسنون۔

'چہارسُو' کے ہر شمارے کا انتساب ہی خوبصورت و فکر انگیز ہوتا ہے۔ مئی جون کے شمارے کی بہت نمایاں خصوصیت اس کا بیک وقت قرطاسِ اعزاز و قرطاسِ احترام پر مشتمل ہونا ہے بالعموم زبانیں قوموں کی نمائندہ اور تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہیں اس حوالے سے موجودہ شمارے کی علمی و ادبی شخصیات اُردو زبان و ادب سے نہایت گہری وابستگی و غیر معمولی لگاؤ کے باعث مقامِ احترام و اعتبار کا استحقاق لیے ہوئے ہیں.....!

اُردو کے فروغ و ترقی کی بابت بین الاقوامی صورتِ حال نیز بھارت میں اس کے مستقبل سے جڑے ہوئے جملہ پہلوؤں پر جناب نند کشور وکرم کا رجائی نکتہ نظر قابلِ ستائش اور باعثِ ترغیب بھی ہے۔ "من کی موج" سے ستیارتھی جی کا لوک گیتوں کو جمع کرنے کا غیر معمولی کارنامہ اور اُردو ہندی کے منفرد اسلوب کے کہانی کار سے تعارف پایا جس کا اگر فقدان ہو یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال کی الہام و تفہیم سے اُن میں نیا ولولہ و عزم پیدا ہوا "حسینی وقت" سے ادارتی اشاعتی، تحقیقی و تخلیقی سطح پر کارہائے نمایاں، کامیابیاں اور اعزازات سے متعلق معلومات پائیں۔ "اکیلے آدمی کی کوشش" کا یہ تجزیہ بجا محسوس ہوا کہ وکرم جی کا ناقدانہ اور تخلیقی جذبہ اچھی تحریر کے ساتھ کھڑا ہے جن نامور ادیبوں کے متعلق بالخصوص علم ہوا انہیں پردۂ سیمیں پر منتقل کرنے کے لیے منتخب کیا گیا۔

مانک ٹالا جی کی شخصی و فنی زندگی کے مختصر مراحل اعزازات و تخلیقات سے آگہی کے بعد معیاری تخلیق نگار سے "عشق پریم چند" کی تدریسی و تخلیقی جہتیں خوبصورتی سے منعکس ہوئیں نیز اُن پر تحقیقی تصنیفات کا تفصیل سے ذکر پایا۔ زرد رنگ اور گرد و غبار کی بازگشت کے ساتھ اُن کا افسانہ "کفن" اپنی فنکارانہ پیشکش کے باعث گہرے نقوش ذہن پر مرتب کرتا ہے۔ مانک ٹالا جی کی "ست رنگ" کا افسانہ اپنے مرکزی کردار کے گہرے مطالعہ و مشاہدے سے کہانی کے ساتھ خاکہ نگاری کا لطف بھی دیتا ہے۔ اُن کے صداقت شعار قلم کار پریم چند جی کے علاوہ مولانا عبدالحق اور ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کا موثر و بھرپور خراج بھی لائقِ توصیف و تعریف ہے جس سے مزاجاً ان کی اعلیٰ ظرفی و وسیع النظری مترشح ہوتی ہے۔

چند نظمیں.... تھوڑا وقت لگتا ہے' کفرکی' اعتراف' سب سے پہلے پاکستان' نیم کا درخت' چلو ہم بھول جائیں' ایک پرندہ اور گھر سے گھر تک راستے متاثر بھی کرتی ہیں اور محظوظ بھی۔ اور وکٹ پڑھنے کی تحریک غلام عباس صاحب کے شہرۂ آفاق فسانے سے مماثلت پہ ہوئی کو کرداروں کے یہاں علامت کے طور ناظر کو دھاکے کی خاطر رکھے کے لئے استعمال کیا گیا جبکہ اختتام میں اس کا نیا کہانی کو تحیر و تجسس سے دوچار کر دیتا ہے جبکہ اس کا دلچسپ ابتدائیہ اور قومی لباس کا خاطر پس منظر میں قاری کے مطالعے کے ساتھ ہم سفر رہتا ہے۔ مثلاً صحت پریشے.... میں ملکی اضافیاں' بیرون ملک جانے کے جواز' طبقاتی مسائل' لسانی تفرقات' نائن الیون کے تناظر میں غیر ملکیوں بالخصوص مسلموں کا عدم تحفظ و تضحیک' سماجی رویوں' معاشرتی رجحانوں اور سیاسی تجزیہ گیری کی منظر نگاری عکاسی ہے نیز گمشدہ ماضی' دسترس سے باہر حال اور دھندلا مستقبل کوشش کے باوجود.... شناخت کو مشکل ہی نہیں کبھی ناممکن بھی بنا دیتا ہے۔

غزلیات کے کچھ اشعار جو نظموں حقائق کے عکاس اور منفرد زاویوں سے آس پاس لگے لطف انگیز و مسرت آمیز رہے۔ سب بچھاڑ کے لے گیا جو کچھ تھا میرے پاس رکھے کو یوں تو ایک ہی جھوٹا ہوا کا تھا۔ زبیر کجاہی۔ ہر تجربہ کے لئے ضروری ہے تازہ پھولوں سے دوستی رکھنا۔ ملک زادہ جاوید' تضاد' اس کے ہیں اسلوب و طرز میں اپنے یقین کا شائبہ شامل ہے۔ اقبال کے ساتھ مشتاق شبنم' اپنے گھر کا پتہ بتاؤں کیا' آٹھ نسلوں سے میں سفر میں ہوں۔ فیصل عظیم' اک دریدہ جسم کو بس خاک صحرا ہی تھی کم/ سائبان بکھری تھا اک کھلے سر کے لیے۔ پروین حیدر' کر دیا مجھ کو مری کمزوریوں نے زود رنج/ ہو سکے تو دوست کم کم مسکرانا چاہیے۔ شہاب صفدر' میں اپنی موت سے پہلے جہاں میں/ کوئی پودا لگانا چاہتا ہوں۔ پرویز ساحر' اب تو یوں لگتا ہے گردش پیہم جیسے/ عمر ساری کسی خیمے میں بتا دی ہم نے۔ وزیر آغا' زندگانی کی کہانی لکھ ہی دی/ لوگ کیا سوچیں گے مت سوچیں ذرا۔ شبنم شکیل' کس قدر مہربان ہے فطرت/ وقت سا اندمال رکھتی ہے۔ اکبر حمیدی' بوٹے رہے بھونکے دیے ہم زمیں میں/ خورشید آسمان پہ بجے چلے گئے۔ جلیل عالی' ہم نے پلکوں پہ اُن کو روک لیا/ یوں بھی کو ہرانا نہیں سکتے۔ انوار فیروز' دو سے ہی لطف لہروں کا بھی لیا ورنہ پھرا دیتے ہی آنکھوں میں بھرتی ہے سمندر کی ہوا۔ غالب عرفان' امیر شہر کی دنیا بڑی حسین لیکن/ قریب سے چھوٹی دکھائی دیتی ہے۔ قیصر نجفی' یوں سکرا کے ملتا ہے جیسے پڑھ رہا ہو کوئی کسی کتاب پہ کتبہ ہے۔ تبصرہ خیال آفاق' شاعری کے عنوانات میں تنوع کے ساتھ اس مرتبہ تخلیق کاروں کے ناموں کے ساتھ ہستیوں کا تعارف بھی کیا کون کرۂ ارض کے کس حصے پر اقامت پذیر ہے' حساب دوستاں' کو شرمندگی سے بچا لیا گیا۔ تخلیق عصر' میں مخزن 6 ' سے تعارف پایا۔ جواز جعفری صاحب کو گلوبل تناظر سے مماثل موضوع پر ڈاکٹریٹ کرنے کی مبارکباد اور محترمہ ڈاکٹر ستیہ پال

آنند اور ان کی اہلیہ کے لئے دعائے خیر و صحتیابی۔ (شگفتہ نازلی)

محترم گلزار جاوید صاحب' السلام علیکم۔

تازہ چہارسُو ملا' افسوس اس میں آپ نے ملک زادہ منظور صاحب کی جو غزل شامل اشاعت کی ہے اس میں کتابت کی مندرجہ ذیل اغلاط در آئی ہیں۔ جو میرے خیال میں ''ان پیج'' سے اردو میں منتقل کرنے کے باعث ہوئی ہیں۔ مطلعے کے دوسرے مصرعے میں ''رقص صبا'' کی جگہ ''رخ صبا'' جب کہ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں ''زیادہ'' کو ''زدہ'' لکھا گیا ہے تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں ''کرے ہوگا'' کو ''کرکے ہوگا'' ہو گیا ہے پانچویں شعر میں ''بہ نوع'' کی جگہ ''نوع'' تحریر ہوا ہے۔

برائے کرم آمدہ شمارے میں ان اغلاط کی نشاندہی ضرور فرمایئے کیونکہ کتابت کی غلطیوں کے باعث کلام اور شاعر پر حرف آنے کا امکان ہوا کرتا ہے۔ (ملک زادہ جاوید)

عزیز گلزار جاوید۔

''چہارسُو'' باقاعدہ ملتا ہے اور صدق دل سے ہر شمارے پر آپ کی زندگی اور تندرستی کی دعا نکلتی ہے۔ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جب مولانا صلاح الدین احمد نے ڈاکٹر وزیر آغا کی ادارتی شراکت کے ساتھ ''ادبی دنیا'' کے دور پنجم کا آغاز کیا تو اس کا پہلا شمارہ ساڑھے تین سو صفحات کا تھا اور اس کی قیمت صرف ایک روپیہ تھی۔ ایک ہزار کا ایڈیشن ایک ہفتے کے اندر اندر غائب ہو گیا۔ مولانا نے ''ادبی دنیا'' کا دوسرا ایڈیشن چھاپا' وہ بھی ہفتے دس دن میں ختم ہو گیا تو ملک کے ایک شاعر نے ''سہل ممتنع'' کی صدائیں بلند ہوئیں تو مولانا نے ان پر کان نہ دھرے۔ یہ دست کہ ''سالمی کیا تمنائیں کے لئے'' اس کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اس کا خیال مجھے پچھلے سال جب میں نے ''چہارسو۔ سر بہ سفت نظر ہوں....'' کی صورت دیکھا تو خیال آیا۔ میں نے آپ کے ایثار کی وجہ قدر دانی زمانہ قرار دے کر ایک مختصر خط میں اپنے تاثرات سے آپ کو آگاہ کیا۔ اچھا کیا آپ نے اگلے شمارے میں میرا خط شائع نہ کیا۔ ''چہارسُو'' کی اشاعت میں جو جذبہ آپ کے دل میں کارفرما ہے وہ وہی ہے جو مولانا صلاح الدین احمد کا تھا۔ ان کے نزدیک یہ ''صدقہ جاریہ'' ہے جسے وہ اپنی زندگی میں برقرار رکھنا چاہتے تھے مگر عمر نے وفا نہ کی۔ مرحوم کو ریڈیو کی تقاریر اور کتب فرہنگی کے تراجم سے جو ملتا تھا' وہ ادبی دنیا کی اشاعت پر صرف کر دیتے تھے۔ آپ کی بھی یہی صورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے برقرار رکھے۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ میں نے سرورق سے لے کر آخری خط تک پڑھا ہے۔ ''قرطاس اعزاز'' اور ''قرطاس احترام'' دونوں گوشے دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔ ہندوؤں میں ''جستی برہمن'' آج کے قارئین کے لئے ایک انکشاف ہوگا مگر میری عمر کے لوگوں کے لئے یہ نئی بات نہیں۔ میرا آبائی گھر

سیالکوٹ چھاؤنی کے قریب "مجر تھ سادات" میں ہے۔ بچپن میں ایک ہستی ہر تین سال کے بعد ہمارے گاؤں آیا کرتے تھے۔ وہ بڑے خوش الحان تھے۔ واقعہ کربلا سے متعلق اپنا اُردو کلام سناتے تو مردوں کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ پاکستان بننے کے بعد بھی وہ ایک سال تشریف لائے۔ غالباً انہوں نے ہجرت نہیں کی تھی۔ سیالکوٹ شہر میں ایک ڈاکٹر دت تھے۔ بھائی جان غلام الثقلین نقوی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ وہ بڑے مخیر تھے۔ ایک چھوٹی سی صندوقچی ان کی میز پر پڑی رہتی تھی۔ مریض سے جو روپے کے پیسے لیتے ان میں سے کچھ حصہ اپنی صندوقچی میں ڈال دیتے۔ ہمارے وہ خاندانی معالج تھے۔ بھائی جان نے ایک دن اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ صندوقچی جب بھر جاتی ہے تو اس کی رقم مذہب وملت کا خیال رکھے بغیر مستحقین میں بانٹ دیتا ہوں۔ راہب اور ان کے بیٹوں کی شہادت کا ذکر واقعۂ کربلا کے فریقین کے راویان کے "مقاتل" میں یکساں ملتا ہے۔ نند کشور وکرم کے کردار میں کشادہ دلی، بے تعصبی اور وسعت نظری ہستی ہر دو واقعوں سے نسبت کی مرہون منت ہے۔ نند کشور وکرم بہت اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔ "چہارسُو" کے کسی گذشتہ شمارے میں میں نے ان کا افسانہ پڑھا تھا۔ ان کے کردار کی طرح ان کا افسانہ بھی انسان دوستی کی خوبصورت مثال تھا۔ گوشہ میں شامل ان کا افسانہ "آتم پوجن" زبردست طنزیہ ہے۔ مانک ٹالا کو میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ایک عرصے سے جانتا تھا ایک محقق کے طور پر ان سے اب شناسائی ہوئی ہے۔ پریم چند کا بطور انسان ان کا تعارف اچھا مضمون ہے۔ مانک ٹالا کا افسانہ بھی خوب ہے۔

اس دفعہ "چہارسُو" کا شاعری کا حصہ بڑا جاندار ہے۔ "قلبِ مجسم" میں صدیق شاہد، اسلم راہی، سہیل غازی پوری کی نعتیں اور کرامت بخاری کی نظم "آلِ محمد کا گھرانہ"، "حضور" اور اُن کی آل سے شعرا کا والہانہ اظہار کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ "نظم معریٰ" کے ذیل میں محسن احسان سے لے کر حنیف ترین تک سب کے سب غزل گو شعرا کی غزلوں میں ایک دو حاصل غزل شعر مل جاتے ہیں۔ ان میں وزیر آغا، محسن احسان اور انور سدید کی غزلوں کے تمام اشعار حاصل غزل قرار دیے جا سکتے ہیں۔ "سخن معتبر" میں نذیر کیانی سے گل محمد خان تک نئے پرانے شعرا کی غزلوں میں بھی کم و بیش وہی کیفیت ہے جو مذکورہ اساتذہ کے ہاں تھی۔ "نظم معریٰ" کے تحت خاتون غزل گو شبنم شکیل کی خوبصورت غزل شامل تھی۔ "سخن معتبر" میں محمد عثمان، پروین حیدر اور شگفتہ نازلی تین خواتین غزل گو شامل ہیں۔ سچ کہوں تو یہ تین غزلیں "سخنِ معتبر" میں صحیح معنوں میں خیال کی تازگی اور دلکش لہجے کے سبب عطر بیز ہیں اور اپنی خوشبو سے پہچانی جاتی ہیں۔ "سخن آفتاب" کے تحت چہارسُو نے اردو نظم کے تمام اسلوب جمع کر دیے ہیں۔ اس میں محسن احسان کے ہائیکو میں، ضمیر نوری کی رباعیات ہیں؛ یونس صابر کا اپنے دوست میر قربان علی اور شگفتہ نازلی کا منیر نیازی کی رحلت پر مرثیے ہیں۔ ماجد سرحدی کی مرحوم حبیب جالب کی طرز پر طنزیہ سیاسی نظم "سب سے پہلے پاکستان"، خیال آفاقی کی پابند نظم "اعتراف" اور یوگیندر بہل تشنہ کی پابند روایتی نظم "طلبِ دُنن" کے ساتھ ہمارے عہد کی پہچان "جدید نظمیں" "سخن آفتاب" میں شامل ہیں۔ سخن آفتاب میں پہلی نظم جناب وزیر آغا کی ہے۔ نظم کا عنوان "کون اس کو روک سکتا ہے"۔ "ہوا" کی علامت کا منظر بھی پیش کرتی ہے۔ علامتی نظم ہے اور معنی کی تہہ داری کی حامل ہے۔ جاوید شاہین کی "تھوڑا وقت لگتا ہے"، انور سدید کی "کھڑکی"، غالب عرفان "ایک منظر.... ایک پل"، سیفی سرونجی "نیم کا درخت"، فیصل عظیم "تین رُخ"، جواز جعفری "میں زمین کا وفادار ہوں"، سید تحسین گیلانی "رونے والا چہرہ لے کر"، علی آذر "چلو ہم بھول جائیں" اور شارق بلیاوی "ایک پرندہ" خوبصورت علامتی جدید نظمیں ہیں۔ "چہارسُو" میں جہاں جہاں کوئی خالی جگہ رہ گئی تھی۔ گلزار جاوید نے ان جگہوں کو بھی شاعری سے پُر کر دیا ہے۔ حامدی کاشمیری، کاوش پرتاپ گڑھی اور مولوی محمد اسلم وڈائچ کی غزلیں، کرشن کمار طور کے "ماہیے" اور بھگوان داس اعجاز کے "سپنے" کے عنوان سے وہ سب انہی خالی جگہوں کی زینت ہیں۔ سرگودھا کے مولوی محمد اسلم کا ذکر میں نے اپنے دوست حاجی نعیم جاوید سے کئی دفعہ سنا تھا۔ چہارسُو میں ان کی غزل پڑھ کر یقین ہوا کہ وہ پختہ فکر شاعر ہیں۔

"چہارسُو" میں افسانوں کا حصہ ہمیشہ بڑا جاندار ہوتا ہے۔ تازہ شمارے میں بھی بڑے خوبصورت افسانے شامل ہیں۔ قیوم راہی اور منیر الدین احمد سینئر افسانہ نگار ہیں۔ مشتاق اعظمی اور ترنم ریاض کو میں نے پہلی دفعہ پڑھا ہے۔ ترنم ریاض کے اپنے افسانے میں نیلوفر کی زبانی ایک عام سی گھریلو کہانی جس میں شوہر اپنی بیوی اور بیٹے کے ہوتے سوتے اپنی کزن کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ بیوی تو ایک طرف ننھا نبیل بھی اپنے باپ جمیل کی بے رخی محسوس تو کرتا ہے مگر re-act نہیں کرتا۔ یوں ماں بیٹا ذہنی تناؤ میں چار سال صبر و تحمل کے ساتھ گذار دیتے ہیں۔ جمیل کی کزن جب اس شہر سے چلی جاتی ہے تو جہاں جمیل کی پھر سے نارمل زندگی لوٹ آتی ہے وہاں نیلوفر اور نبیل کا جمیل کے ساتھ رشتہ بھی اس طرح بحال ہو جاتا ہے جیسے کبھی منقطع نہیں ہوا تھا۔ ترنم ریاض یقیناً مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک پامال موضوع کو "چاردن" میں نیا رخ دے کر افسانے میں تازگی پیدا کر دی ہے۔ افسانے کے پلاٹ اور اسلوب میں تال میل سے ترنم ریاض نے ایک خوبصورت کہانی تراشی ہے۔ مشتاق اعظمی کا افسانہ "روشنی" اپنی طرز کا انوکھا افسانہ ہے۔ افسانہ نگار نے خواجہ میر درد کے ضرب المثل شعر "درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو...." نہایت خوبصورت افسانوی پیکر عطا کیا ہے۔ روشنی، کرن اور شمع مرحوم شاہ محرم داس چوکیدار کی یتیم بچی کے تین نام ہیں۔ سنگ وہ لائے روشنی کہہ کر مر دو جیتے والی لے کرن

کے نام سے اور گاؤں کے نواب سکندر خاں نے شیخ سے موسوم کر کے اس کا تعارف اپنی بیٹی کے طور پر کرواتے ہیں۔ اس افسانے کی ڈرامائی تشکیل بھی ہو سکتی ہے۔ منیر الدین احمد کا افسانہ "اوورکوٹ" ان کے مخصوص اسلوب اور فن کا دلچسپ افسانہ ہے۔ دیارِ غیر سے منیر الدین احمد نے نہایت موثر اور فکر انگیز افسانے اردو ادب کو عطا کئے ہیں۔ قیوم راہی سینئر افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے "ستارہ ماں" میں دو لڑکیوں کی کہانی تخلیق کی ہے ایک لمحہ گھر گرہستی عورت کو گناہ پر آمادہ کر دیتا ہے تو دوسرے لمحے وہ اس کی ترغیب سے کسی سے مس نہیں ہوتی گویا خیر کا لمحہ شر پر غالب آ جاتا ہے۔ مختصر کینوس پر اچھی کہانی ہے.... گلزار جاوید! آپ کے افسانوں میں زبان و بیان کی تازگی کے علاوہ جدید نظم کی طرح ایک خوبی جو آپ کے ہر افسانے میں پائی جاتی ہے وہ کلامِ تمثیلی اور ابہام کی کارفرمائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے افسانے "شناخت پریڈ" کو میں نے دو دفعہ پڑھا ہے اس کے باوجود میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میں افسانے کی وہ تہہ جو آپ کے ذہن میں تھی اس تک پہنچ پایا ہوں۔ افسانے کا آغاز مالک مکان (میزبان) اور مکان کرایہ پر لینے کے خواہشمند مہمان اور وہ شخص جس سے کبھی میزبان نے مکان خریدا تھا اس سے سو فیصد مشابہت کی وجہ سے حیرت و استعجاب سے ہوتا ہے۔ ظاہر اس قدر مشابہت باپ بیٹے میں ہی ہو سکتی ہے۔ گویا مالک مکان (میزبان) نے "شناخت پریڈ" میں مہمان کو پہچان تو لیا ہے مگر اس کی تصدیق مہمان سے بات چیت کر کے کرنا چاہتے ہیں مگر افسانہ نگار اس بات کو اگر مہمان کی زبانی واضح کر دیتے تو افسانے کا وہ حسن جو اخفا میں تھا ضائع ہو جاتا۔ باپ بیٹے کی کہانی افسانہ نگار کے مزید تعلیم کے لئے برطانیہ جانے، حوری سے شادی، اسلام آباد واپس آ کر اٹھارہ گریڈ کی نوکری، بچے کی ولادت، اسے سکول میں داخل کرانے، دوسرے سیکٹر میں حوری کے مکان لینے کی ضد، معاشی حالات کی ناسازی، زبیر کا اپنی بیوی حوری اور بیٹے خسرو کو لے کر امریکہ میں جا کر بسنے، نیویارک میں 9/11 کا المیہ رونما ہونے کی وجہ سے روز روز کی توہین، تنگ آ کر پاکستان کی واپسی۔ اس سب کو افسانہ نگار نے بڑے اختصار سے بیان کرنے کے بعد زبیر کے بیوی بچوں کو اس مکان کے روبرو لا کھڑا کیا ہے جسے کبھی غیر معیاری قرار دے کر وہ امریکہ چلے گئے تھے۔ حوری مکان کا کرایہ اور ایڈوانس مالک مکان (میزبان) کے منہ سے سننے کے لئے بے قرار ہے اور میزبان مہمان سے اس کی بلندی/ پستی کی کہانی سننے کے لئے بے چین تاکہ شناخت پریڈ کا مرحلہ طے ہو۔ گلزار جاوید! آپ نے چار صفحوں میں ایک ناول کی وسعت کو مختصر افسانے میں سمیٹ دیا ہے۔ مبارکباد! (سجاد نقوی)

عزیز بھائی گلزار جاوید! السلام علیکم۔

خلافِ معمول اس مرتبہ "چہارسُو" کی اور سُو (جانب) کا سفر کرنے کے بجائے سیدھے غریب خانے کی طرف رجوع ہوا تو میں نے دلی مسرت کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ خدا کرے یہ "اس کا" معمول بن جائے اور میں اس کی تلاش میں در در نہ بھٹکوں۔

تازہ شمارہ اپنے جلو میں تذکرۂ کشور وکرم کی حیات و کارناموں سے متصف تھا تو یہ بھی روایتی شان و شوکت سے مزین تھا۔ بہت ساری معلومات وکرم صاحب کے بارے میں حاصل ہونے کے ساتھ مجھے پہلی مرتبہ یہ بھی معلوم ہوا کہ حسینی برہمن کسے کہتے ہیں۔ میں نے اب غور کیا تو بات مجھ پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی گئی کہ "دت" کا لاحقہ رکھنے والے خاندان مسلمانوں سے اتنے قریب کیوں محسوس ہوتے ہیں۔ ابھی ماضی قریب میں سنیل دت (مشہور فلمی اداکار) کی مثال سامنے رکھئے تو ان کی مرحومہ بیگم نرگس اور ساحر ہوتے ہوئے بھی دت کی مسلمانوں سے قربت پھر فسادات میں مسلمانوں کی مدد کرنے کے جرم میں ان کی حراست، سزا اور بہت سی زیادتیوں کو برداشت کرنے کا ان کا قابلِ تحسین حوصلہ تھا۔ ایک اتفاق نہیں کہلا سکتا۔ خدا آپ کی تحقیقی توانائیوں کو اور جلا بخشے۔ آمین!

ہاں! "براہِ راست" میں گفتگو کرتے وقت حسینی برہمن کے ایک مشہور ناول نگار "دت بھارتی" کا نام لینا بھول گئے جنہوں نے پچاس کی دہائی میں اپنی قسط وار ناولوں کے باعث شمع نئی دہلی میں مسلسل چھپتے رہنے کی تاریخ بنائی تھی۔ "ستارہ ماں" میں قیوم راہی نے عورت کی زندگی میں آنے جانے والی رُتوں پر ایک ایسے انداز سے روشنی ڈالی ہے جس میں ان کا فن بولتا اور خوب بولتا نظر آ رہا ہے۔ ٹھیک اسی طرح مشتاق عظمی نے "روشنی" جیسی علامتی کہانی لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ جنہیں فن پر عبور حاصل ہوتا ہے انہیں اپنی بات کہنے کا ڈھنگ اچھی طرح آتا ہے۔ ہندوستان کے ماحول میں لکھی گئی اس کہانی کے ذریعے مصنف نے اگر قومی یکجہتی کو ایک طرف موضوع بنایا ہے تو دوسری جانب نئی نسل کے افسانہ نگاروں کو یہ بھی بتایا ہے کہ اختصار بھی فنِ افسانہ نگاری کا بنیادی وصف ہے۔ "شناخت پریڈ" ہماری موجودہ نسل کا وہ المیہ ہے جو 9/11 کے قیامت خیز حادثے کے بعد بھی مسلسل امریکہ اور کناڈا کی جانب تیز سے تیز رفتار سے دوڑتا رہا ہے۔ آپ کے اس افسانے میں جو تلخ حقیقت بعض سطروں میں سر اٹھا کر بول رہی ہے وہ آپ کے فن کا کمال تو ہے ہی لیکن اس عبارت نے مجھے بھی رلا دیا کہ صاحب زادے بھی ان دنوں کناڈا شفٹ ہو چکے ہیں اور میں اپنے پوتے اور پوتی کی کمی گھر کے چپے چپے میں محسوس کر رہا ہوں۔ "بیٹے کی جدائی جس قدر تکلیف دہ تھی اس سے زیادہ پوتے کو خود سے دور کرنے کا غم گھپ اندھیرے کی مانند دل و دماغ میں پھیلتا جا رہا تھا۔"

بھائی پروف ریڈنگ پر زیادہ دھیان دیجئے "ایک منظر ایک پل" کے تیسرے شعر کا دوسرا مصرع "پیڑ آنچل، پیڑ پل" ہے جسے کمپوزر نے "پیڑ آنچل پر پل" کر دیا ہے۔ (غالب عرفان)